# سورۃ الانعام

آیاتہا ۱۶۵ ۔ ٦ سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ ۵۵ ۔ رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: یہ سورت مکی ہے سوائے دو آیتوں کے وہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖۤ۔ یہ مالک بن صیف اور کعب بن اشرف یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی (۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ھُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ۔ یہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن جریج نے کہا: یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی۔ یہ ماوردی نے کہا: ثعلبی نے کہا: سورت انعام مکی ہے مگر چھ آیات مدنی ہیں: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖۤ سے لے کر تین آیات تک۔ اور قُلْ تَعَالَوْا سے لے کر تین آیات تک۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ آیات محکمات ہیں۔ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ یہ مکہ میں عرفہ کے دن نازل ہوا۔ ان تمام کے بارے میں کلام ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

حدیث میں ہے یہ تمام سورت اکٹھی نازل ہوئی سوائے چھ آیات کے اور اس کو ستر ہزار فرشتے لے کر آئے، ایک آیت کے ساتھ بارہ ہزار فرشتے تھے اور وہ یہ آیت ہے وَ عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُہَاۤ اِلَّا ھُوَ وہ فرشتے اس آیت کو رات کے وقت لے کر آئے، وہ بلند آواز سے تسبیح وتحمید کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو ہی کاتبان وحی کو بلایا، پھر انہوں نے اسے لکھا۔ ابو جعفر نحاس نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے ہمیں بتایا محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو حاتم روح بن الفرج نے بتایا جو حضارمہ کے مولیٰ تھے انہوں نے کہا ہمیں احمد بن محمد ابو بکر عمری نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابن ابی فدیک نے بتایا انہوں نے کہا مجھے عمر بن طلحہ بن علقمہ بن وقاص نے بتایا انہوں نے نافع ابی سہل بن مالک سے روایت کیا انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سورۃ انعام نازل ہوئی تو اس کے ساتھ فرشتوں کا قافلہ تھا جنہوں نے افق کو گھیرا ہوا تھا''۔ وہ بلند آواز سے تسبیح کر رہے تھے اور زمین ان کے لیے تنگ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سبحان ربی العظیم کہا (1)۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: سورۃ انعام قرآن کی فاضل سورتوں میں سے ہے۔ حضرت کعب سے اسی کتاب میں مروی ہے فرمایا: تورات کا آغاز وہی ہے جو سورۃ انعام کا ہے اور تورات کا خاتمہ وہ ہے جو سورۃ ہود کا ہے۔ یہی وہب بن منبہ کا قول ہے۔ مہدوی نے ذکر کیا کہ مفسرین نے فرمایا: تورات کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ہے اور اختتام اس ارشاد سے ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّہٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ الخ۔ (الاسراء: 111)

1۔ الاوسط للطبرانی، 6443

ثعلبی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے سورۂ انعام کی پہلی تین آیات وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ تک تلاوت کیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو چالیس ہزار فرشتوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے لیے اپنی عبادات کی مثل قیامت تک ثواب لکھتے رہتے ہیں اور ساتویں آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک لوہے کا گرز ہوتا ہے جب شیطان اس شخص کو وسوسہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے یا اس کے دل میں کوئی برا خیال ڈالنا چاہتا ہے تو وہ فرشتہ شیطان کو وہ گرز مارتا ہے، پس اس کے اور شیطان کے درمیان ستر حجابات ہو جاتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہو گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو میرے (عرش کے) سایہ میں چل جس دن میرے (عرش کے) سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہے اور میرے جنت کے پھلوں سے کھا اور کوثر کے پانی سے پی اور سلسبیل کے پانی سے غسل کر اور تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں''(1)۔

بخاری میں ابن عباس سے مروی ہے فرمایا جب تجھے پسند ہو کہ تو عرب کی جہالت کو جان لے تو سورہ انعام کی ایک سو تیس سے اوپر آیات تلاوت کر قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۔

تنبیہ: علماء نے فرمایا: یہ سورت مشرکین، اور بدعتی لوگوں اور بعث ونشور کو جھٹلانے والے لوگوں کے خلاف حجت قائم کرنے میں اصل ہے، اس کا تقاضا ہے کہ یہ یکبارگی نازل ہو، کیونکہ یہ حجت کے اعتبار سے ایک مفہوم ہے اگرچہ بہت سی وجوہ کے اعتبار سے اس کا انداز مختلف ہے فرمایا: اس پر متکلمین نے اصول دین کی بنیاد رکھی، کیونکہ ایسی واضح آیات ہیں کہ جو قدریوں کا رد کرتی ہیں، ان سورتوں کے علاوہ جو ذکر کی گئی ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ توفیق الٰہی سے آگے آئے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف سے کیا اور اپنی الوہیت کے اثبات سے کیا یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے علاوہ سورتوں کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ہے، ایک پر اکتفا باقی تمام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ ایک معنی ہے دوسرا مقام اس کو ادا نہیں کرتا، کیونکہ مختلف نعمتوں کے ساتھ اس کو گرہ لگائی ہے نیز اس میں ان لوگوں کے خلاف حجت ہے جو اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ کا معنی سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

---

1۔ درمنثور، تعارف سورۃ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، علم اور ارادہ کی خبر دی ہے، فرمایا: جس نے پیدا کیا۔ کبھی خلق بمعنی اختراع ہوتا ہے اور کبھی بمعنی تقدیر ہوتا ہے، یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہاں یہ دونوں معنی مراد ہیں یہ آسمانوں اور زمین کے حدوث پر دلیل ہے، اس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کیا اور بغیر کجی کے برابر پیدا فرمایا ان میں چاند اور سورج کو دو نشانیاں بنایا اور انہیں ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ان میں بادلوں کو ودیعت کیا، زمین کو پھیلایا اور اس میں رزق اور نبات کو ودیعت رکھا اور ان میں ہر جانور کو بطور آیات پھیلایا اس میں پہاڑوں کو کیل کے طور پر اور راستے بنائے اور ان میں نہریں اور دریا جاری فرمائے اور پتھروں سے چشمے جاری فرمائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہیں اور اس کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں اور وہ اللہ واحد اور قہار ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو بیان کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مسلم نے فرمایا: مجھے شریح بن یونس اور ہارون بن عبداللہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حجاج بن محمد نے بتایا انہوں نے کہا ابن جریج نے کہا مجھے اسماعیل بن امیہ نے بتایا انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کیا انہوں نے عبداللہ بن رافع مولی ام سلمہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے روز پیدا کیے اور درختوں کو سوموار کے دن پیدا کیا اور مکروہ کو منگل کے روز پیدا کیا نور کو بدھ کے روز پیدا کیا اور جمعرات کو زمین میں جانور پھیلائے اور جمعہ کے روز ساری مخلوق سے آخر میں جمعہ کی آخری گھڑی میں عصر کے بعد رات تک کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا'' (1)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے اس حدیث کو اس سورت کے آغاز کے لیے تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا: محدثین نے کہا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے، کیونکہ اہل تفسیر اور اہل تاریخ کے نظریہ کے مخالف ہے۔ بعض علماء نے کہا: اسماعیل بن امیہ نے ابراہیم بن یحییٰ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کی ہے اور ابراہیم سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ محمد بن یحییٰ نے ذکر کیا ہے فرمایا: میں نے علی بن مدینی سے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث (اللہ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا الخ) کے متعلق پوچھا تو علی نے کہا: یہ حدیث مدنی ہے۔ اس کو ہشام بن یوسف نے ابن جریج سے انہوں نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے انہوں نے ابو رافع مولی سلمہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا...... علی نے فرمایا: ابراہیم بن ابی یحییٰ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ایوب بن خالد نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: عبداللہ بن رافع نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا حضرت ابو ہریرہ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز پیدا فرمایا''۔ پھر اسی طرح حدیث ذکر کی۔

علی بن مدینی نے کہا: میرا خیال ہے اسماعیل بن امیہ نے یہ امر ابراہیم بن ابی یحییٰ سے حاصل کیا ہے، بیہقی نے کہا: اس

1۔ صحیح مسلم، صفۃ المنافقین واحکامھم، جلد 2، صفحہ 371

ثعلبی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے سورۂ انعام کی پہلی تین آیات وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ تک تلاوت کیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو چالیس ہزار فرشتوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے لیے اپنی عبادت کی مثل قیامت تک ثواب لکھتے رہتے ہیں اور ساتویں آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک لوہے کا گرز ہوتا ہے جب شیطان اس شخص کو وسوسہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے یا اس کے دل میں کوئی برا خیال ڈالنا چاہتا ہے تو وہ فرشتہ شیطان کو وہ گرز مارتا ہے، پس اس کے اور شیطان کے درمیان ستر حجابات ہو جاتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو میرے (عرش کے) سایہ میں چل جس دن میرے (عرش کے) سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہے اور میرے جنت کے پھلوں سے کھا اور کوثر کے پانی سے پی اور سلسبیل کے پانی سے غسل کر اور تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں'' (1)۔

بخاری میں ابن عباس سے مروی ہے فرمایا جب تجھے پسند ہو کہ تو عرب کی جہالت کو جان لے تو سورہ انعام کی ایک سو تیس سے اوپر آیات تلاوت کر قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝۱۴۰۔

تنبیہ: علماء نے فرمایا: یہ سورت مشرکین، اور بدعتی لوگوں اور بعث و نشور کو جھٹلانے والے لوگوں کے خلاف حجت قائم کرنے میں اصل ہے، اس کا تقاضا ہے کہ یہ یکبارگی نازل ہو، کیونکہ یہ حجت کے اعتبار سے ایک مفہوم ہے اگرچہ بہت سی وجوہ کے اعتبار سے اس کا انداز مختلف ہے فرمایا: اس پر متکلمین نے اصول دین کی بنیاد رکھی، کیونکہ ایسی واضح آیات ہیں کہ جو قدریوں کا رد کرتی ہیں، ان سورتوں کے علاوہ جو ذکر کی گئی ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ توفیق الٰہی سے آگے آئے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝۱

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف سے کیا اور اپنی الوہیت کے اثبات سے کیا یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے علاوہ سورتوں کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ہے، ایک پر اکتفا باقی تمام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ ایک معنی ہے دوسرا مقام اس کو ادا نہیں کرتا، کیونکہ مختلف نعمتوں کے ساتھ اس کو گرہ لگائی ہے نیز اس میں ان لوگوں کے خلاف حجت ہے جو اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ کا معنی سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

1۔ درمنثور، تعارف سورۃ

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، علم اور ارادہ کی خبر دی ہے، فرمایا: جس نے پیدا کیا۔ کبھی خلق بمعنی اختراع ہوتا ہے اور کبھی بمعنی تقدیر ہوتا ہے، یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہاں یہ دونوں معنی مراد ہیں یہ آسمانوں اور زمین کے حدوث پر دلیل ہے، اس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کیا اور بغیر کجی کے برابر پیدا فرمایا ان میں چاند اور سورج کو دو نشانیاں بنایا اور انہیں ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ان میں بادلوں کو ودیعت کیا، زمین کو پھیلایا اور اس میں رزق اور نبات کو ودیعت رکھا اور ان میں ہر جانور کو بطور آیات پھیلایا اس میں پہاڑوں کو کیل کے طور پر اور راستے بنائے اور ان میں نہریں اور دریا جاری فرمائے اور پتھروں سے چشمے جاری فرمائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہیں اور اس کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں اور وہ اللہ واحد اور قہار ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو بیان کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** مسلم نے فرمایا: مجھے شریح بن یونس اور ہارون بن عبداللہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حجاج بن محمد نے بتایا انہوں نے کہا ابن جریج نے کہا مجھے اسماعیل بن امیہ نے بتایا انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کیا انہوں نے عبداللہ بن رافع مولی ام سلمہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ پکڑا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے روز پیدا کیے اور درختوں کو سوموار کے دن پیدا کیا اور مکروہ کو منگل کے روز پیدا کیا نور کو بدھ کے روز پیدا کیا اور جمعرات کو زمین میں جانور پھیلائے اور جمعہ کے روز ساری مخلوق سے آخر میں جمعہ کی آخری گھڑی میں عصر کے بعد رات تک کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا'' (1)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے اس حدیث کو اس سورت کے آغاز کے لیے تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا: محدثین نے کہا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے، کیونکہ اہل تفسیر اور اہل تاریخ کے نظریہ کے مخالف ہے۔ بعض علماء نے کہا: اسماعیل بن امیہ ابراہیم بن یحییٰ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کی ہے اور ابراہیم سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ محمد بن یحییٰ نے ذکر کیا ہے فرمایا: میں نے علی بن مدینی سے حضرت ابوہریرہ کی حدیث (اللہ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا الخ) کے متعلق پوچھا تو علی نے کہا: یہ حدیث مدنی ہے۔ اس کو ہشام بن یوسف نے ابن جریج سے انہوں نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے انہوں نے ابو رافع مولی سلمہ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا...... علی نے فرمایا: ابراہیم بن ابی یحییٰ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ایوب بن خالد نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: عبداللہ بن رافع نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا حضرت ابوہریرہ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز پیدا فرمایا''۔ پھر اسی طرح حدیث ذکر کی۔

علی بن مدینی نے کہا: میرا خیال ہے اسماعیل بن امیہ نے یہ امر ابراہیم بن ابی یحییٰ سے حاصل کیا ہے، بیہقی نے کہا: اس

1۔ صحیح مسلم، صفۃ المنافقین واحکامھم، جلد 2، صفحہ 371

میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی نے ایوب بن خالد سے روایت کرنے میں اس کی متابعت کی ہے مگر موسیٰ بن عبیدۃ ضعیف ہے۔ بکر بن شرود سے مروی ہے انہوں نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے انہوں نے صفوان بن سلیم سے انہوں نے ایوب بن خالد سے...... اس کی سند ضعیف ہے...... انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ہے کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے میں اس کی موافقت نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے وہ سوال عطا فرما دیتا ہے''۔ فرمایا: حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق کا آغاز کیا، اتوار اور سوموار کے روز زمین کو پیدا کیا، منگل کے دن اور بدھ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا اور خوراک اور جو کچھ زمین میں ہے اسے۔ جمعرات اور جمعہ کے دن کی عصر تک کے وقت میں پیدا کیا اور عصر کی نماز اور سورج کے غروب ہونے کے وقت کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اس حدیث کو بیہقی نے روایت کیا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن نہیں اتوار کے روز مخلوق کو پیدا کیا۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں حضرت ابن مسعود اور دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے مروی ہے۔ یہ اختلاف تفصیلاً گزر چکا ہے کہ زمین کو پہلے پیدا فرمایا یا آسمان کو پہلے پیدا فرمایا۔ الحمدللہ

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ جواہر کی تخلیق کے ذکر کے بعد اعراض کی تخلیق کا ذکر کیا، کیونکہ جوہر، عرض سے مستغنی نہیں ہوتا اور جو حوادث سے مستغنی نہیں ہوتا وہ حادث ہوتا ہے، جوہر متکلمین کی اصلاح میں اس جز کو کہتے ہیں جس کا آگے جز نہیں بنتا جو عرض کا جامع ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بحث اپنی کتاب ''الاسنی فی شرح الاسماء الحسنی'' میں الواحد اسم کے تحت ذکر کی ہے۔ اور عرض کو عرض اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ یہ جوہر اور جسم کو لاحق ہوتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہے۔ جسم مجتمع ہوتا ہے اور کم از کم جس پر جسم کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جو مجتمع جوہر ہیں یہ اصطلاحات ہیں اگرچہ صدر اول میں موجود نہیں تھیں، ان پر کتاب وسنت کا معنی ولالت کرتا ہے، ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، ان کو علماء نے استعمال کیا ہے ان پر اصطلاح قائم کی ہے اور ان پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے اور ان کے ساتھ مخالفین کو نیست ونابود کیا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ علماء کا الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ سدی، قتادہ اور جمہور مفسرین نے کہا: اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی روشنی ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد کفر اور ایمان ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ظاہر سے خروج ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: لفظ اس معنی کو بھی شامل ہے قرآن حکیم میں ہے: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ (انعام: 122) کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لیے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو۔

اس آیت میں الْاَرْضَ جنس کے لیے ہے، لفظ مفرد ہے لیکن مراد جمع ہے۔ اسی طرح النُّوْرَ ہے اس کی مثال یہ ارشاد:

---

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 17151

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266

ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) شاعر نے کہا:

كُلُوا فِي بَعْضِ بَطْنِكُمْ تَعِفُّوا

یہ پہلے گزر چکا ہے۔

یہاں جعل بمعنی خلق ہے، اس کے علاوہ کوئی معنی نہیں، یہ ابن عطیہ کا قول ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: اس پر لفظ اور معنی نسق میں متفق ہیں جمع، جمع پر معطوف ہے اور مفرد، مفرد پر معطوف ہوتا ہے۔ پس لفظ ایک جیسے ہوتے ہیں اور فصاحت ظاہر ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: الظُّلُمٰتِ کو جمع اور النُّوْرَ کو مفرد ذکر کیا، کیونکہ ظلمات متعدی نہیں ہوتی ہیں اور نور متعدی ہوتا ہے۔ ثعلبی نے حکایت کیا ہے کہ بعض اہل معانی نے کہا: یہاں جعل زائدہ ہے اور عرب جعل کو کلام میں زائدہ کرتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد جَعلتُ أَرَى الاثنين أربعةً والواحد أثنينِ لَمَّا هَدَّنِي الكِبَرُ

نحاس نے کہا: جعل بمعنی خلق ہے جب یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے تو صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے اور جعل کے محل پر سورۂ بقرہ میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ○ یہ مبتدا خبر ہیں۔ معنی یہ ہے پھر کافر لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے شریک اور برابر ٹھہراتے ہیں، حالانکہ اس نے تنہا ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ثم کفار کے فعل کی قباحت پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ثابت ہے اور اس کی آیات پھیلی ہوئی ہیں اور اس کا انعام ظاہر ہے پھر اس کے بعد بھی وہ اپنے رب کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اے فلاں! میں نے تجھے عطا کیا، میں نے تجھے عزت دی، میں نے تجھ پر احسان کیا، پھر تو مجھے گالی دیتا ہے۔ اگر اس میں واو وغیرہ کے ساتھ عطف ہوتا تو توبیخ اس طرح لازم نہ آتی جس طرح ثم کے ساتھ توبیخ لازم ہوتی ہے (2)۔ واللہ اعلم

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ○

”اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر مقرر کی ایک میعاد اور ایک میعاد مقرر ہے اللہ کے نزدیک پھر بھی تم شک کر رہے ہو“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ یہ آیت خبر ہے، اس کے مفہوم میں دو قول ہیں: ایک وہ ہے جو مشہور ہے اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور خلق سے مراد آپ کی نسل ہے اور فرع اپنے اصل کی طرف منسوب ہوتی ہے اسی وجہ سے فرمایا: خَلَقَكُمْ جمع کی ضمیر ذکر فرمائی آپ کو خطاب فرمایا جب کہ وہ حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ یہ حسن، قتادہ، ابن ابی نجیح، سدی، ضحاک اور ابن زید وغیرہم کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نطفہ (3) کو حقیقت میں اللہ نے مٹی سے پیدا فرمایا، پھر اسے تبدیل کیا حتیٰ کہ اس سے انسان بن گیا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے عالم کبیر کا پہلے ذکر فرمایا تو اس کے بعد عالم صغیر کا ذکر فرمایا اور وہ عالم صغیر انسان ہے اس میں وہ سب کچھ رکھا جو عالم کبیر میں ہے جیسا کہ ہم نے آیت توحید کے تحت سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ ابونعیم الحافظ نے اپنی کتاب میں مرہ عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرشتہ جو رحم پر متعین ہوتا ہے وہ نطفہ کو پکڑتا ہے پھر اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے، پھر کہتا ہے: اے رب! اس کے اعضاء مکمل بنانے ہیں یا نامکمل بنانے ہیں؟ اگر مکمل بنانے کا ارشاد ہوتا ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے اس کا رزق کیا ہے؟ اس کا اثر کیا ہے؟ اس کی عمر کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: ام الکتاب میں دیکھو۔ وہ لوح محفوظ میں دیکھتا ہے تو اس میں وہ اس کا رزق، اس کا اثر، اس کی عمر اور اس کا عمل دیکھتا ہے اور پھر وہ ایسی جگہ کی مٹی پکڑتا ہے جس جگہ اسے دفن ہونا ہے، پس اس مٹی کے ساتھ اس نطفہ کو گوندھتا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ (طٰہٰ: 55) سے یہی مراد ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے تخریج کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بچہ نہیں ہوا مگر اس پر اس کی قبر کی مٹی سے چھڑکاؤ کیا گیا'' (1)۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر ہر انسان مٹی اور ماء مہین سے پیدا کیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المومنون میں خبر دی ہے۔ پس آیات اور احادیث موافق ہو جائیں گی اور تعارض اور اشکال اٹھ جائے گا۔ واللہ اعلم۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق اخبار سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں، یہاں ہم کچھ مزید ان کی صفات، عمر اور وفات وغیرہ کے متعلق ذکر کرتے ہیں۔

ابن سعد نے ''الطبقات'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں'' (2)۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایسی زمین سے پیدا کیا جسے دجناء کہا جاتا ہے''۔ حسن نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کا سینہ ضریۃ سے پیدا کیا گیا۔ جوہری نے کہا: ضریۃ بنی کلاب کا ایک شہر ہے جو بصرہ کے راستہ پر ہے یہ مکہ کے زیادہ قریب ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو بھیجا تو اس نے زمین کی سطح سے مٹی اور نمکین مٹی سے کچھ اٹھایا اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا گیا پس جو اس کی میٹھی مٹی سے تخلیق کیا گیا وہ جنت کی طرف جانے والا ہے اگرچہ وہ کافر کا بیٹا بھی ہو اور جو اس کی نمکین مٹی سے تخلیق کیا گیا وہ آگ کی طرف جانے والا ہے اگرچہ وہ کسی متقی کا بیٹا بھی ہو، اسی وجہ سے ابلیس نے کہا تھا: کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا؟ کیونکہ وہ مٹی وہی لایا تھا، پھر آپ کا نام آدم رکھا گیا، کیونکہ انہیں أدیم الارض (زمین کی سطح) سے پیدا کیا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن سلام سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن کے آخر میں پیدا کیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کا سر آسمان کو چھوتا تھا...... فرمایا...... پھر اسے زمین کی طرف جھکایا حتیٰ کہ وہ ساٹھ ہاتھ لمبے اور سات ہاتھ چوڑے ہو گئے۔ حضرت ابن عباس سے

1۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 280

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 159۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب التفاخر بالاحساب، حدیث 4452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مروی ہے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کا سر آسمان کو چھوتا تھا...... فرمایا...... پھر اسے زمین کی طرف جھکایا حتیٰ کہ وہ ساٹھ ہاتھ لمبے اور سات ہاتھ چوڑے ہو گئے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام بہت زیادہ لمبے، گھنگھریالے بالوں والے تھے گویا لمبی کھجور ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ان کی حدیث میں طول کا ذکر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ کی طرف پیدل چالیس حج کیے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اتارا گیا تو ان کا سر آسمان کو چھوتا تھا اسی وجہ سے وہ گنجے ہو گئے اور آپ کی اولاد بھی گنجی ہوتی ہے، آپ کے قد کی طوالت کی وجہ سے خشکی کے جانور بھاگ گئے اور اس دن سے وہ وحشی بن گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا وصال نہ ہوا حتیٰ کہ ان کی اولاد کی اولاد کی اولاد چالیس ہزار ہو گئی۔ آپ نے اس پہاڑ کی چوٹی پر وصال فرمایا جس پر آپ اترے تھے، حضرت شیث علیہ السلام نے جبریل سے کہا: آدم علیہ السلام کی نماز جنازہ پڑھاؤ۔ جبریل نے حضرت شیث علیہ السلام سے کہا: تم آگے بڑھو اور اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھاؤ اور ان پر تیس تکبیریں کہو، پانچ تو نماز جنازہ کی ہیں اور پچیس حضرت آدم علیہ السلام کی فضلیت کے لیے ہیں۔ بعض نے کہا: اس پر چار تکبیریں کہیں۔ حضرت شیث علیہ السلام کی اولاد نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک غار میں رکھا اور اس پر محافظ مقرر کیے تاکہ قابیل کے بیٹوں میں سے کوئی ان کے قریب نہ آئے۔ جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آتے تھے اور آپ کے لیے استغفار کرتے تھے وہ حضرت شیث علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ حضرت آدم کی عمر نو سو چھتیس سال تھی۔ کہا جاتا ہے: کیا اس آیت میں دلیل ہے کہ جوہر ایک جنس سے ہیں؟ اس کا جواب ہے: ہاں، کیونکہ جب مٹی زندہ، قادر، علیم انسان بن سکتی ہے تو جواہر کا بھی ہر حال کی طرف تبدیل ہونا جائز ہے، کیونکہ حکم میں عقل برابری کا تقاضا کرتی ہے پتھروں کا انسان کی طرف بدلنا جائز اور صحیح ہے اس کی دلیل یہی آیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا**، **اَجَلًا** مفعول ہے۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** مبتدا خبر ہے۔ ضحاک نے کہا: اجلاً سے مراد موت ہے **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** سے مراد قیامت کی مدت ہے۔ اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ اس نے مدت کا فیصلہ فرمایا اور اس نے تمہیں بتایا کہ تم نے موت تک ٹھہرنا ہے اور اس نے تمہیں قیامت کی مدت کے بارے آگاہ نہیں کیا۔ حسن، مجاہد، عکرمہ، خصیف، قتادہ نے کہا: یہ حسن کے الفاظ ہیں: جس دن اس نے تجھے پیدا کیا اس دن سے دنیا کی مدت کا تیرے مرنے تک کا فیصلہ کیا (1)۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** یعنی آخرت کی مدت اس کے پاس ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **قَضٰۤى اَجَلًا** یعنی ہمیں بتایا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى** آخرت کی مدت کا علم اس کے پاس ہے۔ بعض نے فرمایا: **قَضٰۤى اَجَلًا** اس سے مراد وہ ہے جو ہم چاند اور کھیتی باڑی کے اوقات جانتے ہیں۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى** سے مراد موت کی مدت ہے انسان نہیں جانتا کہ وہ کب مرے گا۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ **قَضٰۤى اَجَلًا** دنیا کی موت کا فیصلہ فرمایا۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** آخرت کی ابتدا کا فیصلہ اس کے پاس ہے (2)۔ بعض علماء نے کہا: پہلی اجل سے مراد نیند میں روحوں کو قبض کرنا ہے اور دوسری اجل سے مراد موت کے وقت روح کا قبض کرنا ہے۔ حضرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 267

ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے میں شک کرتے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تم شک کرنے والوں کے جھگڑا کی طرح جھگڑتے ہو۔ التماری کا معنی شک کی بنا پر جھگڑنا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ (النجم)

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵

''اور وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جانتا ہے تمہارے بھید بھی اور تمہاری کھلی باتیں بھی اور جانتا ہے جو تم کما رہے ہو۔ اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی اپنے رب کی نشانیوں سے مگر وہ ہو جاتے ہیں اس سے منہ پھیرنے والے۔ بے شک انہوں نے جھٹلایا حق کو جب وہ آیا ان کے پاس سو اب آیا چاہتی ہیں ان کے پاس خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ وہ مذاق کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ اس میں سوال یہ ہے کہ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ کا عامل کیا ہے، اس کے کئی جوابات ہیں: (۱) اس کا مطلب ہے هو الله المعظّم او المعبود فی السمٰوات وفی الأرض۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ ہی بلند شان والا یا معبود ہے جیسے تو کہتا ہے: زید الخلیفة فی الشرق والغرب۔ یعنی شرق وغرب میں اس کا حکم ہے۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین میں تدبیر کرنے میں منفرد ہے، جیسے تو کہتا ہے: هو فی حاجات الناس وفی الصلاة۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ خبر کے بعد خبر ہو، معنی یہ ہوگا: وهو الله فی السموات وهو الله فی الأرض۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے هو الله یعلم سرکم وجهرکم فی السموت وفی الأرض فلا یخفی علیه شیٔ۔ یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور زمین میں تمہارے اعلانیہ امور اور بھیدوں کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: یہ میرے نزدیک عمدہ قول ہے۔ محمد بن جریر نے کہا: وهو الله فی السمٰوات ویعلم سرکم وجهرکم فی الأرض پس یعلم دونوں صورتوں میں مقدم ہے۔ پہلا قول اشکال سے سلامت ہے اس کے علاوہ بھی اقوال ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حرکت، انتقال اور امکنہ کے شغل سے پاک ہے۔ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ یعنی خیر و شر میں سے جو تم کماتے ہو۔ الکسب سے مراد نفع حاصل کرنے یا نقصان کو دور کرنے کے لیے فعل کرنا ہے اسی وجہ سے اللہ کے فعل کو کسب نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ یعنی علامت جیسے چاند کا پھٹنا وغیرہ۔ من جنس کے استغراق کے لیے ہے تو کہتا ہے: مافی الدار من احد گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ دوسرا من تبعضیة ہے۔ مُعْرِضِيْنَ ۝ كَانُوْا کی خبر ہے۔ الاعراض سے مراد ان آیات میں غور وفکر کا ترک کرنا ہے جن کے ذریعے توحید پر استدلال کرنا ان پر واجب تھا جیسے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس کی تخلیق کی علامت۔ یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ وہ قدیم، حی اور تمام اشیاء سے غنی

ہے، قادر ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہیں کرتی، عالم جس پر کوئی چیز مخفی نہیں جو اس نے معجزات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قائم کیے ہیں تاکہ ان کے ذریعے اس کے لائے ہوئے پیغام کی صداقت پر استدلال کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَدْ كَذَّبُوْا یعنی مشرکین مکہ نے جھٹلایا۔ بِالْحَقِّ یعنی قرآن۔ تو بعض علماء نے فرمایا: بِالْحَقِّ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ فَسَوْفَ يَأْتِيْهِمْ یعنی ان پر عذاب نازل ہوگا۔ الانبیاء سے مراد اخبار ہیں، یعنی عذاب، جیسے تیرا قول ہے: أصبر و سوف یأتیك الخبر تو صبر کر عنقریب تیرے پاس خبر (عذاب) آ جائے گی۔ اس سے مراد وہ ہے جو انہیں جنگ بدر وغیرہ میں تکلیف پہنچی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد قیامت کا عذاب ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝

"کیا نہیں دیکھا انہوں نے کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے قومیں جنہیں ہم نے (ایسا) تسلط دیا تھا زمین میں جو ہم نے تمہیں نہیں دیا اور ہم نے بھیجے بادل ان پر موسلا دھار برسنے والے اور ہم نے بنا دیں نہریں جو بہتی تھیں ان کے (گھروں اور باغوں کے) نیچے سے پھر بھی ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے اور پیدا کر دی ہم نے ان کے بعد ایک اور قوم"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ، كَمْ، اَهْلَكْنَا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اَلَمْ يَرَوْا کی وجہ سے منصوب نہیں، کیونکہ لفظ استفہام میں اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا، اس کا مابعد اس میں عمل کرتا ہے، کیونکہ اس کا مقام صدر کلام ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا وہ عبرت حاصل نہیں کرتے پہلی قوموں سے جن کو ہم نے اس لیے ہلاک کیا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کو جھٹلایا تھا یعنی کیا انہوں نے اس کو نہیں پہچانا؟ القرن سے مراد لوگوں کی ایک امت ہے اس کی جمع القرون ہے۔ شاعر نے کہا:

إذا ذهبَ القرنُ الذی کنتَ فیهم وخُلِّفتَ فی قَرْنٍ فأنت غریبُ

قَرْنٍ سے مراد اپنے زمانہ کے لوگ ہیں یہ اقتران سے مشتق ہے۔ یعنی بعض لوگ بعض سے ملے ہوئے ہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی (1) یعنی لوگوں میں سے بہتر میرے اصحاب ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔ جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے اصح یہی قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اهل قرن ہے۔ اهل کو حذف کیا گیا ہے جیسے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں اهل حذف ہے۔ اس بنا پر قرن سے مراد زمانہ کی ایک مدت ہوگی۔ بعض نے فرمایا: یہ ساٹھ سال ہیں۔ بعض نے فرمایا: ستر سال ہیں۔ بعض نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، جلد 1، صفحہ 362

فرمایا: اسی سال ہیں۔ بعض نے فرمایا سو سال ہیں۔ اکثر اصحاب حدیث کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سو سال ہیں اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن بسر سے کہا: تعیش قرنا تو سو سال زندہ رہے (1)۔ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ القرن کی اصل ظاہر ہونے والی چیز جیسے قرن مالہ، قرن من الحیوان، حیوان کا سینگ۔

مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ یہ غائب سے خطاب کی طرف خروج ہے اس کا عکس یہ ہے حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (یونس:22) اس آیت میں پہلے خطاب تھا، پھر غائب کی ضمیر ذکر فرمائی۔ اہل بصرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے قول اَلَمْ يَرَوْا کے ساتھ ان کے متعلق خبر دی اور ان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب موجود تھے، پھر انہیں ان کے ساتھ خطاب کیا۔ عرب کہتے ہیں: قلت لعبد اللہ ما اکرمہ وقلتُ لعبد اللہ ما اکرمکَ اگر غیب کے صیغہ پر آتا تو مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ ہوتا مکنہ اور مکن لہ دونوں جائز ہیں اس میں دونوں لغتیں ہیں یعنی ہم نے دنیا سے انہیں وہ عطا کیا جو تمہیں عطا نہیں کیا۔

وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا اس سے مراد موسلا دھار بارش ہے، اس کو السماء سے تعبیر فرمایا، کیونکہ بارش آسمان سے آتی ہے شاعر کا قول ہے:

وَاِذَا سَقَطَ السَّمَاءُ بِأَرْضِ قَوْمٍ

مِّدْرَارًا یہ وزن کثرت پر دلالت کرتا ہے جیسے مذکار اس عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی مذکر اولاد زیادہ ہو اور مئنات وہ عورت جس کی مونث اولاد زیادہ ہو۔ کہا جاتا ہے: دَرَّ اللبن، یدر جب دودھ کثرت سے آئے اور مِّدْرَارًا پر نصب حال کی بنا پر ہے۔ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ۔ اسی سے فرعون کا قول ہے: هذه الانهار تجري من تحتي۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان پر نعمتوں میں وسعت کی تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ یعنی ان کے کفر کی وجہ سے ہم نے انہیں ہلاک کیا۔ گناہ، انتقام اور نعمتوں کے زوال کا سبب ہیں۔

وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ یعنی ہم نے ان کو پیدا کیا، پس ان لوگوں کو اہلاک سے بچنا چاہیے۔

**وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝**

''اور اگر ہم اتارتے آپ پر کتاب (لکھی ہوئی) کاغذ پر اور وہ چھو بھی لیتے اس کو اپنے ہاتھوں سے تب بھی کہتے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ہم ان کے سامنے آپ پر کتاب نازل کرتے جیسا کہ انہوں نے کاغذ پر لکھی ہوئی کلام طلب کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس کا مطلب ہے کتاب جو آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہوتی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تنزیل کا عمل دو اعتبار سے ہو سکتا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 269

ایک یہ کہ نزل علیك الکتاب کا معنی ہے کہ فرشتہ اس کے ساتھ اترتا۔ دوسرا یہ کہ اگر ہم کاغذ میں کتاب نازل کرتے جس کو اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے درمیان روک لیتا۔

نَزَّلْنَا مبالغہ فرمایا، کتاب کا آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہرنا طویل ہوتا ہے الکتاب مصدر ہے بمعنی کتابة، پس واضح ہوا کہ کتابت کاغذ میں ہوتی ہے کتاب کو نہیں سمجھا جاتا مگر کاغذ میں یعنی صحیفہ میں۔ القرطاس سے مراد صحیفہ ہے۔ کہا جاتا ہے: قرطاس ضمہ کے ساتھ۔ قرطس فلان۔ جب کوئی تیر پھینکے اور اس صحیفہ کو جا لگے جو ہدف کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ پس وہ اسے دیکھتے اور اسے ہاتھ سے چھوتے جیسا کہ انہوں نے تجویز کیا ہے اور ہاتھوں سے ٹٹول کر تمیز بھی کر لیتے تاکہ ہر شک اور شبہ زائل ہو جائے تو پھر بھی ہٹ دھرمی اور کفر کی متابعت میں قائم رہتے اور کہتے: یہ تو کھلا جادو ہے ہماری آنکھیں بند کی گئی ہیں اور ہم پر جادو کیا گیا ہے۔ یہ آیت ان کے قول حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (الاسراء: 93) کا جواب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کی بنا پر بتایا کہ اگر اس طرح نازل ہوتا تو یہ اس کو بھی جھٹلائیں گے۔ کلبی نے کہا: یہ نضر بن حرث عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد کے بارے نازل ہوئی انہوں نے کہا: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ (الاسراء) ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کر دیں ہماری زمین سے ایک چشمہ۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

"اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہو گیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں۔ اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتہ کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں) تو (یوں) ہم مشتبہ کر دیتے ان پر جس شبہ میں وہ اب ہیں۔ اور بلاشبہ مذاق اڑایا گیا رسولوں کا آپ سے پہلے پھر گھیر لیا انہیں جو مذاق اڑاتے تھے رسولوں کا اس چیز نے جس کے ساتھ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ یہ بھی انہوں نے تجویز کی۔ لولا بمعنی ھلا ہے۔ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اگر وہ فرشتے کو اپنی صورت میں دیکھتے تو مر جاتے، کیونکہ وہ اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: تو قیامت قائم ہو جاتی۔ حسن اور قتادہ نے کہا: وہ عذاب کے ساتھ ہلاک کیے جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری فرمائی ہے کہ جس نے کوئی نشانی طلب کی پھر وہ اس کے لیے ظاہر کر دی گئی اور وہ ایمان نہ لایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے فوراً ہلاک کر دیا۔ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ یعنی انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا یعنی وہ فرشتے کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتے مگر مجسم ہونے کے بعد کیونکہ ہر جنس اپنی جنس سے مانوس ہوتی ہے اور دوسری جنس سے دور ہوتی ہے اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کا رسول فرشتہ کو بناتا تو وہ اس کے قرب سے دور ہوتے اور اس سے مانوس نہ ہوتے اور اس کی کلام سے رعب داخل ہوتا تو یہ چیز انہیں اس سے کلام

کرنے اور سوال کرنے سے انہیں روک دیتی اور مصلحت عام نہ ہوتی۔

اور اگر اللہ تعالیٰ اسے ملائکہ کی صورت سے انسانوں کی صورت کی طرف منتقل کرتا تا کہ وہ اس سے مانوس ہوں اور اس سے سکون پائیں تو یہ کہتے: تو فرشتہ نہیں ہے تو تو بشر ہے ہم تجھ پر ایمان نہیں لاتے، اور وہ پہلے حال کی طرف لوٹ جاتے۔ ملائکہ انبیاء کرام کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس آدمیوں کی شکل میں آئے تھے اور جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں آتے تھے، یعنی اگر فرشتہ نازل ہوتا تو وہ اسے انسانی شکل میں دیکھتے جیسا کہ انبیاء کی عادت جاری ہے اور اگر وہ اپنی عادت پر نازل ہوتا تو وہ اسے نہ دیکھ سکتے اور جب ہم اسے انسان بنا کر بھیجتے تو ان پر مشتبہ ہو جاتا اور وہ کہتے: یہ تو تیری طرح جادوگر ہے۔

زجاج نے کہا: وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ یعنی ہم ان کے رؤساء پر مشتبہ کر دیتے جس طرح وہ اپنے کمزور لوگوں پر مشتبہ ہوتے تھے۔ وہ انہیں کہتے تھے: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں، اس کے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ اس طرح ان پر معاملہ مشتبہ کرتے اور وہ انہیں شک میں مبتلا کرتے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ اگر وہ انسانی شکل میں فرشتہ نازل کرتا تو وہ التباس کا راستہ پاتے جیسا کہ وہ کرتے ہیں اللبس کا معنی مشتبہ کرنا اور خلط ملط کرنا ہے۔ لَبَستُ علیہ الأمر، ألبِسه لَبسًا یعنی میں نے اس پر خلط ملط کر دیا۔ اس کا اصل معنی کپڑے کے ساتھ ڈھانپنا ہے اور فرمایا: لَلَبَسْنَا اپنی طرف نسبت کی تخلیق کی جہت پر اور يَلْبِسُوْنَ فرمایا ان کی طرف نسبت کی اکتساب کی جہت پر، پھر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ یعنی جنہوں نے اپنے انبیاء سے استہزا کیا اس کی سزا کے طور پر عذاب نازل کر کے انہیں ہلاک کیا گیا حاق بالشئ یحیق حَیقًا وحُیوقا وحَیقانًا اس کا معنی ہے اترنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: 43) اور نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے۔

مَّا كَانُوْا میں ما بمعنی الذی ہے بعض نے فرمایا: ما مصدریہ ہے یعنی اس کے استہزا کے انجام نے انہیں گھیر لیا۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے: سیر کرو زمین میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا۔ آپ (ان سے) پوچھیے کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ آپ (ہی انہیں) بتائیے (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے اس نے لازم کر لیا ہے اپنے آپ پر رحمت فرمانا یقیناً جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن ذرا شک نہیں اس میں (مگر) جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان استہزا کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کو کہو کہ زمین میں سفر کرو اور دیکھو اور خبر طلب کرو تا کہ تم جان لو جو عذاب اور عقاب تم سے پہلے کافروں پر اترا۔ ایسا سفر کرنا

مستحب ہے جب پہلی امتوں اور اجڑے ہوئے شہروں کے کھنڈرات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے ہو اور ان کا آخری انجام دیکھنے کے لیے ہو۔ یہاں مکذبون سے مراد وہ ہیں جنہوں نے حق اور حق والوں کو جھٹلایا نہ کہ وہ جنہوں نے باطل کو جھٹلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ بھی ان کے خلاف حجت ہے یعنی اے محمد ﷺ آپ ان سے پوچھیے: کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ اگر وہ کہیں کہ کس کا ہے؟ تو تم کہو: اللہ کے لیے ہے، یعنی جب ثابت ہو گیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کا ہے اور وہی تمام کا خالق ہے، ان کے اعتراف کرنے کے ساتھ یا ان پر حجت قائم کرنے کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ پھر اس پر بھی قادر ہے کہ وہ انہیں جلدی عذاب دے اور انہیں موت کے بعد اٹھائے لیکن كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اس نے اپنے آپ پر رحمت کرنا لازم کر لیا ہے۔ اس نے اپنی جناب سے فضل و کرم کا وعدہ فرمایا ہے اس لیے اس نے ڈھیل دی ہے۔ یہاں نفس کا ذکر فرمایا مراد اس کا وجوب ہے اور وعدہ کی تاکید ہے اور اس کے علاوہ وسائط اٹھانا ہے، کلام کا مطلب یہ ہے کہ اس نے روگردانی کرنے والوں پر مہربانی فرمائی ہے کہ وہ انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اس کی بارگاہ کی طرف لوٹ آئیں۔ اس نے خبر دی کہ وہ اپنے بندوں پر رحیم ہے وہ انہیں جلدی عذاب نہیں دیتا بلکہ وہ ان سے توبہ اور رجوع کو قبول فرماتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے کتاب میں اپنے اوپر یہ لازم کر لیا، وہ کتاب اس کے پاس ہے، کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے'' (1)۔ یعنی جب اس نے اپنا فیصلہ ظاہر فرمایا اور جس کے لیے چاہا ظاہر فرمایا تو اس نے لوح محفوظ میں یہ تحریر ظاہر فرمائی یا جس میں ظاہر کرنا چاہا۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ خبر سچ ہے اور وعدہ حق ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے یعنی میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے جاتی ہے اور اس پر زائد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيَجْمَعَنَّكُمْ لام قسم ہے، نون تاکید ہے۔ فراء وغیرہ نے کہا: یہ جائز ہے کہ الرَّحْمَةَ پر کلام مکمل ہو اور مابعد وضاحت کی جہت سے نئی کلام ہو، پس لَيَجْمَعَنَّكُمْ کا معنی ہو گا وہ تمہارے جمع کرنے کو مؤخر کرے گا اور وہ تمہیں مہلت دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تمہیں قبور میں جمع کرے گا اس دن تک جس کا تم انکار کرتے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: الی بمعنی فی ہے یعنی وہ تمہیں قیامت کے دن میں جمع کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ لَيَجْمَعَنَّكُمْ، الرَّحْمَةَ سے بدل کی بنا پر منصوب ہو اس صورت میں لام بمعنی ان ہو گا۔ معنی یہ ہو گا کہ تمہارے رب نے تمہیں جمع کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، اسی طرح بہت سے نحویوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہا ہے: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ (یوسف: 35) یعنی أن یسجنوہ۔ بعض علماء نے فرمایا: كَتَبَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے، جیسا کہ (ان) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ یہ رحمت کی تفسیر کرنے والا ہے کہ وہ قیامت تک مہلت دیتا ہے، یہ زجاج سے مروی ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 356

لَا رَيْبَ فِيْهِ اس میں شک نہیں۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ یہ مبتدا خبر ہیں، یہ زجاج نے کہا ہے۔ یہ عمدہ قول ہے اس میں سے جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔ تو کہتا ہے: الذی یکرمنی فله درهم۔ فاشرط اور جزا کے معنی کے مضمن ہونے کی وجہ سے ہے۔ اخفش نے کہا: اگر تو چاہے تو اَلَّذِيْنَ کو لَيَجْمَعَنَّكُمْ میں کم ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں بنا دے یعنی وہ ضرور ان مشرکوں کو جمع کرے گا جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا اپنے آپ کو۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے، اس نے کہا: یہ خطا ہے، کیونکہ اس کو مخاطب اور مخاطب سے بدل نہیں بنایا جاتا یہ نہیں کہا جاتا: مررت بك زيدٍ اور نہ یہ کہا جاتا ہے: لا امررت بی زیدٍ کیونکہ یہ مشکل ہی نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے۔ قتبی نے کہا: یہ جائز ہے کہ اَلَّذِيْنَ، الْمُكَذِّبِيْنَ سے بدل ہو جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یا یہ ان کی صفت ہو بعض نے فرمایا اَلَّذِيْنَ نداء مفرد ہے۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝

''اور اسی کا ہے جو بس رہا ہے رات میں اور دن میں اور وہی سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ آپ فرمایئے: کیا بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی کو (اپنا) معبود بناؤں؟ (وہ اللہ جو) پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور خود نہیں کھلایا جاتا۔ فرمایئے: بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں سب سے پہلے سر جھکانے والا (نیز یہ حکم دیا گیا ہے کہ) ہرگز نہ بننا شرک کرنے والوں سے۔ آپ فرمایئے: میں ڈرتا ہوں اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے عذاب سے۔ وہ شخص ٹال دیا گیا عذاب جس سے اس روز تو یقیناً رحم فرمایا اللہ نے اس پر اور یہی کھلی کامیابی ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ یعنی جو ثابت ہے یہ بھی مشرکوں کے خلاف حجت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی، کیونکہ انہوں نے کہا تھا ہم جانتے ہیں کہ جو تم کرتے ہو اس پر تمہیں کوئی چیز نہیں ابھارتی مگر حاجت، پس ہم تمہارے لیے مال جمع کرتے ہیں حتیٰ کہ تو ہمارے غنی لوگوں میں ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محبوب! انہیں بتایئے کہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ مجھے غنی کرنے پر قادر ہے۔ سکن کا معنی پرسکون ہونا اور ٹھہرنا ہے مراد ہے جو ساکن ہے اور جو متحرک ہے سامع کے علم کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ساکن کو خصوصی طور پر ذکر کیا، کیونکہ سکون جن کو شامل ہے وہ حرکت کرنے والی چیزوں سے زیادہ ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے جو اس نے پیدا کیا یہ تمام ساکن و متحرک مخلوقات کو شامل ہے، کیونکہ اس پر رات، دن جاری ہوتے ہیں۔ اس مفہوم کی بنا پر سکون سے مراد وہ نہ ہو گا جو حرکت کی ضد ہے بلکہ مراد مخلوق ہے۔ یہ عمدہ قول ہے، کیونکہ یہ مختلف اقوال کا جامع ہے۔

وَهُوَ السَّمِيعُ وہ ان کی آوازوں کو سننے والا ہے۔ الْعَلِيمُ ۝ ان کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا، اتخذ کے دو مفعول ہیں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آباء کے دین بت پرستی کی طرف بلایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اے پیارے محمد! تم کہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا رب، معبود اور ناصر بناؤں؟ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اسم جلالت کی صفت کی بنا پر جر کے ساتھ ہے۔ اخفش نے مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ زجاج نے کہا: مدح کی بنا پر نصب بھی جائز ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: فعل مضمر پر اس کی نصب بھی جائز ہے گویا فرمایا: أترك فاطر السّٰموات والأرض کیا میں آسمانوں اور زمین پیدا کرنے والے کو چھوڑ دوں؟ کیونکہ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا اس کی ولایت کے ترک پر دلالت کرتا ہے۔ اس دلالت کی قوت کی وجہ سے فعل کا اضمار بہتر ہے۔

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ اکثر علماء کی یہی قرأت ہے یعنی وہ رزق دیتا ہے، اسے رزق نہیں دیا جاتا، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ۝ (الذاریات) میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں۔ سعید بن جبیر، مجاہد اور اعمش کی قرأت وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يَطْعَمُ ہے۔ یہ قرأت عمدہ ہے یعنی وہ بندوں کو رزق دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں جس کی مخلوق محتاج ہوتی ہے مثلاً غذا (وغیرہ)۔ دونوں فعلوں کو یا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کھلاتا ہے اور انہیں رزق دیتا ہے اور بت نہ اپنے آپ کو کھلاتا ہے اور نہ اپنے بنانے والے کو کھلاتا ہے۔ پہلے میں یا اور عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی بت وَلَا يُطْعِمُ نہیں کھلاتا یا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ۔ کھانا کھلانے کو خصوصاً ذکر کیا گیا ہے دوسرے انعامات کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ تمام لوگوں کو اس کی زیادہ حاجت ہوتی ہے۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ یعنی سب سے پہلے میں اللہ کے امر کے سامنے سر جھکاؤں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اپنی قوم اور اپنی امت سے میں پہلے اخلاص کا اظہار کروں۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ یعنی مجھے کہا گیا کہ تو ہرگز نہ بنا مشرکوں میں سے۔

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي یعنی ڈرتا ہے کہ میں غیر کی عبادت کروں گا تو وہ مجھے عذاب دے گا۔ الخوف کا معنی مکروہ کی توقع ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: أَخَافُ یہاں اعلم کے معنی میں ہے۔

مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ یعنی جس سے عذاب ٹالا گیا۔ يَوْمَئِذٍ یعنی قیامت کا دن۔ فَقَدْ رَحِمَهُ وہ نجات پا گیا، کامیاب ہو گیا اور رحم کیا گیا۔

کوفیوں نے من یصرف یا کے فتحہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابوعبید کا یہی مختار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ قُلْ لِّلَّهِ۔ اور ارشاد ہے فَقَدْ رَحِمَهُ، رُحِمَ مجہول کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا اور حضرت ابی کی قرأت کی وجہ سے من یصرفه الله عنه۔ سیبویہ نے پہلی قرأت کو اختیار کیا ہے اور اہل مدینہ اور ابی عمرو کی قرأت ہے۔ سیبویہ نے کہا: جب کلام میں اضمار کم ہوتا ہے تو بہتر ہوتا ہے۔ رہی ان کی قرأت جنہوں نے یصرف یاء کے

فتحہ کے ساتھ پڑھا تو اس کی تقدیر یہ ہوگی: من یصرف اللہ عنہ العذاب اور جب من یصرف عنہ پڑھا جائے گا تو تقدیر یہ ہوگی من یصرف عنہ العذاب۔

وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ یعنی واضح نجات۔

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی دکھ تو نہیں کوئی دور کرنے والا اس دکھ کو سوائے اس کے اور اگر پہنچائے تجھے کوئی بھلائی (اس کو کوئی روک نہیں سکتا) وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ، المس اور الکشف، اجسام کی صفات سے ہیں یہاں مجازاً استعمال ہوا ہے معنی یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر فقر یا مرض کی شدت نازل ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا سے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر آپ کو عافیت، خوشحالی، نعمت ملے تو اللہ تعالیٰ خیر اور شر پر قادر ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے غلام! یا فرمایا: اے میرے بیٹے! کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھاؤں جن کے ساتھ تجھے اللہ تعالیٰ نفع دے''۔ میں نے کہا: ضرور کرم فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو یاد کر وہ تیری حفاظت فرمائے گا، تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر تو اسے اپنے سامنے پائے گا، تو خوشحالی میں اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر وہ شدت میں تجھ پر کرم فرمائے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر اور جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، جو کچھ ہونا ہے اس کے ساتھ قلم خشک ہو چکا ہے۔ اگر تمام مخلوق تجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے جس کا تیرے لیے اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔ تو اللہ کے لیے شکر اور یقین کے ساتھ عمل کر اور جان لے کہ ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنے میں خیر کثیر ہے اور نصرت و کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور کشادگی، کرب کے ساتھ ہے اور تنگی کے ساتھ آسانی ہے''(1)۔ اس حدیث کو ابوبکر بن ثابت خطیب نے اپنی کتاب ''الفصل والوصل'' میں ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے بھی ذکر کی ہے اور یہ مکمل ہے۔

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ۫ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

''اور وہ غالب ہے اپنے بندوں پر اور وہ بڑا دانا ہر چیز سے خبردار ہے۔ آپ پوچھیے: کون سی چیز بڑی (معتبر) ہے

1۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 134-133، حدیث 631۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2440، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گواہی کے لحاظ سے؟ آپ ہی بتایئے: اللہ، وہی گواہ ہے میرے درمیان اور تمہارے درمیان۔ اور وحی کیا گیا ہے میری طرف یہ قرآن تا کہ میں ڈراؤں تمہیں اس کے ساتھ اور (ڈراؤں) اسے جس تک یہ پہنچے۔ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خدا اور بھی ہیں۔ آپ فرمایئے: میں تو (ایسی جھوٹی) گواہی نہیں دیتا۔ آپ فرمایئے: وہ تو صرف ایک خدا ہی ہے اور بے شک میں بیزار ہوں ان (بتوں) سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ، القهر کا معنی غلبہ ہے۔ القاھر کا معنی غالب ہے۔ اقھر الرجل بولا جاتا ہے جب کوئی مجبور کر کے ذلیل کیا جائے۔ شاعر نے کہا۔

تَمَنَّى حُصَيْنٌ أَن يَسُودَ جِذَاعَه فَأَمسى حُصَينٌ قَد أَذَلَّ و أَقهرا

قہر کا معنی ہے مغلوب کیا گیا۔ فَوْقَ عِبَادِهِ غلبہ کے ساتھ فوقیت مراد ہے، یعنی تمام بندے اس کے حکم کے تحت مسخر ہیں۔ فوقیت سے فوقیت مکانی مراد نہیں ہے، جیسے تو کہتا ہے: السلطان فوق رعیتہ یعنی سلطان منزل و رفعت کے اعتبار سے رعیت سے بلند ہے۔ قہر میں ایک زائد معنی ہے جو قدرت میں نہیں وہ ہے کسی کو مراد حاصل کرنے سے روک دینا۔ وَهُوَ الْحَكِيمُ وہ اپنے امر میں حکیم ہے۔ الْخَبِيرُ ۝ اپنے بندوں کے اعمال سے باخبر ہے یعنی جو ان صفات سے متصف ہو واجب ہے کہ اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً اس کا واقعہ یہ ہے کہ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کون تمہاری گواہی دیتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے یہاں لفظ شی اللہ کے اسم کی جگہ واقع ہوا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ اکبر شهادة یعنی وہ ربوبیت کے ساتھ منفرد ہے اپنی توحید پر براہین کا قیام بہت بڑی شہادت ہے وہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ ہے کہ میں نے تمہیں تبلیغ کی اور میں نے جو کچھ کہا اور جو میں نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے میں اس میں سچا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ قرآن میری نبوت کا گواہ ہے۔ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ اے اہل مکہ! میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراتا ہوں اور وَمَنْۢ بَلَغَ جس کو قرآن پہنچا ہے۔ کلام کی طوالت کی وجہ سے ھا حذف کی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بالغ ہوا۔ اس سے دلیل پکڑی جاتی ہے کہ جو بالغ نہیں ہوا وہ مخاطب نہیں ہے اور وہ مکلف نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ: 67) اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے۔

صحیح بخاری میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: "میری طرف سے پہنچاؤ اگر چہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل کے متعلق بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے" (1)۔ خبر میں ہے جس کو کتاب اللہ کی ایک آیت پہنچی تو اسے اللہ کا امر پہنچا اسے وہ اپنائے یا

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 91

اسے ترک کرے (اس کی مرضی) مقاتل نے کہا: جن و انس میں سے جس کو قرآن پہنچا وہ اس کے لیے نذیر (ڈرانے والا) ہے۔ قرطی نے کہا: جس کو قرآن پہنچا گویا اس نے حضرت محمد ﷺ کو دیکھا اور ان سے سنا۔ ابونہیک نے: وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ پڑھا یعنی معروف کا صیغہ پڑھا۔ یہ جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى استفہام توبیخ و تقریع کے لیے ہے۔ ائنکم اصل پر دو ہمزوں کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جب تو دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرے گا تو تو کہے گا: ئنکم، اصمعی نے ابوعمرو اور نافع سے آئنکم روایت کیا ہے یہ لغت معروفہ ہے دو ہمزوں کے درمیان الف لگایا جاتا ہے، کیونکہ دو ہمزے جمع کرنا ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أيا ظبيةَ الوعساءِ بين جلاجلٍ    وبَيْنَ النَّقَا آ أنتِ أم أمُّ سالِمِ

اور جنہوں نے اَنکم پڑھا خبر کی بنا پر تو اس نے ان پر شرک ثابت کیا۔ اور فرمایا: اٰلِهَةً اُخْرٰى، اُخر نہیں فرمایا۔ فراء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ الھۃ جمع ہے اور جمع پر تانیث واقع ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف:180) اور ارشاد ہے: فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى۝ (طٰہٰ) اور اگر الاوّل اور الاخر ہوتا تو بھی صحیح ہوتا۔ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ یعنی میں تمہارے ساتھ گواہی نہیں دیتا، کلام کی دلالت کی وجہ سے معکم کو حذف کیا گیا ہے اس کی مثال یہ ہے: فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ اگر وہ گواہی دیں تو تم ان کے ساتھ گواہی نہ دو۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۲۰

”جنہیں ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اس نبی کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو پہچانا اور جان بوجھ کر مخالفت کی۔ اس کا مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَلَّذِیْنَ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یَعْرِفُوْنَهٗ یہ محل خبر میں ہے یعنی نبی کریم ﷺ کو پہچانتے تھے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الکتاب ہے یعنی وہ اسے پہچانتے تھے جس پر وہ کتاب دلالت کرتی ہے یعنی اس صفت پر ہے جو نبی کریم ﷺ کے امر کی صحت پر دلالت کرتی ہے۔ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یہ نعت کی جگہ پر ہے اور اس کا مبتدا ہونا اور فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝ کا خبر ہونا بھی جائز ہے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۝۲۱
وَ یَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو، بے شک فلاح نہیں پائیں گے ظلم کرنے والے۔ اور (یاد کرو) وہ دن جب ہم جمع کریں گے سب کو پھر ہم کہیں گے انہیں جو شرک کیا کرتے تھے کہ کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے (خدا ہونے کا) تم دعویٰ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مبتدا اور خبر ہیں یعنی کوئی زیادہ ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰى جس نے بہتان باندھا(1)۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ مراد قرآن اور معجزات ہیں۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے دنیا میں وہ فلاح نہیں پائیں گے، پھر نئی کلام شروع فرمائی فرمایا: وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا اس کا معنی ہے یاد کرو جب ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ظالم دنیا میں فلاح نہیں پائیں گے اور نہ اس دن جس میں ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ اس تقدیر پر الظّٰلِمُوْنَ پر وقف نہیں ہوگا، کیونکہ یہ متصل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مابعد کے متعلق ہے اور وہ اُنْظُرْ ہے یعنی دیکھ کیسے انہوں نے جھٹلایا اس دن کو جس میں ہم انہیں جمع کریں گے یعنی کیسے اس دن کو جھٹلاتے ہیں جس میں ہم انہیں جمع کریں گے؟

ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ یہ سوال انہیں رسوا کرنے کے لیے ہے نہ کہ وضاحت طلب کرنے کے لیے ہے۔ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ تم کہتے تھے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے شفیع ہیں یہ تمہیں اللہ کا قرب بخشیں گے۔ یہ ان کو توبیخ ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن میں زعم کا لفظ کذب کے معنی میں ہے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

''پھر نہیں ہوگا کوئی عذر ان کا بجز اس کے کہ کہیں کہ اس اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ، الفتنة سے مراد پرکھنا اور آزمائش کرنا ہے یعنی ان کے پاس جواب نہ ہوگا جب انہیں اس سوال سے آزمایا جائے گا اور وہ حقائق دیکھ لیں گے اور اس کے دعاوی اٹھ جائیں گے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ وہ شرک سے برأت کریں گے اور شرک سے نفی کریں گے جب وہ مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور درگزر دیکھیں گے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اخلاص والوں کے اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردے گا اور اس پر کسی گناہ کو بخشا بڑا نہیں ہے۔ جب مشرکین یہ دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ہمارا رب گناہوں کو بخشتا ہے اور شرک کو نہیں بخشتا تم آؤ ہم کہیں ہم گنہگار تھے اور ہم مشرک نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: چونکہ انہوں نے شرک کو چھپایا پس ان کے مونہوں پر مہر لگا دو، پس ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی، ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے کرتوتوں کی ان کے پاؤں گواہی دیں گے اس وقت مشرکین پہچان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 277

حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ (النساء) اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات۔

ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس آیت کی تاویل بہت لطیف ہے، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے واقعات اور ان کی شرک کے ساتھ آزمائش کی خبر دی، پھر بتایا کہ ان کی معذرت اور بہانا کوئی نہ ہوگا جب وہ حقائق کو دیکھیں مگر یہ کہ وہ شرک سے برأت کا اظہار کریں گے۔ اس کی مثال لغت میں یہ ہے کہ تو ایک انسان کو دیکھتا ہے جو ایک گمراہ شخص سے محبت کرتا ہے، پھر جب وہ ہلاکت میں گرتا ہے تو وہ اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے، کہا جاتا ہے: تیری اس سے محبت نہ تھی مگر تو نے اس سے برات کی۔ حسن نے کہا: یہ منافقین کے ساتھ خاص ہے جو اپنی عادت پر دنیا میں چلتے رہے۔ فِتْنَتُهُمْ کا معنی ہے ان کے کفر کا انجام۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی ہے ان کا معذرت کرنا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ملاقات کرے گا اور فرمائے گا: اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی اور تجھے سردار نہیں بنایا تھا اور میں نے تیرا نکاح نہیں کیا تھا اور میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ کو مسخر نہیں کیا تھا، میں نے تجھے رئیس نہیں بنایا تھا کہ راحت سے رہتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں اے میرے رب! پھر فرمائے گا: کیا تو گمان رکھتا تھا کہ تو مجھ سے ملاقات کرنے والا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تجھے فراموش کر دیا جس طرح تو نے مجھ فراموش کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ دوسرے بندے سے ملے گا تو اسے فرمائے گا: وہ بھی اسی طرح کہے گا، پھر تیسرے سے ملے گا اسے یہ فرمائے گا تو وہ کہے گا: یارب! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے رسول پر ایمان لایا اور میں نے نماز پڑھی اور میں نے روزہ رکھا اور میں نے صدقہ کیا، جتنی اسے طاقت ہو گی وہ تعریف کرے گا۔ فرمایا: اسے کہا جائے گا: یہاں ٹھہر، پھر اسے کہا جائے گا: ابھی ہم تجھ پر گواہ پیش کریں گے، وہ دل میں سوچے گا: کون ہے جو مجھ پر گواہی دے گا؟ پھر اس کے منہ پہ مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران، گوشت اور ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی، وہ اپنے نفس سے بہانہ بنائے گا: یہ منافق ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا'' (1)۔

## اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''دیکھو کیسا جھوٹ باندھا انہوں نے اپنے نفسوں پر اور گم ہو گئیں ان سے جو افترا بازیاں کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ مشرکوں کا اپنا قول انہیں جھٹلائے گا کہ بتوں کی عبادت انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرے گی، بلکہ انہوں نے یہ گمان کیا اور ان کا گمان غلط تھا ان سے معذرت قبول کرنے کا باعث نہیں تھا اور ان سے جھوٹ کا اسم زائل نہیں ہوتا اور منافقوں کا عذر باطل کے ساتھ جھوٹ بولنا ہے اور ان کا انکار ان کا نفاق ہے۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ یعنی دیکھو کیسے ان کا افتراء لاشی ہو گیا اور اپنے خداؤں سے شفاعت کا گمان کیسے باطل ہو گیا؟ بعض علماء نے فرمایا: وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ کا مطلب ہے جو وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے وہ ان سے جدا ہو گیا اور انہیں کسی چیز نے فائدہ نہیں دیا۔ حسن سے مروی ہے اس کا معنی ہے ان کی دہشت کی وجہ سے ان کا افتراء ان

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

سے جدا ہو جائے گا اور ان کی عقول کے ذہول کی وجہ سے ایسا ہوگا۔

اُنْظُرْ کے ارشاد سے مراد عبرت کی نظر سے دیکھنا ہے، پھر کہا گیا: كَذَبُوْا بمعنی یکذبون ہے، مستقبل کو ماضی سے تعبیر کیا گیا۔ اور آخرت میں ان کا جھوٹ بولنا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دہشت، حیرت اور ذہول کی حالت میں ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت میں ان سے جھوٹ واقع ہونا جائز نہیں، کیونکہ دنیا میں جو کچھ ہوا اس کا دار جزا ہے۔ اکثر اہل نظر کا یہی نظریہ ہے۔ یہ دنیا میں ہے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ کا معنی اس مفہوم پر یہ ہوگا کہ ہم اپنے خیال میں مشرک نہ تھے اور آخرت میں جھوٹ بولنے کے جواز پر وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ (النساء: 42) سے اعتراض وارد ہوتا ہے یہاں کوئی معارضہ اور تناقض نہیں ہے کیونکہ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا بعض مقامات پر ہوگا جب ان پر ان کی زبانیں، ہاتھ، پاؤں ان کے اعمال کے متعلق گواہی دیں گے اور اعضاء کی شہادت سے پہلے بعض مقامات پر وہ جھوٹ بولیں گے، جیسا پہلے گزر چکا ہے۔

سعید بن جبیر نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ وہ عذر پیش کریں گے اور حلف اٹھائیں گے۔ اسی طرح ابن نجیح اور قتادہ نے کہا ہے۔ مجاہد سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے علاوہ سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں اور لوگ آگ سے نکالے گئے ہیں تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ یعنی ہم نے جان لیا کہ پتھر نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان دیتے ہیں۔ یہ اگرچہ قول صحیح ہے، انہوں نے سچ بولا اور چھپایا نہیں لیکن ان کا عذر قبول نہ ہوگا، کیونکہ معاند کافر ہے اور غیر معذور ہے پھر ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ میں پانچ قرأتیں ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے یکن کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور فتنتهم کو یکن کی خبر کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا، یکن کا اسم ہے یعنی الا قولهم کے مفہوم میں ہے۔ یہ قرأت واضح ہے۔ اہل مدینہ اور ابو عمرو نے تکن تا کے ساتھ اور فتنتهم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا یعنی الا مقالتهم۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے ثم لم تکن کی بجائے وما کان فتنتهم الا ان قالوا پڑھا ہے۔ ابن عمر، عاصم نے حفص کی روایت سے اور اعمش سے مفضل کی روایت سے۔ حسن اور قتادہ وغیرہم نے ثم لم تکن کو تا کے ساتھ اور فتنتهم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اِلَّآ اَنْ قَالُوْا کو خبر بنایا ہے۔ یہ چار قرأتیں ہیں۔ اور پانچویں قرأت ثم لم یکن (یاء کے ساتھ) اور فتنتهم رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ فتنہ کو مذکر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ الفتون کے معنی میں ہے۔ اس کی مثال فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى (بقرہ: 275) یہاں بھی جاء فعل مذکر ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ فاعل موعظة ہے۔ واللہ، واؤ قسم کے لیے ہے رَبِّنَا اسم جلالت کی صفت یا بدل ہے اور جنہوں نے رَبَّنَا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے وہ ندا کی بنا پر ہے یعنی یا ربنا۔ یہ عمدہ قرأت ہے، کیونکہ اس میں عجز اور تضرع کا مفہوم ہے مگر اس میں قسم اور جواب قسم کے درمیان منادیٰ کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ

الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

”اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تا کہ نہ سمجھیں وہ اسے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے اور اگر وہ دیکھ لیں ہر ایک نشانی بھی تو نہیں ایمان لائیں گے ان کے ساتھ یہاں تک کہ جب حاضر ہوں آپ کے پاس جھگڑتے ہوئے آپ سے (تو کہتے ہیں وہ لوگ) جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں یہ (قرآن) مگر جھوٹے قصے پہلے لوگوں کے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ لفظ، من کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد کا صیغہ ذکر فرمایا مراد مشرکین، کفار مکہ ہیں۔ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً یعنی ہم نے انہیں ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے ایسا کیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سنتے اور سمجھتے نہیں لیکن جو وہ سنتے ہیں اس سے نفع حاصل نہیں کرتے اور وہ حق کی اطاعت نہیں کرتے تو وہ ایسے شخص کی مانند ہو گئے جو نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ اَكِنَّةً پردوں کو کہتے ہیں۔ یہ کنان کی جمع ہے جیسے الاسنۃ جمع ہے سنان کی اور الاعنۃ جمع عنان کی، کننت الشیٔ فی کنہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کسی چیز کو کسی شے میں محفوظ کرے اکننت الشیٔ کا مطلب ہے میں نے اسے چھپا دیا۔ اور کنانہ ترکش کو کہتے ہیں۔ والکنۃ کاف اور نون کے فتحہ کے ساتھ۔ تیرے باپ کی بیوی، بیٹے یا بھائی کی بیوی کو بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کی حفاظت میں ہوتی ہے۔

اَنْ یَّفْقَهُوْهُ اس کا معنی ہے یفھموہ یعنی اس کو سمجھیں۔ یہ محل نصب میں ہے اس کا معنی ہے کراھیۃ ان یفھموہ یا اس کا معنی ہے لئلا یفقھوہ۔

وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا، وَقْرًا سے مراد بوجھ ہے۔ کہا جاتا ہے: وَقِرت أذنہ (1) واؤ کے فتحہ کے ساتھ تَوْقَر وَقْرًا یعنی اس کے کان بہرے ہو گئے۔ اس کے مصدر کا قیاس حرکت تھی لیکن یہ تسکین کے ساتھ آیا ہے۔ وقد وقر اللہ أذنہ یقرھا وقرا کہا جاتا ہے اللھم قِرْ أذنہ۔ ابو زید نے عربوں سے حکایت کیا ہے أذنٌ موقورۃ یعنی مجہول استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر وُقِرت واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہو گا۔ طلحہ بن مصرف نے وِقرًا واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس نے ان کے کانوں میں ایسی چیز ڈال دی جس نے اسے سننے سے روک دیا۔ یہ وقر العیر سے تشبیہ کی بنا پر ہے اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کو اونٹ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ الوقر سے مراد الحمل ہے کہا جاتا ہے: نخلۃ مُوقِر و مُوقِرۃ جب کہ وہ کھجور بہت زیادہ پھل دار ہو۔ رجل ذُو قِرۃ جب وہ وقور (بفتح واو) والا ہو۔ کہا جاتا ہے: وَقُر الرجل (قاف کے ضمہ کے ساتھ) وقارا و وقر قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا اللہ تعالیٰ نے ان کے عناد کی خبر دی، کیونکہ انہوں نے چاند کو دو لخت ہوتے دیکھا تو کہنے لگے: یہ جادو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انہوں نے بغیر حجت کے آیات کا انکار کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ ان کا جھگڑا یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: تم وہ کھاتے ہو جو تم خود قتل کرتے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 279

ہو اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ قتل کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا سے مراد قریش ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قریش نے نضر بن حرث کو کہا: محمد کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا ہوں وہ پہلے لوگوں کے قصے بیان کرتا ہے جیسے میں تمہیں پہلے لوگوں کے واقعات بتاتا ہوں۔ نضر قصے اور واقعات بیان کرتا تھا اس نے عجم کے شہروں میں رستم اور اسفندیار کے قصے سنے تھے پھر انہیں وہ بیان کرتا تھا۔ اساطیر کا مفرد اسطار ہے جیسے ابیات کی جمع ابابیت ہے۔ زجاج سے مروی ہے اخفش نے کہا: اس کا مفرد اسطورۃ ہے جیسے احدوثۃ اور احادیث ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اس کا واحد اسطارۃ ہے۔ نحاس نے کہا: اس کا واحد اسطور ہے جیسے عثکول ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ اسطار کی جمع ہے اور اسطار، سطر کی جمع ہے سَطْر و سَطَرٌ، السطر وہ چیز جو لکھی اور مؤلف ہو جیسے کتاب کی سطر۔ قشیری نے کہا: اس کا واحد اسطیر ہے۔ بعض نے کہا: یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے جیسے مذاکیر د عبادید، ابابیل وغیرہ، یعنی جس کو پہلے لوگ اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ جوہری وغیرہ نے کہا: الاساطیر سے مراد اباطیل اور الترھات ہیں۔

میں کہتا ہوں: میرے کسی شیخ نے کہا:

تطاول لیلی لهم وساوس الرتب أتی بالترهات الاباطیل

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''اور وہ روکتے ہیں اس سے اور دور بھاگتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور وہ (اتنا بھی) نہیں سمجھتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ، النھی کا معنی روکنا ہے اور النای کا معنی دور کرنا ہے۔ یہ تمام کفار کو شامل ہے یعنی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے منع کرتے ہیں اور خود بھی دور بھاگتے ہیں۔

یہ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ابو طالب کے ساتھ خاص ہے، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے سے کفار کو منع کرتے تھے اور خود آپ پر ایمان لانے سے دور ہوتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اہل سیرت نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کعبہ کی طرف نکلے اور نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، جب نماز میں داخل ہوئے، ابو جہل لعنہ اللہ نے کہا: کون اس شخص کی طرف جائے گا اور اس کی نماز فاسد کر دے گا؟ ابن زبعری کھڑا ہوا، اس نے گوبر اور خون اٹھایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈال دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز چھوڑ کر واپس آ گئے، پھر آپ ابو طالب کے پاس گئے اور کہا: اے چچا جان! کیا آپ نے نہیں دیکھا جو میرے ساتھ کیا گیا؟ ابو طالب نے پوچھا: تمہارے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: عبد اللہ بن زبعری نے۔ ابو طالب اٹھے، تلوار اپنے کندھے پر رکھی اور آپ کے ساتھ چل پڑے حتیٰ کہ لوگوں کے پاس آئے، جب لوگوں نے ابو طالب کو آتا ہوا دیکھا تو اٹھنے لگے۔ ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! اگر کوئی شخص اٹھا تو میں اسے اپنی تلوار سے کاٹ کر رکھ دوں گا، وہ سب بیٹھ گئے حتیٰ کہ ابو طالب ان کے قریب آئے، پھر کہا بیٹا! تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبد اللہ بن زبعری نے۔ ابو طالب نے گوبر اور خون اٹھایا اور ان کے

چہروں، داڑھیوں اور کپڑوں پر مل دیا اور انہیں بہت برا کہا۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا جان! تمہارے متعلق ایک آیت اتری ہے۔ ابو طالب نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: تم قریش کو منع کرتے ہو کہ وہ مجھے اذیت دیں اور خود مجھ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہو۔ ابو طالب نے کہا:

واللهِ لن يَصِلُوا إليكَ بجمعهم حتّى أُوَسَّدَ في التُّراب دَفِينَا
فاصدَعْ بأمرِكَ ما عليكَ غَضَاضَةٌ وابْشِرْ بذاكَ وقَرَّ منكَ عُيُونَا
ودَعَوتَنِي وزعمتَ أنكَ ناصِحِي فلقد صدقتَ و كنتَ قبلُ أمينَا
وَعَرَضْتَ دِينًا قد عرفتُ بأنّه من خيرِ أدْيَانِ البَرِيّةِ دِينَا
لولا الملامةُ أو حِذارُ مَسَبّةٍ لوجدْتَنِي سَمْحًا بذاكَ يَقِينَا

لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا آپ کی ابو طالب نے جو مدد کی ہے وہ اسے نفع دے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اس سے اس وجہ سے بیڑیاں دور کی گئی ہیں اور انہیں شیاطین کے ساتھ جکڑا نہیں جائے گا اور انہیں سانپوں اور بچھوؤں والے کنوئیں میں نہیں ڈالا گیا ہے، اس کا عذاب یہ ہے ان کے پاؤں میں آگ کے جوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے سر میں ان کا دماغ ابل رہا ہے اور یہ دوزخیوں میں آسان ترین عذاب والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: 35)

صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے کہا: ''تم لا الہ الا اللہ پڑھو میں اس کی وجہ سے قیامت کے روز تمہارے لیے گواہی دوں گا'' (1)۔ انہوں نے کہا: اگر قریش مجھے یہ عار نہ دلاتے کہ جزع نے مجھے یہ پڑھنے پر مجبور کیا ہے تو میں اس کے ساتھ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرتا، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (القصص: 56)

یہ لفظ الجذع ہے جس کا معنی ضعف اور کمزوری ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخیوں میں کم ترین عذاب والا ابو طالب ہے، اسے آگ کے جوتے پہنائے گئے ہیں جن سے ان کا دماغ ابل رہا ہے'' (2)۔ رہا عبداللہ بن زبعری تو وہ فتح مکہ کے سال اسلام لایا تھا اور بہت عمدہ اسلام لایا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عذر پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عذر قبول کیا۔ وہ عمدہ شاعر تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا تھا اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بہت سے اشعار ہیں جو ان کے حالت کفر کے اشعار کو نسخ کرتے ہیں۔ اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں یہ اشعار کہے:

مَنَعَ الرُّقَادَ بَلَابِلٌ وهُمُومُ واللَّيلُ مُعْتَلِجُ الرِّوَاقِ بَهِيمُ
مِمَّا أتانِي أنّ أحمدَ لامَنِي فيه فبِتُّ كأنّني مَحْمُومُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 40 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 115

يا خيرَ من حملت على أوصالِها　عيرانةٌ سُرُحُ اليدينِ غَشُومُ
إنّي لمعتذرٌ إليكَ من الّذي　أسديتُ إذْ أنا في الضّلال أهيمُ
أيامَ تأمرني بأغوى خطةٍ　سَهْمٌ و تأمرني بها مخزومُ
وأمدُّ أسبابَ الرّدى ويقودني　أمرُ الغواةِ وأمرهم مشؤومُ
فاليومَ آمنَ بالنبيّ محمّدٍ　قلبي و مُخطِئُ هذه محرومُ
مضَتِ العداوةُ فانقضتْ أسبابُها　وأتتْ أواصِر بيننا وحُلومُ
فاغفرْ فدىً لكَ والِدايَ كلاهُما　زَلَلِي فإنّكَ راحمٌ مرحومُ
وعليكَ من سِمَةِ المليكِ علامةٌ　نورٌ أغرُّ وخاتمٌ مختومُ
أعطاكَ بعدَ محبّةٍ برهانَهُ　شرفًا و برهانُ الإلهِ عظيمُ
ولقد شهدتُ بأنّ دينكَ صادقٌ　حقًّا وإنّكَ في العباد جسيمُ
واللهُ يشهدُ أنّ أحمدَ مصطفًى　مستقبلٌ في الصالحين كريمُ
قرمٌ علا بنيانُه من هاشمٍ　فرعٌ تمكّنَ في الذُّرى وأرُومُ

بعض علماء نے فرمایا: يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہنستے تھے، وہ قرآن سے روکتے تھے اور ان سے دور بھاگتے تھے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ پہلے دو قولوں کی بنا پر عنہ کی ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوگی اور قتادہ کے قول کی بنا پر ضمیر کا مرجع قرآن ہوگا۔ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ، ان نافیہ ہے یعنی وہ نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے نفسوں کو کفر پر اصرار کرنے کے ساتھ اور جن کو روکتے ہیں ان کے بوجھ اٹھانے کے ساتھ۔

## وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

''اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ پر تو کہیں گے: اے کاش! (کسی طرح) ہم لوٹا دیئے جائیں تو (پھر) نہیں جھٹلائیں گے اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہم ہو جائیں گے ایمانداروں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ یعنی کل جب کھڑے کیے جائیں گے، کیونکہ اذ کبھی اذا کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور کبھی اذا، اذ کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مستقبل کا امر گویا ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے، اسی وجہ سے ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ اور اِذْ وُقِفُوْا کا معنی ہے جب وہ روک لیے جائیں گے کہا جاتا ہے: وقفته وقفاً فوقف وقوفا۔ ابن السمیقع نے إذ وَقَفوا واو اور قاف کے فتحہ کے ساتھ وقوف سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

عَلَى النَّارِ یعنی وہ پل صراط کے اوپر ہوں گے اور آگ ان کے نیچے ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: علی بمعنی با ہے یعنی جب وہ اس کے قریب ٹھہریں گے اور اسے دیکھیں گے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے جمعوا یعنی جب آگ کے دروازوں پر جمع

کیے جائیں گے کہا جاتا ہے: وہ جہنم کے پیٹھ پر روکے جائیں گے گویا وہ پگھلی ہوئی چربی کی پیٹھ ہے، پھر ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا (اے آگ!) اپنے ساتھی پکڑ لے اور میرے ساتھی چھوڑ دے۔ بعض علماء نے فرمایا: وقفوا کا معنی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں آگ سے بچائے) اس صورت میں علیٰ بمعنی فی ہوگا یعنی وہ آگ میں داخل کیے جائیں گے۔ لو کا جواب محذوف ہے تاکہ ہر چیز کی طرف وہم جائے۔ یہ ڈرانے کے لیے زیادہ بلیغ ہے، معنی یہ ہے اگر آپ انہیں اس حالت میں دیکھیں گے تو بہت بری حالت میں دیکھیں گے یا بہت ہولناک منظر دیکھیں گے یا آپ بہت عجیب امر دیکھیں گے۔ اور اس تقدیر کی مثل کوئی اور تقدیر بھی ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اہل مدینہ اور کسائی کی قرأت تینوں افعال پر رفع ہے۔ ابوعمرو، ابوبکر نے عاصم سے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن عامر نے نکذب پر رفع اور نکون پر نصب پڑھی ہے (1) یہ سب تمنی کے معنی میں داخل ہیں یعنی وہ تمنا کریں گے کہ انہوں نے نہ جھٹلایا ہوتا اور مومنین میں سے ہوتے۔ سیبویہ نے ولا نکذب کو علیحدہ کر کے پڑھا ہے اور اس کو تمنی کے تحت داخل نہیں کیا ہے معنی یہ ہے کہ ہم نہیں جھٹلائیں گے تکذیب کے ترک پر ثبات کے معنی کی بنا پر، یعنی ہم نہیں جھٹلائیں گے۔ ہم لوٹائے گئے یا نہ لوٹائے گئے۔ سیبویہ نے کہا: یہ اسی قول کی مثل ہے دعنی ولا اعود یعنی مجھے چھوڑ دو میں کسی حال میں نہیں لوٹوں گا آپ مجھے چھوڑیں یا نہ چھوڑیں (2)۔ ابوعمرو نے تمنی سے اس کے خروج پر اس آیت سے دلیل پکڑی ہے: وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ کبھی جھوٹ تمنی میں نہیں ہوتا یہ خبر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تمنی میں داخل کیا ہے ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں قیامت کے انکار اور اور رسولوں کی تکذیب میں جھوٹے ہیں۔ حمزہ اور حفص نے نکذب اور نکون کو تمنی کے جواب کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ یہ واجب نہیں ہے یہ دونوں تمنی میں داخل ہیں اس معنی پر کہ لوٹنے، تکذیب ترک کرنے اور مومنین سے ہونے کی تمنا کریں گے۔ ابو اسحاق نے کہا ولا نکذب کا معنی ہے اگر ہم لوٹائے گئے تو ہم نہیں جھٹلائیں گے نکذب اور نکون کی نصب ان کے اضمار کے ساتھ ہے جیسے استفہام، امر، نہی اور عرض کے جواب میں نصب دی جاتی ہے، کیونکہ یہ تمام واجب نہیں اور ابھی تک واقع نہیں ہوا۔ پس جواب کو واو کے ساتھ نصب دی جاتی ہے گویا پہلے فعل کے مصدر پر عطف کیا گیا ہے گویا انہوں نے کہا: یالیتنا یکون لنا رد وانتفاء من الکذب وکون من المومنین پس ان دونوں کو نرد کے مصدر پر محمول کیا گیا ہے رفع کی طرف معنی کی تبدیلی کی وجہ سے، پس اس میں ان کا اضمار ضروری ہے دونوں فعلوں میں نصب مکمل ہو گا۔ ابن عامر نے تمنی کے جواب کی بنا پر تکون پر نصب پڑھی ہے جیسے تیرا قول ہے: لیتک تصیر الینا نکرمک یعنی لیت مصیرك يقع واکرامنا یقع پہلے دونوں فعلوں کو تمنی میں داخل کیا یا یہ ارادہ کیا کہ ونحن لا نکرمک علیحدہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابی نے ولا نکذب بِاٰیٰتِ ربنا ابدا پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود سے يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ فَلَا نُكَذِّبَ فا اور نصب کے ساتھ بھی مروی ہے۔ فا کے ساتھ بھی جواب میں نصب دی جاتی ہے جس طرح واو کے ساتھ نصب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 281 2۔ ایضاً

دی جاتی ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ اور اکثر بصری علماء جواب میں نصب کو جائز قرار نہیں دیتے مگر فا کے ساتھ۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

''بلکہ عیاں ہوگیا ان پر جسے چھپایا کرتے تھے پہلے اور اگر انہیں بھیجا جائے (جیسے ان کی خواہش ہے) تو پھر بھی وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے اور بے شک وہ جھوٹے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ان کی تمنی اور ایمان کے دعویٰ سے اضراب ہے کہ اگر انہیں واپس بھیجا جائے۔

بَدَا لَهُمْ کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں اس تعیین کے بعد کہ مراد کون ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں، کیونکہ کفر کا اسم ان کو بھی شامل ہے پس ضمیر بعض مذکورین کی طرف راجع ہے۔ نحاس نے کہا: یہ انتہائی شیریں اور فصیح کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد کفار ہیں، انہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وعظ کرتے تھے تو وہ ڈرتے تھے اور اس خوف کو چھپاتے تھے تاکہ ان کے ضعیف اور کمزور لوگ پہچان نہ لیں پس یہ قیامت کے روز ظاہر ہوگا (1)، اسی وجہ سے حسن نے کہا: بَدَا لَهُمْ بعض کے لیے ظاہر ہوا جو وہ بعض سے چھپاتے تھے۔ بعض نے فرمایا: بلکہ ظاہر ہوا ان کے لیے جو شرک سے انکار کرتے تھے۔ وہ کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ پس اللہ تعالیٰ ان کے اعضاء کو بولنے کی طاقت بخشے گا اور وہ ان کے خلاف کفر کی گواہی دیں گے یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے پہلے جو چھپایا تھا وہ عیاں ہوگا۔ یہ ابو روق نے کہا ہے۔ اور بعض نے فرمایا: بَدَا لَهُمْ ان کے لیے عیاں ہوگا جو وہ کفر میں سے چھپاتے تھے یعنی ان کے برے اعمال ظاہر ہوں گے جیسا کہ فرمایا: وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ (الزمر)

مبرد نے کہا: ان کے کفر کی جزا ظاہر ہوگی جس کو وہ چھپاتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ظاہر ہوگا ان کے لیے جنہوں نے گمراہ لوگوں کی اتباع کی وہ جو گمراہ لوگ بعث اور قیامت کے امر سے چھپاتے تھے، کیونکہ اس کے بعد ہے وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ اور کہتے ہیں نہیں کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور ہم نہیں اٹھائے جائیں گے (قبروں سے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوْا بعض نے فرمایا: عذاب دیکھنے کے بعد۔ اور بعض نے فرمایا: عذاب دیکھنے سے پہلے اگر وہ واپس بھیجے گئے۔ لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ یعنی وہ اسی شرک وغیرہ کی طرف لوٹ جائیں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی آیات دیکھیں، پھر بھی ہٹ دھری کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اس کے متعلق خبر دی ہے اور ان کی اس حالت کو بیان کیا ہے جس پر وہ دنیا میں تھے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرتے تھے اور دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے تھے جیسا کہ فرمایا: وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ (النحل: 124)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 282

اس کو آئندہ کی حالت سے حکایت کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جھوٹے ہیں اس میں جو انہوں نے اپنے بارے میں خبر دی کہ وہ تکذیب نہیں کریں گے مومن ہوں گے۔ یحییٰ بن وثاب نے ولو رِدُّوا را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اصل رُدِدُوا تھا دال کا کسرہ را کی طرف نقل کیا گیا۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝۲۹

''اور کہتے ہیں نہیں کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور ہم نہیں اٹھائیں جائیں گے (قبروں سے)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا یہ مبتدا خبر ہیں۔ ان نافیہ ہے اور نحن، ما کا اسم ہے اور بِمَبْعُوْثِیْنَ اس کی خبر ہے۔ یہ ان کے متعلق خبر دینے کی ابتدا ہے جو کچھ انہوں نے دنیا میں کہا تھا۔ ابن زید نے کہا: یہ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ کے تحت داخل ہے۔

اور انہوں نے کہا: نہیں ہے کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیوی زندگی کے، یعنی وہ کفر کی طرف لوٹ گئے اور دنیا کی لذت میں مشغول ہو گئے۔ یہ ہٹ دھری پر محمول ہو گا جیسا کہ ہم نے ابلیس کی حالت کے بارے میں بیان کیا ہے یا اس پر محمول ہو گا کہ اللہ تعالیٰ عرفان کے بعد ان پر ملتبس فرما دے گا۔ یہ عقلاً شائع اور عام ہے۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۰

''اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کیے جائیں گے اللہ کے حضور میں، اللہ فرمائے گا: کیا یہ (قبروں سے اٹھنا) حق نہیں؟ کہیں گے؟ بے شک (حق ہے) ہمارے رب کی قسم! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو اب چکھو عذاب بسبب اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ، وُقِفُوْا کا معنی ہے روکے جائیں گے۔ عَلٰى رَبِّهِمْ جو ان کے بارے میں اللہ کا حکم ہو گا اس پر۔ بعض علماء نے فرمایا: علی بمعنی عند ہے یعنی ملائکہ کے پاس اور جزا کے پاس اور جہاں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بادشاہی نہ ہو گی۔ تو کہتا ہے: وقفت علی فلان یعنی عندہ میں فلاں کے پاس ٹھہرا۔ لو کا جواب وقوف کی بڑائی کے لیے حذف کیا گیا ہے۔ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ یہ تقریر اور توبیخ ہے یعنی کیا یہ دوبارہ اٹھنا حق نہیں؟ قَالُوْا بلٰی وہ کہیں گے: کیوں نہیں؟ اپنے اعتراض کو قسم کے ساتھ مؤکد کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ انہیں اللہ کے حکم سے کہیں گے: کیا یہ دوبارہ اٹھنا اور عذاب حق نہیں ہے؟ پس وہ کہیں گے: بَلٰى وَ رَبِّنَا ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ حق ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ۝۳۱

''بے شک خسارہ میں رہے وہ جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملاقات (کی خبر) کو یہاں تک کہ جب آ گئی ان پر

قیامت، اچانک بولے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم سے ہوئی اس زندگی میں۔ اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ، لقاء اللہ سے مراد مرنے کے بعد اٹھنا ہے اور جزا ہے اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین کاذبۃ لیقطع بھا مال امرء مسلم لقی اللہ وھو علیہ غضبان (1) (یعنی جو جھوٹی قسم اٹھائے گا تا کہ اس کے ذریعے مسلمان آدمی کا مال لے لے وہ اللہ سے ملے گا جب کہ وہ اس پر ناراض ہوگا) اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کرے گا جب دیدار کرنے والے دیدار کریں گے۔ یہ قول قفال وغیرہ کا ہے۔ قشیری نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ لقا کو جزا پر اس جگہ محمول کیا جاتا ہے جہاں دلیل قائم ہو ہر جگہ یہ مفہوم ثابت نہیں ہوتا۔ پس لقا کو اس آیت میں ظاہر پر محمول کرنا چاہیے۔ کفار، صانع کا انکار کرتے ہیں روایت کا منکر وجود کا منکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قیامت کو ساعت کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں حساب بہت جلد ہوگا۔ بغتۃ کا معنی ہے اچانک۔ کہا جاتا ہے: بَغَتَهم الأَمْرُ يَبْغَتُهُم بَغْتًا بَغْتَةً یہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور سیبویہ کے نزدیک مصدر ہے (2) حال کی جگہ میں ہے جیسے تو کہتا ہے: قتلتہ صَبْرًا اور یہ شعر پڑھا:

فَلَأْيًا بِلَأْيٍ ما حَمَلْنا وَلِيدَنَا   علی ظَهْرِ مَحْبوكٍ ظِمَاءٍ مَفَاصِلُهُ

سیبویہ نے اس پر قیاس کرنے کو جائز قرار نہیں دیا یہ نہیں کہا جاتا: جاء فلان سرعۃً۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا، حسرۃ پر ندا واقع ہوا ہے یہ حقیقت میں منادیٰ نہیں ہے، لیکن یہ حسرت کی کثرت پر دلالت کرتا ہے جیسے یا للعجب و یا للرخاء یہ حقیقت میں منادیٰ نہیں ہیں لیکن یہ کثرت تعجب اور رخا پر دلالت کرتا ہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا فرمایا: یا عجب تعال فھذا زمن إتیانك ہائے تعجب آ یہ تیرے آنے کا زمانہ ہے۔ اسی طرح تیرا قول ہے: یا حسرتی یعنی یا حسرۃ تعالی فھذا وقتك یعنی اے حسرت! آ یہ تیرا آنے کا وقت ہے۔ اسی طرح جس میں ندا صحیح نہ ہو وہ اسی طرح جاری ہوگا یہ تیرے قول تعجب سے زیادہ بلیغ ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

فیا عجبًا من رَحْلِها المتحمَّلِ

بعض علماء نے فرمایا: یہ لوگوں کو اس بڑی حسرت پر تنبیہ ہے جو ان کو لاحق ہوگی یعنی اے لوگو! اس عظیم حسرت پر آگاہ رہو جو میری طرف سے ہوگی پس ندا حقیقت میں غیر منادی پر واقع ہے جیسے تیرا قول ہے: لا أُرِيَنَّكَ هاهنا میں تجھے یہاں نہ دیکھوں پس نہی غیر منہی پر حقیقت میں واقع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا یعنی قیامت کے بارے میں اور اس کے اعمال پیش کرنے میں جو کوتاہی ہوئی۔ حسن سے مروی ہے: فَرَّطْنَا کا معنی ہے ہم نے ضائع کیا، اس کی اصل آگے بڑھنا ہے۔ کہا جاتا ہے فرط فلان یعنی وہ پانی کی طرف سب سے پہلے پہنچا، اسی سے حدیث ہے أنا فَرَطكم علی الحوض (3) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ اسی سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 985  2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 283  3۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1045

الفارط ہے پانی کے لیے آگے بڑھنے والا، اسی سے ہے: اللهم اجعله فرطا لابویه یہ بچے کے جنازہ میں دعا مانگی جاتی ہے، اے اللہ! اسے اپنے والدین کے لیے (جنت میں) پیش رو بنا۔ عربوں کا قول ہے فرطنا یعنی ہم نے عجز کو مقدم کیا، بعض علماء نے فرمایا فرطنا یعنی ہم نے دوسروں کو اللہ کی اطاعت کی طرف مقدم کر دیا اور ہم پیچھے رہ گئے۔ فیھا یعنی دنیا میں قیامت کے لیے عمل ترک کر کے کوتاہی کی۔ طبری نے کہا: ھا بیع کی طرف راجع ہے۔ یہ اس لیے کہ جب ان کے لیے ان کے سودا کا گھاٹا ظاہر ہوا جو انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا تھا اور آخرت کے بدلے دنیا کو ترجیح دی تھی تو انہوں نے کہا: یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا یعنی صفقه (سودا) میں کوتاہی کی اس پر افسوس۔ کلام کی چونکہ اس پر دلالت موجود تھی اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ گھاٹا نہیں ہوتا مگر بیع کے سودا میں اس کی دلیل فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (بقرہ:16) کا ارشاد ہے۔ سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے افسوس جو جنت کے موجب اعمال کو ہم نے ضائع کیا۔ خبر میں ہے حضرت ابوسعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: دوزخی لوگ جنت میں اپنے محلات دیکھیں گے تو کہیں گے: یا حسرتنا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ اوزار سے مراد گناہ ہیں یہ وزر کی جمع ہے۔ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ یہ بطور مجاز کہا گیا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا گیا ہے جو بوجھ اٹھاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: وَزَرَ یَزِرُ، وَزِرَ یُوْزَرُ فھو وازرٌ و مَوْزُوْرٌ اس کی اصل الوزر سے ہے جس کا مطلب پہاڑ ہے۔ اسی سے حدیث میں ان عورتوں کے بارے میں ہے جو جنازہ کے ساتھ نکلتی ہیں ارجعن مَوْزُوْراتٍ غیرَ مأجوراتٍ(1) یعنی گناہ اٹھانے والیاں لوٹ جائیں جو اجر حاصل کرنے والی نہیں ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: عام لوگ کہتے ہیں مازورات گویا اس کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ یہ وزر سے ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: وہ شخص جو کپڑا بچھاتا ہے اور اس میں سامان رکھتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے: أحمل وزرك اپنا بوجھ اٹھا۔ اسی سے الوزیر ہے کیونکہ وہ امور مملکت جو اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں وہ ان کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اس کا معنی ہے انہیں گناہ لازم ہوئے اور وہ ان کی وجہ سے بھاری ہو گئے۔

اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ۝ یعنی بہت بری ہے وہ چیز جس کو وہ اٹھاتے ہیں۔

**وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝**

''اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل اور تماشا اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لیے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں تو کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ دنیوی زندگی کو لہو اور تماشا اس کی مدت کے کم ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے جیسے شاعر نے کہا:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 114

أَلَا إِنَّمَا الدُّنْيَا كَأَحْلَامِ نَائِمٍ وَمَا خَيْرُ عَيْشٍ لَا يَكُونُ بِدَائِمِ

تَأَمَّلْ إِذَا مَا نِلْتَ بِالْأَمْسِ لَذَّةً فَأَفْنَيْتَهَا هَلْ أَنْتَ إِلَّا كَحَالِمِ

ایک اور شاعر نے کہا:

فَاعْمَلْ عَلَى مَهَلٍ فَإِنَّكَ مَيِّتٌ وَاكْدَحْ لِنَفْسِكَ أَيُّهَا الْإِنْسَانُ

فَكَأَنَّ مَا قَدْ كَانَ لَمْ يَكُ إِذْ مَضَى وَكَأَنَّ مَا هُوَ كَائِنٌ قَدْ كَانَا

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے دنیوی زندگی متاع لہو ولعب ہے یعنی وہ چیز جس کو وہ دنیا میں چاہتے ہیں اس کے لیے کوئی انجام نہیں وہ لہو ولعب کے قائم مقام ہے۔ سلیمان بن عبدالملک نے آئینہ دیکھا اور کہا: میں بادشاہ جوان ہوں۔ اس کی لونڈی نے اسے کہا:

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقَى غَيْرَ أَنْ لَا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ

لَيْسَ فِيمَا بَدَا لَنَا مِنْكَ عَيْبٌ كَانَ فِي النَّاسِ غَيْرَ أَنَّكَ فَانِي

اور بعض علماء نے کہا: لہو ولعب کا معنی باطل اور غرور ہے جیسا کہ فرمایا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (آل عمران) پس آیت سے مقصد کفار کا جھٹلانا ہے ان کے قول میں ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا۔ اللعب (کھیل) معروف ہے التلعابة بہت زیادہ کھیل۔ الملعب کھیل کی جگہ۔ کہا جاتا ہے: لعب یلعب، کھیلنا، اللھو بھی معروف ہے ہر وہ چیز جو تجھے مشغول کرے اس نے تجھے غافل کر دیا۔ لھوت، اللھو سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل کسی شے سے پھرنا ہے۔ یہ عربوں کے قول: لھیت عنه سے مشتق ہے۔ مہدوی نے کہا: اس میں بعد ہے، کیونکہ جس کا معنی پھرنا ہے اس کا لام کلمہ یا ہے اس کی دلیل لھیان ہے اور پہلا لام کلمہ واو ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** لہو ولعب سے وہ نہیں ہے جو امور آخرت سے ہے، کیونکہ لعب کی حقیقت وہ ہے جس سے نفع حاصل نہ ہو اور لہو وہ ہے جس کے ذریعے غفلت ہو اور جو کام آخرت کی غرض سے ہو وہ لہو ولعب سے خارج ہے۔ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے دنیا کی مذمت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دنیا اس شخص کے لیے دار الصدق ہے جو اس میں سچ کہتا ہے اور یہ دار نجات ہے اس شخص کے لیے جو اس کو سمجھ جاتا ہے اور یہ دار غنا ہے اس شخص کے لیے جو اس سے زاد راہ لیتا ہے۔ محمود وراق نے کہا:

لَا تُتْبِعِ الدُّنْيَا وَأَيَّامَهَا ذَمًّا وَإِنْ دَارَتْ بِكَ الدَّائِرَةْ

مِنْ شَرَفِ الدُّنْيَا وَمِنْ فَضْلِهَا أَنْ بِهَا تُسْتَدْرَكُ الْآخِرَةْ

ابو عمر بن عبد البر نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا ملعون ہے اور اس میں جو کچھ ہے وہ بھی ملعون ہے مگر جو اس میں اللہ کے ذکر سے ہے یا جو اللہ کے ذکر تک پہنچائے اور عالم اور معلم اجر میں دونوں شریک ہیں اور باقی تمام لوگ رذیل ہیں ان میں خیر نہیں ہے'' (1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56

ہے۔ انہوں نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرمایا: ''دنیا کی حقارت الله کے نزدیک یہ ہے کہ نافرمانی نہیں کی جاتی مگر اس میں اور جو الله کے پاس ہے اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا مگر دنیا کو ترک کرنے کے ساتھ''۔

ترمذی نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے فرمایا رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''اگر دنیا الله کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو وہ اس میں سے کسی کافر کو ایک پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتا'' (1)۔ شاعر نے کہا:

تَسَمَّعْ من الأيام إن كنتَ حازماً　　فإنك منها بين ناهٍ وآمِرِ

إذا أبقتِ الدنيا على المرء دِينه　　فما فات من شئ فليس لضائرِ

ولن تعدل الدنيا جناحَ بعوضةٍ　　ولا وَزْنَ زِفٍّ من جناحٍ لطائرِ

فما رَضِيَ الدنيا ثوابا لمؤمنٍ　　ولا رضي الدنيا جزاءً لكافرِ

حضرت ابن عباس نے فرمایا: لہو و لعب کافر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ دھوکے اور باطل کاموں میں ضائع کرتا ہے لیکن مومن کی زندگی اعمال صالحہ سے لبریز ہوتی ہے وہ لہو و لعب نہیں ہوتی۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ اس سے مراد جنت ہے۔ خیر اس لیے ہے، کیونکہ یہ باقی ہے اور اس کو آخرت اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہم سے موخر ہے۔ اور دنیا کو دنیا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے قریب ہے۔

ابن عامر نے وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ یعنی ایک لام کے ساتھ پڑھا ہے اور اضافت مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے۔ تقدیر یہ ہے ولدار الحیاۃ الاخرۃ اور جمہور کی قرات پر وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ ہے۔

لام، لام ابتدائیہ ہے اور دار کو رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے اور الْاٰخِرَةُ اس کی صفت ہے اور خبر خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ ہے اس کی تائید تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ (القصص:83) اور وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ (العنکبوت:64) سے ہوتی ہے ان دونوں جملوں میں الآخرۃ، الدار کی صفت ہے۔

لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ یعنی شرک سے بچتے ہیں۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾ یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی کیا وہ نہیں جانتے کہ معاملہ اس طرح ہے تاکہ وہ دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے؟ والله اعلم۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

''(اے حبیب!) ہم جانتے ہیں کہ رنجیدہ کرتی ہے آپ کو وہ بات جو یہ کہہ رہے ہیں تو وہ نہیں جھٹلاتے آپ کو بلکہ یہ ظالم (دراصل) الله کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اور بیشک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے تو انہوں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56

نے صبر کیا اس جھٹلائے جانے پر اور ستائے جانے پر یہاں تک کہ آ پہنچی انہیں ہماری مدد اور نہیں کوئی بدلنے والا اللہ کی باتوں کو اور آ ہی چکی ہیں آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ لام کے دخول کی وجہ سے ان کو کسرہ دیا گیا ہے۔ ابو میسرہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: اے محمد! اللہ کی قسم ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے، تو ہمارے نزدیک سچا ہے لیکن ہم اس کو جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی: فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا۔ يُكَذِّبُوْنَكَ کو مخفف اور مشدد دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ہم معنی ہیں جیسے حزنتہ اور احزنتہ ہم معنی ہیں۔ ابو عبید نے تخفیف کی قرات کو اختیار کیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے۔ ان سے مروی ہے کہ ابوجہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ اسے جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ۔

نحاس نے کہا: اس میں ابو عبید کی مخالفت کی گئی ہے اور لَا يُكَذِّبُوْنَكَ بھی مروی ہے اللہ تعالیٰ نے لَا يُكَذِّبُوْنَكَ نازل فرمایا اس کو یہ واقعہ تقویت دیتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس پر فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ تخفیف کے ساتھ پڑھا تو حضرت ابن عباس نے کہا فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کیونکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امین کہتے تھے اور يُكَذِّبُوْنَكَ کا معنی اہل لغت کے نزدیک یہ ہے کہ وہ آپ کو جھوٹ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو آپ کہتے ہیں اسے آپ پر لوٹاتے ہیں اور لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کا معنی ہے وہ آپ کو نہیں پاتے کہ آپ جھوٹ لاتے ہیں جیسے تو کہتا ہے: اکذبتہ میں نے اسے جھوٹا پایا۔ ابخلتہ میں نے اسے بخیل پایا، یعنی وہ آپ کو جھوٹا نہ پاتے اگر وہ آپ کے لائے ہوئے پیغام میں غور و فکر کرتے، یہ معنی بھی جائز ہے کہ وہ آپ پر ثابت نہیں کرتے کہ آپ جھوٹے ہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے: اکذبتہ جب تو اس پر حجت قائم کرے اور واضح کرے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور تشدید کی بنا پر معنی ہوگا کہ وہ آپ کو کسی حجت اور دلیل سے نہیں جھٹلاتے، اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ نحاس نے کہا: یہ قول ابو عبید کے مذہب میں ہے اس کا احتجاج لازم ہے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنہوں نے حدیث کو روایت کیا اور ان سے صحیح مروی ہے کہ انہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے اکذبت الرجل۔ جب تو خبر دے وہ جھوٹ لایا ہے اور اس نے جھوٹ روایت کیا ہے اور کذبتہ بولا جاتا ہے جب تو خبر دے کہ وہ جھوٹا ہے اسی طرح زجاج نے کہا ہے: کذبتہ جب تو کسی کو کہے کہ تو نے جھوٹ بولا۔ اکذبتہ جب تو ارادہ کرے کہ وہ جھوٹ لایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا یعنی تم بھی صبر کرو جس طرح انہوں نے صبر کیا۔ وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا اور وہ ستائے گئے حتیٰ کہ ہماری مدد آ پہنچی یعنی تیرے پاس وہ آئے گا جو تجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وہ اس نصرت کو ظاہر کرنے والا ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی دور نہیں کر سکتا اور اس کے فیصلہ کو کوئی توڑنے والا نہیں

اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا نہیں۔ اس کا ارشاد ہے: لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد) (ہر میعاد کے لیے نوشتہ ہے) اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر: 51) (بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی) وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿﴾ (الصافات) اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے۔ وَكَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلہ: 21) (اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے) وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿﴾، جَآءَكَ کا فاعل مضمر ہے معنی یہ ہے جاءك من نباء المرسلين نبأ۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿﴾

”اور اگر گراں ہے آپ پر ان کا (حق سے) روگردانی کرنا تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ) پھر لے آؤ ان کے پاس کوئی معجزہ (تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے)۔ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو جمع کر دیتا انہیں ہدایت پر، تو آپ نہ ہو جائیں ان سے جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ یعنی اگر تم پر ایمان سے ان کا اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا گراں ہے فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اگر طاقت رکھتے ہیں۔ اَنْ تَبْتَغِيَ کہ تلاش کر لیں۔ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ زمین میں سرنگ تا کہ تو اس جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے۔ اس سے النافقاء جو جنگلی چوہے کی بل ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اسی سے المنافق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اَوْ سُلَّمًا یہ نفقاً پر معطوف ہے یعنی آسمان کی طرف سیڑھی، یہ تمثیل ہے کیونکہ السلم کی سیڑھی ہوتی ہے جس پر چڑھا جاتا ہے وہ دوسری جگہ پہنچنے کا سبب ہوتی ہے۔ اور وہ مذکر ہے اور فراء نے سلم کی تانیث حکایت کی ہے وہ معروف نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: السلم سے مراد سیڑھی ہے۔ زجاج نے کہا: یہ السلامۃ سے مشتق ہے گویا وہ تجھے وہاں پہنچاتا ہے جہاں آپ چاہتے ہیں۔ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ اس کا سابقہ کلام پر عطف کیا گیا یعنی تا کہ وہ ایمان لے آئیں تو ایسا کرو۔ جواب حذف کیا گیا ہے، کیونکہ سامع کو علم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ ان پر زیادہ غم نہ کھائیں، کیونکہ یہ ایمان نہیں لائیں گے جیسا کہ وہ ان کی ہدایت کی طاقت نہیں رکھتے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو مومن پیدا فرماتا اور ان کو ہدایت پر پابند کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان کا کفر اللہ کی مشیت سے ہے۔ یہ قدریہ پر رد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں کوئی ایسی نشانی دکھاتا جو انہیں ایمان کی طرف مجبور کرتی لیکن اس نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے وہ اسے ثواب عطا کرے گا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿﴾ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غم زیادہ کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ انہیں

اس چیز نے شدید جزع فزع کی طرف اور غیر حلال چیز کی طرف نکالا، یعنی آپ ان کے کفر پر غمگین نہ ہوں کہ آپ حقیقت کو نہ جاننے والوں کی حالت کے قریب ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے دل ان کے کفر اور اذیت سے تنگ ہوتے ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

''صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور ان مردہ (دلوں) کو اٹھائے گا اللہ تعالیٰ پھر، وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور بولے: کیوں نہیں اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے؟ آپ فرمایئے: بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اتارے کوئی نشانی لیکن اکثر ان میں سے کچھ نہیں جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ یعنی جو غور سے سنتے اور سمجھتے ہیں اور حق کا ارادہ سنتے ہیں یہ وہ مومنین ہیں جو قبول کرتے ہیں اسے جو سنتے ہیں اور اس سے نفع حاصل کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ یہ معنی حسن اور مجاہد نے بیان کیا ہے۔ کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ اس سے مراد کفار ہیں۔ یہ حسن اور مجاہد سے مروی ہے یعنی وہ مردوں کے قائم مقام ہیں، کیونکہ وہ نہ حجت کو قبول کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف غور کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الموتی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو مر چکا ہے۔ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو حساب کے لیے اٹھائے گا۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ انہیں اللہ اور رسول پر ایمان کی ہدایت دے گا۔ حسن سے مروی ہے وہ انہیں شرک سے نکالے گا حتی کہ وہ اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ آپ پر ایمان لائیں گے یعنی موت کے وقت، دنیا میں مجبوری کی حالت میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حسن نے کہا: یہاں لولا بمعنی ھلا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَعدُّون عَقْرَ النِّيبِ أفضل مَجْدِكم بَنِي ضَوْطَرَى لولا الكَمِيَّ المُقَنَّعا

تو مشرکوں کا یہ قول دلائل کے ظاہر ہونے کے بعد ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا، کیونکہ قرآن کے ذریعے حجت قائم کی گئی تھی جس کا مثل پیش کرنے سے وہ عاجز آ گئے تھے، کیونکہ قرآن کی جو فصاحت اور غیوب کا علم ہے (وہ کسی بشر کے پاس نہیں)

وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جو آیات نازل فرماتا ہے ان میں بندوں کی مصلحت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکلیں گے جو اس پر ایمان لائیں گے اور اس نے ان کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اس کے انزال پر قادر ہے۔ زجاج نے کہا: انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ انہیں ہدایت پر جمع کر دے، یعنی مجبور کر کے جمع کر دے۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي

الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۸

''اور نہیں کوئی (جانور) چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے مگر وہ امتیں ہیں تمہاری مانند۔ نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو، پھر اپنے رب کی طرف اٹھائے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ دابة کا معنی اور تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ دب یدب فھو داب ہے جس کا معنی ہے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلنا۔ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ، طائر جر کے ساتھ ہے لفظ پر عطف کیا گیا ہے۔

حسن اور عبداللہ بن ابی اسحاق نے ولا طائرٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے مقام پر عطف کی بنا پر ایسا پڑھا ہے۔ من زائدہ ہے تقدیر وما دابةٌ ہے، بجناحیہ تاکید ہے اور ابہام کے ازالہ کے لیے ہے، کیونکہ عرب طیران کو پرندے کے علاوہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں تو کسی شخص کو کہتا ہے طرفی حاجتی یعنی تو میری حاجت کے لیے جلدی کر۔ بجناحیہ ذکر فرمایا تاکہ قول پرندے کے لیے خاص ہو جائے اور طیران کا لفظ دوسروں کے لیے مجاز ہے۔ بعض نے فرمایا: پرندے کے جسم کا اعتدال دونوں پروں کے درمیان اس کی اڑنے میں مدد کرتا ہے اگر وہ غیر معتدل ہوتا تو وہ ایک طرف جھک جاتا پس اس نے ہمیں بتایا کہ پروں کے ساتھ پرندوں کا اڑنا ہے۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (النحل: 79) جناح پرندے کی اس طرف کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے اس کی اصل کسی جانب مائل ہونا ہے اسی سے جنحت السفینة ہے جب کشتی زمین کی طرف جھک جائے اس کے ساتھ لگ کر رک جائے طائر الانسان سے مراد انسان کا عمل ہے قرآن حکیم میں ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء: 13) اور ہر انسان کی قسمت کا نوشتہ اس کے گلہ میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ یعنی وہ تمہاری مثل جماعت ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ان کے رزق کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائی ہے اور ان میں عدل قائم کیا ہے پس تم ان پر ظلم نہ کرو اور ان کے بارے میں جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اس میں تجاوز نہ کرو۔ دابة یہ لفظ تمام مادبّ پر بھی واقع ہوتا ہے جو چیزیں زمین میں ہیں ان کا خاص ذکر کیا ہے آسمان کی چیزوں کا ذکر نہیں کیونکہ وہ زمین کی چیزوں کو جانتے تھے اور ان کا مشاہدہ کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تسبیح اور دلالت میں ہماری مثل ہیں اس کا معنی ہے کوئی جانور اور پرندہ نہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے اور اس کی وحدانیت پہ دلالت کرتا ہے اگر کفار غور کریں۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: یہ اس معنی پر ہماری مثل ہے کہ جانور بھی کل اٹھائے جائیں گے۔ سینگوں والے سے بغیر سینگوں والے جانور کے لیے قصاص لیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: مٹی ہو جا۔ یہ زجاج کا اختیار ہے اس نے کہا: اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ تخلیق، رزق، موت، بعث اور قصاص میں تمہاری مثل ہیں، اس میں پہلے قول کا معنی بھی داخل ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: جانوروں اور پرندوں کی ہر صنف میں انسانوں میں مشابہت ہے، بعض لوگ شیر کی طرح دوڑتے ہیں، بعض خنزیر کی طرح حریص ہوتے ہیں، بعض کتے کی طرح غراتے ہیں، بعض مور کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں یہ مماثلت کا معنی ہے۔ خطابی نے اس کو عمدہ کہا ہے انہوں نے کہا: تو بہائم اور سباع کے ساتھ رہتا ہے

پس ان سے احتیاط حاصل کر۔ مجاہد نے کہا: اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ان کی اصناف کے نام سے ہے جن کے ساتھ یہ پہچی نے جاتے ہیں جس طرح تم پہچانے جاتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو صحیح نہیں ہیں، مثلاً وہ معرفت میں ہماری مثل ہیں وہ قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے اور جنت میں نعمتیں دیئے جائیں گے اور دنیا میں جو تکالیف ان پر آئیں ان کا عوض دیا جائے گا اور اہل جنت ان کی شکلوں کو دیکھ کر مانوس ہوں گے۔ صحیح قول یہی ہے کہ وہ ہماری طرح مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر دال ہیں، اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں، اس کی طرف سے انہیں رزق دیا جاتا ہے جس طرح تمہارا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔

سفیان کا قول عمدہ ہے، کیونکہ یہ تشبیہ ہے جو وجود میں واقع ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ، الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے جو واقعات ہوتے ہیں سب اس میں رقم فرمائے ہیں۔ بعض نے فرمایا: الکتاب سے مراد قرآن ہے یعنی ہم نے امر دین میں سے کسی چیز کو ترک نہیں کیا مگر ہم نے قرآن میں اس پر دلالت کی ہے یا تو واضح دلالت سے یا مجمل دلالت سے جس کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا اجماع سے یا قیاس سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ قیاس جو نص الکتاب سے ثابت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (النحل: 89) اور فرمایا وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا۔ اور فرمایا: اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لیے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف۔ فرمایا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

اس آیت میں اور سورۃ النحل کی آیت میں اجمالی طور پر اسے بیان فرمایا جس پر نص قائم نہ تھی اور جس کا ذکر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ قرآن میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا مگر اسے بیان فرمایا خواہ تفصیلاً خواہ اصلاً اور فرمایا اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ (المائدہ: 3) آج مکمل کر دیا میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ۝ یعنی جزا کے لیے اٹھائے جائیں گے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں گزرا ہے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز حقوق والوں کو حقوق ادا کیے جائیں گے حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے بغیر سینگوں والی بکری کے لیے قصاص لیا جائے گا''۔ یہ دلیل ہے کہ جانوروں کو بھی قیامت کے روز اٹھایا جائے گا۔ یہ حضرت ابوذر، حضرت ابو ہریرہ اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حضرت ابن عباس نے ایک روایت میں فرمایا: جانوروں اور پرندوں کا حشر ان کا مرنا ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ پہلا قول اصح ہے آیت کا ظاہر اور خبر صحیح اس کی تائید کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ (التکویر) اور حضرت ابو ہریرہ کا قول جعفر بن برقان نے یزید بن اصم کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو اٹھائے گا جانور، حیوان، پرندے اور ہر چیز کو اٹھائے گا، اس دن اللہ تعالیٰ کے عدل سے سینگوں والی بکری سے بغیر سینگوں والی بکری سے قصاص لیا جائے گا۔ پھر فرمائے گا: تو مٹی ہو جا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (النباء) اور کافر (بصد حسرت) کہے گا: کاش میں خاک ہوتا۔ عطاء نے کہا: جب جانور بنی آدم کو اور ان کی گھبراہٹ کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے ہمیں تمہاری مثل تو نہیں بنایا، ہم نہ تو جنت کے امیدوار ہیں اور نہ دوزخ کا خوف ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا: مٹی ہو جاؤ۔ اس وقت کافر خواہش کرے گا کہ وہ مٹی بن جائے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ حشر جو آیت میں ہے وہ کفار کی طرف راجع ہے اور جو درمیان میں ہے وہ کلام معترض ہے اور دلائل کا قیام ہے۔ رہی حدیث تو اس سے مقصود حساب، قصاص کی تعظیم کی جہت پر تمثیل ہے اور اس میں اعتناء کی عظمت کے اعتبار سے تمثیل ہے تاکہ اس سے سمجھا جائے کہ ہر ایک سے حساب ہوگا اس سے کسی کے لیے بھاگنا نہیں ہے اور انہوں نے اس کو ایک اور حدیث سے تائید دی ہے جو صحیح میں نہیں ہے، بعض روات سے زیادتی مروی ہے فرمایا: حتیٰ کہ بغیر سینگوں والی بکری کے لیے سینگوں والی بکری سے قصاص لیا جائے گا اور اس پتھر کے لیے قصاص لیا جائے گا جسے دوسرا پتھر لگا ہوگا اور اس لکڑی کے لیے قصاص لیا جائے گا جس کو دوسری لکڑی نے خراش دی ہوگی۔ ان علماء نے کہا: پس ظاہر ہوا کہ اس سے مقصود وہ تمثیل ہے جو عبرت اور خوف دلانے کے لیے مفید ہے، کیونکہ جمادات کو خطاب ثواب اور عقاب معقول نہیں اور کوئی بھی شعور والا یہ نظریہ نہیں رکھتا، یہ بے وقوف لوگوں کا ہی تصور ہو سکتا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: قلم ان پر جاری نہیں ہوتا پس ان سے مؤاخذہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے اگرچہ احکام میں ان پر قلم جاری نہیں ہوتا لیکن جو ان کے درمیان ہوا اس کا ان سے مؤاخذہ ہوگا۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم ﷺ کے سامنے دو بکریوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوذر! کیا تو جانتا ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے ہیں؟'' میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا'' یہ نص ہے مزید بیان ہماری کتاب التذکرۃ باحوال الموتی و امور الآخرۃ میں موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو (تو وہ) بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں (سرگرداں ہیں) جسے چاہے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اسے اور جسے چاہے لگا دے اسے سیدھے راستے پر۔ آپ فرمایئے: بھلا بتاؤ تو اگر آ جائے تم پر اللہ عذاب یا آ جائے تم پر قیامت کیا اس وقت اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ بتاؤ؟ اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اسی کو پکارو گے تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لیے اگر وہ چاہے گا اور تم بھلا دو گے انہیں

جنہیں تم نے شریک بنا رکھا تھا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں یعنی انہوں نے قوت سماعت اور قوت بصارت سے نفع نہ اٹھایا جانوروں میں سے ہر امت اپنے مصوں کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور کفار ہدایت نہیں پاتے یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ فِي الظُّلُمٰتِ یعنی کفر کی تاریکیاں۔ ابوعلی نے کہا: اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آخرت میں گونگے اور بہرے ہوں گے اس صورت میں حقیقی معنی ہوگا، مجازی معنی نہ ہوگا۔ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ یہ دلیل ہے کہ اس نے کافر کی گمراہی کو چاہا اور اس نے ارادہ کیا کہ اس میں اس کا عدل نافذ ہو کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اس نے فرمایا: وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ یعنی جسے چاہے دین اسلام پر اسے لگا دے، تا کہ اس میں اس کا فضل نافذ ہو۔ اس میں قدریہ کے مذہب کا ابطال ہے۔ مشیت ان لوگوں کی طرف راجع ہے جنہوں نے تکذیب کی۔ ان میں سے کچھ کو گمراہ کرتا ہے اور کچھ کو ہدایت دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ نافع نے دونوں ہمزوں کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے پہلے ہمزہ کی حرکت کو پہلے ہمزہ پر ڈالا ہے اور دوسرے کو بین بین پڑھا ہے۔ ابوعبید نے نافع سے حکایت کی ہے کہ وہ ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں اور ان کے عوض الف لگاتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ اہل عرب کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ یا ساکنہ ہے اور الف ساکنہ ہے اور دو ساکن جمع نہیں ہوتے۔ مکی نے کہا: ورش سے مروی ہے کہ انہوں نے ہمزہ کو الف سے بدلا، کیونکہ ان سے روایت ہے کہ وہ دوسرے ہمزہ میں مد کرتے ہیں اور مد نہیں ہوتا مگر بدل کے ساتھ بدل، اصل کی فرع ہے اور اصل یہ ہے کہ ہمزہ، ہمزہ مفتوحہ اور الف کے درمیان ہے۔ ورش کے علاوہ یہ ان کا نظریہ ہے جو دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرتے ہیں۔ ہمزہ میں بدل کا جواز بہتر ہے اس کے بعد ساکن ہے، کیونکہ پہلا حرف مد ولین ہے، مد وہ جو ساکن کے ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ اس حرکت کے قائم مقام ہوتا ہے جس کے ساتھ دوسرے ساکن کے ساتھ بولنا ممکن ہوتا ہے۔

ابوعمرو، عاصم، حمزہ نے اَرَءَيْتَكُمْ دونوں ہمزوں کی تحقیق کے ساتھ پڑھا اور انہوں نے کلمہ کو اپنی اصل پر پڑھا ہے۔ اصل ہمزہ ہے، کیونکہ ہمزہ استفہام رایت پر داخل ہوا پس ہمزہ فعل کا عین کلمہ ہے اور یاء ساکن ہے، کیونکہ اس کے ساتھ ضمیر مرفوع متصل ہے۔

عیسیٰ بن عمر اور کسائی نے اریتکم دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عربی قواعد سے بعید ہے۔ شعر میں جائز ہے عرب کہتے ہیں: ارائیتك زیدا ما شانه۔ بصریوں کا مذہب یہ ہے کہ حذف اور میم خطاب کے لیے ہے ان کا ترکیب میں کوئی محل نہیں۔ یہ زجاج کا مختار قول ہے۔ اور کسائی اور فراء وغیرہ کا مذہب یہ ہے ان کو نصب، رؤیت کے وقوع کی وجہ سے ہے۔ معنی ہے: أرایتم أنفسکم جب خطاب کے لیے ہوں گے تو تاکید کے لیے زائدہ ہوں گے اور ان اتاکم میں ان محل نصب میں ہوگا۔ کیونکہ رایت کا مفعول ہوگا اور اگر کم ضمیر اسم ہوگی تو محل نصب میں ہوگی ان دوسرے مفعول کی جگہ ہوگا پس پہلی صورت میں رویت عین سے ہوگا، کیونکہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور بمعنی علم ہوگا تو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ یا تمہارے پاس وہ وقت آجائے جس میں تم اٹھائے جاؤ گے پھر فرمایا: اَغَيْرَ اللّٰهِ

تَدۡعُوۡنَ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞ یہ آیت ان مشرکین کے خلاف حجت قائم کرنے کے لیے ہے جو اعتراف کرتے تھے کہ اس کا صانع ہے یعنی تم تکالیف میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہو اور قیامت کے روز بھی تم اس کی طرف لوٹو گے پس تم خوشحالی میں شرک پر کیوں اصرار کرتے ہو، وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے اور عذاب ٹالنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلۡ اِيَّاهُ تَدۡعُوۡنَ بل پہلی کلام سے اضراب ہے اور دوسرے کے لیے ایجاب ہے۔ اِيَّاهُ، تَدۡعُوۡنَ کی وجہ سے منصوب ہے۔ فَيَكۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَيۡهِ اِنۡ شَآءَ یعنی وہ اس تکلیف کو دور کر دے گا جس کو دور کرنے کے لیے تم اسے پکارتے ہو اگر وہ چاہے گا۔ وَتَنۡسَوۡنَ مَا تُشۡرِكُوۡنَ ۞ بعض علماء نے فرمایا: یہ عذاب کے نزول کے وقت ہوگا یعنی اس وقت وہ انہیں بھول جائیں گے جنہیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حسن نے کہا: تم اس طرح اعراض کرو گے جس طرح بھولنے والا اعراض کرتا ہے یہ اس کی طرف سے نجات سے مایوسی کے وقت ہوگا، کیونکہ اس میں نہ ضرر کی طاقت ہے، نہ نفع کی قوت ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی تترکون ہو یعنی تم چھوڑ دو گے۔ نحاس نے کہا: اس کی مثل یہ ارشاد ہے:۔ وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ: 115) اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ يَتَضَرَّعُوۡنَ ۞

''اور بے شک بھیجے ہم نے رسول امتوں کی طرف آپ سے پہلے (جب انہوں نے سرکشی کی) تو ہم نے پکڑ لیا انہیں سختی اور تکلیف سے تاکہ وہ گڑگڑائیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور تسلی ہے اس میں اضمار ہے یعنی اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ رسلا اور اس میں دوسرا اضمار بھی ہے جس پر ظاہر دلالت کرتا ہے اس کی تقدیر یہ ہے فکذبوا فاخذناھم یہ آیت ماقبل سے متصل ہے جس طرح ایک حالت اپنی سے قریب حالت سے متصل ہوتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے نبی کی مخالفت کرنے میں پہلے لوگوں کے مسلک پر چلے جنہوں نے اپنے انبیاء کی مخالفت کی تھی پس یہ اس مصیبت اور بلا میں گرفتاری کے مقام پر ہیں جو ان سے پہلے لوگوں پر نازل ہوئی۔ بِالۡبَاۡسَآءِ کا معنی اموال میں مصائب وَالضَّرَّآءِ بدنوں میں مصیبت۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصائب، تکالیف اور دوسرے ذرائع سے جو چاہتا ہے، تربیت فرماتا ہے لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ (الانبیاء: 23)

ابن عطیہ نے کہا: عبادت گزار (صوفیاء) اپنے نفسوں کو اموال کی تفریق کر کے اور جسموں پر بھوک اور بغیر لباس کے رہ کر مشقت برداشت کر کے نفسوں کی تربیت کا استدلال کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ اس کی جہالت ہے جو ایسا کرتا ہے اور جس نے اس آیت کو اس کی اصل بنایا ہے یہ اس شخص کے لیے اللہ کی طرف سے عقوبت ہے جن کو وہ ان کے ساتھ امتحان میں مبتلا کرنا چاہے۔ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اپنے نفسوں کو خود امتحان میں ڈالیں اور اس پر قیاس کرتے ہوئے تکلیف برداشت کریں، کیونکہ نفس سواری ہیں جس پر سوار ہو کر دار الکرامۃ تک پہنچنا ہے اور ان کے ذریعے قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے نجات پانا ہے قرآن حکیم میں ہے یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (المومنون: 51) اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو۔

اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (بقرہ: 267) اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (بقرہ: 172) اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس چیز کا حکم دیا جس کے ساتھ مرسلین کو خطاب کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پاکیزہ چیزیں کھاتے تھے اور خوبصورت لباس پہنتے تھے اور ان سے زینت حاصل کرتے تھے، اسی طرح تابعین کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے اور سورۂ اعراف میں لباس وغیرہ کا حکم آئے گا۔ اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح یہ کہتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ زروع، جنات، پھل، نباتات اور جانور جن کو مسخر فرمایا اور جن کو ہمارے لیے کھانا حلال کیا اور جن کے دودھ استعمال کرنے اور ان کی کھال سے گرمی حاصل کرنے کو بطور احسان ذکر نہ فرماتا۔ اگر ان کا نظریہ درست ہوتا اور اس میں فضیلت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین و علماء اس پر زیادہ عمل کرتے۔ سورۂ بقرہ میں مال کی فضیلت، منفعت اور جو اس کو جمع کرنے کا انکار کرتا ہے اس کا رد گزر چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسموں پر کمزوری کے خوف سے صوم وصال سے نہی فرمائی اور مال کو ضائع کرنے سے نہی فرمائی، جاہل اغنیاء کا رد کرتے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ وہ پکاریں اور اپنے عجز کا اظہار کریں۔ یہ الضراعۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ذلت ہے، کہا جاتا ہے: ضرع فھو ضارع۔

فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

''تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب آیا ان پر عذاب تو وہ (توبہ کرتے اور) گڑگڑاتے لیکن سخت ہو گئے ان کے دل اور آراستہ کر دیا ان کے لیے شیطان نے جو وہ کیا کرتے تھے۔ پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی

گئی تھیں کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کے جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک، اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے، تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہان والوں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا، لولا یہ تخصیص کے لیے ہے یہ وہ ہوتا ہے جو فعل کے ساتھ ملا ہوتا ہے بمعنی ھلا ہوتا ہے، یہ دعا کے ترک پر عتاب ہے اور ان کے متعلق خبر ہے کہ عذاب کے نزول کے وقت انہوں نے دعا نہیں کی۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہوں نے دعا کی ہو لیکن غیر مخلص کی طرح کی ہو یا اس وقت دعا کی ہو جب عذاب نازل ہو چکا ہو۔ اور ان تمام صورتوں میں دعا غیر نافع ہے۔ دعا کا حکم حالت خوشحالی اور شدت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

اور فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ (غافر) بے شک جو لوگ عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل وخوار ہو کر۔

یہ سخت وعید ہے۔ وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی ان کے دل سخت ہو گئے، یہ کفر اور معصیت پر اصرار سے عبارت ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے ہیں۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یعنی شیطان نے انہیں گناہوں کے ذریعے اغوا کیا اور گناہوں پر برانگیختہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کہا جاتا ہے: ان کی نسیان پر کیوں مذمت کی گئی جب کہ یہ ان کے فعل سے نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نسوا معنی ترکوا ہے یعنی انہوں نے جب ترک کر دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور ابن جریج سے مروی ہے اور یہی ابو علی کا قول ہے جو شخص کسی شے سے اعراض کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس شخص کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو بھول چکا ہو جیسے کہا جاتا ہے: ترکہ فی النسی۔ اس نے اسے بالکل بھلا دیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو نسیان کے لیے پیش کیا اس لیے مذمت جائز ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی سزا کے موجب کاموں پر مذمت جائز ہے۔

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی نعمتیں اور خیرات کے دروازے کھول دیئے یعنی ہم نے نعمتوں کی کثرت کر دی۔ اہل عرب کے نزدیک اس کی تقدیر یہ ہے کہ ہر دروازہ جو بند تھا وہ ان پر کھول دیا۔

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا حتی کہ جب وہ اکڑے اور خوش ہوئے اور یہ گمان کرنے لگے یہ نعمتیں اور مال ہمیشہ رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے۔ اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ہم نے انہیں اچانک جڑ سے اکھیڑ دیا اور ہم ان پر غالب آ گئے۔ بَغْتَةً کا معنی اچانک ہے یعنی کسی نشان کے بغیر غفلت پر پکڑ لینا۔ جب کوئی غافل ہو اور اسے پکڑا جائے تو کہتے ہیں: لقد أخذ بغتة کسی کو اچانک حملہ کر کے قتل کرنا۔ یہ البغت سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تذکیر (نصیحت) جو پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے انہوں نے اعراض کیا۔ اس کو علامت کے قائم مقام رکھا ہے واللہ اعلم۔

بَغْتَةً حال کی جگہ میں مصدر ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے جیسے فرمایا: وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (القلم) میں انہیں مہلت دوں گا میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی ناراضگی اور خفیہ تدبیر سے پناہ مانگتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے اس آیت میں غور کیا حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً۔ محمد بن نضر حارثی نے فرمایا: اس قوم کو بیس سال مہلت دی گئی۔ حضرت عقبہ بن عامر نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو گناہوں کے باوجود انہیں وہ عطا کر رہا ہے جو وہ چاہتے ہیں تو وہ اس کی طرف ان کے لیے استدراج ہے، پھر یہ آیت پڑھی: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ حسن نے کہا: اللہ کی قسم! لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں اللہ نے اس کے لیے دنیا میں کشادگی کی ہو اور وہ نہ ڈرے کہ ہو سکتا ہے اس سے تدبیر کی گئی ہو مگر اس کا عمل کم ہوا اور اس کی رائے عاجز ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بندے سے جو روک لیا اور اس نے گمان نہ کیا وہ اس کے لیے بہتر ہے مگر اس کا عمل کم ہوا اور اس کی رائے عاجز ہوئی خبر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: جب تم فقر کو اپنی طرف آتا دیکھو تو نیک لوگوں کے شعار کو مرحبا کہو اور جب تم غنی کو اپنی طرف آتا دیکھو تو کہو: گناہ جس کی سزا جلدی دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ المبلس مبہوت، غمگین اور خیر سے مایوس آدمی کو کہتے ہیں جو مایوسی بند نہیں ہوتی۔ یہ اس شدت کا جواب ہے جو ان پر نازل ہوئی۔ زجاج نے کہا:

یا صاحِ هل تعرفُ رسمًا مُكرَّسًا    قال نعَمْ أعرفُه وأبْلَسا

یعنی اس نے جو دیکھا اس کی ہولناکی کی وجہ سے حیران ہوا۔ اس سے ابلیس کا اسم مشتق ہوا۔ ابلس الرجل یعنی آدمی خاموش ہوا۔ ابلست الناقۃ وھی مبلاس اونٹنی جب نر کی خواہش میں نہ بولے۔ ضَبِعَتِ الناقةُ تَضْبَعُ ضَبَعَةً وضَبْعًا جب اونٹنی نر کو چاہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، الدابر کا معنی ہے آخر۔ کہا جاتا ہے: دَبَرَ القومُ يَدْبُرُهم دَبْرًا جو سب سے آخر میں آنے والا ہو۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے من الناس من لا یاتی الصلاۃ الا دبریا(1) یعنی لوگوں میں سے جو نماز میں آخری وقت پر آتا ہے۔ یہاں معنی ہے ان کی نسل کاٹ دی انہیں بدل دیا اور ان میں سے کوئی باقی نہ چھوڑا۔ قطرب نے کہا: انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا گیا اور انہیں ہلاک کیا گیا۔ امیہ بن ابی صلت نے کہا:

فأُهْلِكوا بعذابٍ حَصَّ دابِرَهم    فما استطاعوا له صَرْفًا ولا انتصَروا

اسی سے التدبیر ہے، کیونکہ وہ امور کے انجام کو پختہ کرتا ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: ان کے ہلاک کرنے پر حمد ہے۔ بعض نے فرمایا: مومنین کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ کیسے حمد کریں۔ یہ آیت اپنے ضمن میں ظلم کو جو با چھوڑنے پر حجت کو لیے ہوئے ہے، کیونکہ ظلم کے پیچھے جڑ کو ہی

1۔ معانی القرآن للنحاس

ختم کر دینا اور دائمی عذاب تک پہنچانا ہے ہر حامد کی طرف حمد قطع کرنے والے کے استحقاق کے ساتھ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۞ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۞

''آپ فرمایئے: بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر لے لے اللہ تعالیٰ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور مہر لگا دے تمہارے دلوں پر تو کوئی خدا ہے اللہ کے سوا جو لا دے تمہیں یہ چیزیں؟ ملاحظہ ہو کس کس رنگ سے ہم بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلیں پھر بھی وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ آپ فرمایئے: یہ تو بتاؤ اگر آ جائے تم پر عذاب اچانک یا کھلم کھلا تو کون ہلاک کیا جائے گا بغیر ظالم لوگوں کے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ یعنی اگر تم سے قوت سماعت اور دیکھنے کی استطاعت واپس لے لے۔ سَمْعَكُمْ کو مفرد ذکر فرمایا، کیونکہ مصدر جمع پر دلالت کرتا ہے۔ وَ خَتَمَ مہر لگا دے۔ یہ پہلے سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ''ان'' کا جواب محذوف ہے تقدیر عبارت ہے فمن یاتیکم بہ، بہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ حال واقع ہو رہا ہے جیسے تیرا قول ہے: اضرب بہ ان خرج یعنی خارجا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ معانی ہیں جو ان اعضاء کے ساتھ قائم ہیں اللہ جوارح (اعضاء) اور اعراض سب کو لے جاتا ہے اور کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا (النساء: 47) یہ آیت کریمہ کفار پر حجت ہے۔

مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ، مَّنْ مبتدا ہے اور اس کی خبر الہ ہے اور غیرہ اس کی صفت ہے اسی طرح یاتیکم محل رفع میں ہے کیونکہ الہ کی صفت ہے اس کا ذکر استفہام کے ذکر کی طرح ہے اور یہ جملہ رایتم کے دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ارایتم کا معنی علمتم ہے بہ میں ضمیر کو مفرد ذکر فرمایا، حالانکہ پہلے ذکر جمع کا ہو چکا ہے، کیونکہ معنی مراد ہے پس ھا مذکور کی طرف راجع ہے، بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع سمع ہے جیسے ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ: 62) ابصار اور قلوب تضمین کی دلالت کے ساتھ داخل ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ ان مذکورات میں سے ایک کو۔ بعض نے فرمایا: ہدایت کی طرف ضمیر راجع ہے معنی جس کو شامل ہے۔

عبد الرحمن اعرج نے بِهٖ ۗ اُنْظُرْ ھا کے ضمہ کے ساتھ اصل پر پڑھا ہے، کیونکہ اصل میں ہ مضمومہ ہوتی ہے جیسے تو کہتا ہے: جئت معہ۔ نقاش نے کہا: اس آیت میں سمع کی بصر پر فضیلت کی دلیل ہے، کیونکہ یہاں اور دوسری آیت میں سمع کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ بقرہ کی ابتدا میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ آیات کو مختلف جہات سے بیان کرنا کبھی اعذار، کبھی انذار کبھی ترغیب کبھی ترہیب، یہ تصریف الایات کا مفہوم ہے۔

ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۞ پھر وہ اعراض کرتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ کہا جاتا

ہے: صدف عن الشی جب کوئی کسی سے اعراض کرے اس کا مصدر صدف او صدوفا آتا ہے اور صادف اسم فاعل آتا ہے۔
صادفته مصادفة اس کی اعراض کی جہت سے میں اسے ملا۔ ابن رقاع نے کہا:

إذا ذكرن حديثا قلن أحسنه وهن عن كل سوء يتقى صدف

الصدف فی البعیر اونٹ کا پاؤں یا ہاتھ وحشی جانب مائل ہوا۔ هُمْ يَصْدِفُونَ وہ حج اور آیات سے اعراض کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً حسن نے کہا: بَغْتَةً سے مراد رات کے وقت اور جَهْرَةً سے مراد دن کے وقت ہے۔ بعض نے فرمایا: بَغْتَةً کا معنی اچانک ہے۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: بغتهم الامر يبغتهم بغتا و بغتة جب اچانک ان کے پاس آجائے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ اس کی مثال یہ آیت ہے فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف) یعنی کیا کوئی ہلاک ہوگا سوائے تمہارے، کیونکہ تم نے شرک کیا۔ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا: يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان) اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔

## وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشی خبری سنانے کے لیے اور (عذاب جہنم سے) ڈرانے کے لیے تو جو ایمان لانے اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو کوئی خوف نہیں ہوگا انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ یعنی مرسلین ترغیب و ترہیب کرتے ہیں۔ حسن نے کہا: دنیا میں رزق کی وسعت کی بشارت دیتے ہیں اور آخرت میں ثواب کی بشارت دیتے ہیں اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف: 96) منذرین کا معنی اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں، یعنی ہم نے رسولوں کو ترغیب و ترہیب کی غرض سے بھیجا نہ کہ اس لیے کہ جو مطالبہ ان سے کسی نشانی کا کیا جائے وہ دکھائیں وہ تو ایسی آیات لے کر آتے ہیں جن کے ساتھ ان کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا: فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

## وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو پہنچے گا انہیں عذاب بوجہ اس کے کہ وہ حکم عدولی کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا آیات سے مراد قرآن اور معجزات ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ انہیں عذاب پہنچے گا۔ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ جو وہ کفر کرتے تھے۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں کہ خود جان لیتا ہوں غیب کو اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں نہیں پیروی کرتا میں مگر وحی کی جو بھیجی جاتی ہے میری طرف۔ آپ فرمائیے: کیا (کبھی) برابر ہو سکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا؟ تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ یہ ان کے قول لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کیوں نہ اتاری گئی ان پر آیت اس کے رب کی طرف سے۔ کا جواب ہے مطلب یہ ہے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خزانے نہیں ہیں کہ میں اتاروں جو تم کسی نشانی کا مطالبہ کرو اور نہ میں غیب جانتا ہوں کہ تمہیں اس کے متعلق خبر دوں۔ الخزانۃ وہ چیز جس میں کوئی چیز محفوظ کی جائے۔

حدیث شریف میں ہے ''لوگوں کے لیے اس کے مویشیوں کی کھیریاں ان کے کھانے خزانہ کیے ہوئے ہوتی ہیں، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کے بالا خانہ میں کوئی آئے اور اس کی الماری توڑ دی جائے'' (1)۔ خزائن اللہ سے مراد اس کی مقدورات ہیں یعنی میں اس کا مالک نہیں کہ جو تم تجویز پیش کرو میں وہ سب کر گزروں وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ فرشتے افضل ہیں یعنی میں فرشتہ نہیں ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے ان امور کا مشاہدہ کروں جو ایک بشر نہیں کرتا۔ جو علماء کہتے ہیں کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ اس کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور پر کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتے مگر جس میں وحی آجاتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انبیاء کرام کی طرف سے اجتہاد، منصوص پر قیاس جائز ہے اور قیاس ادلہ شرعیہ سے ہے مزید بیان سورۂ اعراف میں آئے گا اور انبیاء کے اجتہاد کے جواز پر گفتگو سورۂ انبیاء میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ، الْاَعْمٰى سے مراد کافر اور الْبَصِیْرُ سے مراد مومن ہے یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد جاہل اور عالم ہیں۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ دونوں برابر نہیں ہیں کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4505

''اور ڈرائیے اس (قرآن) سے انہیں جو ڈرتے ہوں اس سے کہ اٹھایا جائے گا انہیں ان کے رب کی طرف اس حالت میں کہ نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارشی (انہیں ڈرایئے) تا کہ یہ (کامل) پرہیزگار ہو جائیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْذِرْ بِهِ، ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ انذار کا معنی اعلام (آگاہ کرنا) ہے یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، بعض نے فرمایا: آخرت کا دن ہے۔

الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا، اَنْ کو خاص فرمایا، کیونکہ ان پر حجت کو ثابت فرمایا یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں نہ وہ حشر کے بارے میں متردد ہیں، معنی یہ ہے کہ وہ حشر کے عذاب کی توقع رکھتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: يَخَافُوْنَ کا معنی ہے وہ جانتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اسے ڈرایئے تا کہ وہ گناہ چھوڑ دے اگر وہ اہل کتاب ہے تو اسے ڈرایئے تا کہ وہ حق کی اتباع کرے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد مومنین ہیں۔ زجاج نے کہا: ہر وہ شخص مراد ہے جو دوبارہ اٹھنے کا اقرار کرتا ہے خواہ وہ مومن ہے یا کافر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آیت مشرکین کے بارے میں ہے یعنی انہیں قیامت کے دن سے ڈرایئے۔ پہلا قول اظہر ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ اللہ کے سوا کوئی ان کا حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا۔ شَفِيْعٌ یہ یہود و نصاریٰ کے گمان کا رد ہے جو کہتے تھے کہ ان کا باپ ان کی سفارش کرے گا، کیونکہ وہ کہتے تھے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) ہم اللہ کے فرزند اور اس کے لاڈلے ہیں مشرکین اپنے بتوں کو اللہ کی بارگاہ کا سفارشی بناتے تھے، اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ کفار کے لیے سفارش نہیں ہے۔ اور جن علماء نے کہا: آیت مومنین کے بارے میں ہے انہوں نے کہا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اذن سے شفاعت کریں گے پس حقیقت میں وہی شفیع ہے جس نے اذن دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے۔

وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا:23) اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لیے اس نے اجازت دی ہو۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ:255) کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ یعنی مستقبل میں پرہیزگار بن جائیں۔ یہ ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے۔

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام، طلب گار ہیں (فقط) اس کی رضا کے نہیں

آپ پر ان کے حساب سے کوئی چیز اور نہ آپ کے حساب سے ان پر کوئی چیز ہے پھر بھی اگر آپ دور ہٹائیں انہیں تو ہو جائیں گے آپ بے انصافی کرنے والوں سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ مشرکین نے کہا: سلمان، صہیب، بلال اور خباب جیسے لوگوں کے ساتھ ہم بیٹھنے پر خوش نہیں ہیں آپ ان کو اپنے پاس سے دور کر دیں اور انہوں نے مطالبہ کیا یہ آپ ان کو لکھ کر دیں کہ آپ انہیں ہٹا دیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا تا کہ تحریر لکھ دیں۔ فقراء صحابہ اٹھے اور ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی وجہ سے حضرت سعد نے صحیح حدیث میں اپنے قول سے اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں واقع ہوا جو اللہ نے چاہا کہ واقع ہو۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے اسلام لانے کی امید پر اس عمل کی طرف مائل ہوئے اور آپ نے خیال فرمایا کہ یہ چیز آپ کے صحابہ میں کسی عظمت کو کم نہیں کرے گی اور ان کی قدر کو نہیں گھٹائے گی پس آپ اس عمل کی طرف مائل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی اور فقیر صحابہ کو دور کرنے کا جو ارادہ فرمایا تھا اس سے منع فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی انہیں دور نہیں کیا تھا۔ (صرف ارادہ کیا تھا اور نہی وارد ہوگئی)۔

مسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ آدمی تھے۔ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ انہیں اپنے پاس سے دور ہٹا دیں، یہ ہمارے پاس نہ بیٹھیں۔ فرمایا: ان صحابہ میں ایک میں تھا، حضرت ابن مسعود تھے، ایک ہذیل کا آدمی تھا، بلال تھا اور دو اور آدمی تھے میں ان کا نام نہیں لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خیال واقع ہوا جو اللہ نے چاہا کہ واقع ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ بعض علماء نے فرمایا: یہاں دعا سے مراد جماعت کے ساتھ فرضی نماز کی محافظت کرنا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ذکر اور قرأت قرآن ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دن کے آغاز اور اختتام پر دعا مراد ہو وہ دن کا آغاز دعا سے کرتے ہوں تا کہ انہیں نیکی کی توفیق ملے اور شام بھی دعا کرتے ہوں تا کہ مغفرت طلب کریں۔ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ اس کی طاعت اور اخلاص کا ارادہ کرتے ہیں فقط اللہ کی رضا کے لیے عبادت اور نیک اعمال کرتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں کسی اور کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ارادہ کرتے ہیں جس کی صفت بیان کی گئی ہے کہ اس کی وجہ ہے جیسے فرمایا: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن) باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت و احسان والی ہے۔

اور فرمایا: وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد:22) اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرتے رہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔

آیت میں غداۃ اور عشی (صبح و شام) کا خاص ذکر فرمایا، کیونکہ غالب طور پر لوگ ان اوقات میں مشغول ہوتے ہیں اور

جو مشغولیت کے وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو وہ فراغت کے وقت میں بہت زیادہ عمل کرنے والا ہوگا، رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ان کے ساتھ رہتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ (الکہف: 28) آپ نہیں اٹھتے تھے حتیٰ کہ وہ پہلے اٹھتے تھے یہی مفہوم مکمل اور واضح طور پر ابن ماجہ نے سنن میں خباب سے اسی آیت کے تحت ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری آئے اور رسول اللہ ﷺ کو صہیب، بلال اور عمار اور خباب کے ساتھ پایا آپ کمزور اور غریب مومنین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جب انہوں نے ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے اردگرد دیکھا تو انہوں نے انہیں حقیر سمجھا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور تنہائی میں کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے ایک ایسی مجلس قائم کریں کہ اس سے عربوں پر ہماری فضیلت ظاہر ہو، کیونکہ عرب کے وفود آپ کے پاس آتے ہیں ہم شرم محسوس کرتے ہیں کہ ان غلاموں کے ساتھ عرب ہمیں دیکھیں جب ہم آپ کے پاس آئیں تو انہیں اپنے پاس سے اٹھا دیں اور جب ہم فارغ ہو جائیں تو پھر اگر آپ کی رضی ہو تو ان کے ساتھ بیٹھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے'' انہوں نے مزید کہا کہ آپ ہمیں تحریر بھی لکھ دیں آپ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا تا کہ تحریر لکھ دیں۔ ہم ایک کونہ میں بیٹھے تھے اسی وقت جبریل امین اترے اور کہا: وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (1)

پھر اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کا ذکر کیا فرمایا: وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ پھر فرمایا: وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ فرمایا ہم آپ ﷺ کے قریب ہوئے حتیٰ کہ ہم نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں پر رکھے، رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ بیٹھے تھے جب آپ اٹھنا چاہتے تو اٹھ جاتے اور ہمیں چھوڑ جاتے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف: 28) یعنی آپ ان سرداروں سے مجلس نہ کریں فرمایا: وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف: 28) یعنی عیینہ اور اقرع کے دلوں کو ہم نے غافل کر دیا آپ ان کی پیروی نہ کریں۔ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (الکہف) فرطاً کا معنی ھلاکاً ہے یعنی عیینہ اور اقرع کا امر ہلاک ہونے والا ہے پھر ان کے لیے دو آدمیوں کی مثال دی اور دنیوی زندگی کی مثال دی۔ حضرت خباب نے کہا: پھر ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھتے تھے پھر جب وہ وقت آ جاتا جس میں آپ اٹھتے تھے تو ہم خود اٹھ جاتے تھے اور آپ کو چھوڑ جاتے تھے تا کہ آپ اٹھ جائیں۔ اس حدیث کو احمد بن محمد بن یحییٰ بن سعید قطان سے روایت ہے انہوں نے کہا ہمیں عمرو بن محمد عنقزی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسباط نے بتایا انہوں نے سدی سے روایت کیا انہوں نے ابوسعید ازدی سے روایت کیا یہ ازد قبیلہ کے قاری تھے انہوں نے ابوالکنود سے انہوں نے حضرت خباب سے روایت

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مجالسۃ الفقراء، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اس حدیث کو حضرت سعد سے بھی روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیت ہم چھ آدمیوں کے بارے نازل ہوئی ہیں، ابن مسعود، صہیب، عمار، مقداد اور بلال۔ فرمایا: قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ہم خوش نہیں ہوں گے کہ ہم ان کے تابع ہوں آپ انہیں دور کر دیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے دل میں خیال آیا جو اللہ نے چاہا کہ خیال آئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ...... الخ (1)، الغدوۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ مزید بیان سورۂ کہف میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ان کی جزا اور ان کے رزق کی کفایت آپ پر نہیں ہے۔ ان کی جزا اور ان کے رزق اللہ کے ذمہ ہیں اور آپ کی جزا اور آپ کا رزق بھی اللہ پر ہے کسی اور پر نہیں۔ پہلا من تبعضیہ ہے اور دوسرا زائدہ تاکید کے لیے ہے اسی طرح وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ جب معاملہ اس طرح ہے تو آپ ان فاقہ مستوں کی طرف متوجہ ہوں اور ان کے ساتھ مجلس کریں اور انہیں دور نہ کریں، تاکہ آپ اس کے حق کی رعایت کریں جو دین میں ان کی مثل نہیں ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ظلم کا ارتکاب کریں گے۔ پناہ بخدا! کہ ایسا فعل آپ ﷺ سے صادر ہو یہ تو محض احکام الٰہی کا بیان ہے تاکہ آپ ﷺ کے علاوہ اہل اسلام میں سے کسی سے ایسی چیز صادر نہ ہو۔ اس کی مثل یہ ہے لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ شرک نہیں کریں گے اور آپ کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔

فَتَطْرُدَهُمْ نفی کا جواب ہے۔ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

نہی کے جواب میں فا کے ساتھ نصب دی گئی ہے معنی یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو دور نہ کریں جو اپنے رب کو پکارتے ہیں ورنہ آپ بے انصافی کرنے والوں سے ہو جائیں گے آپ کے حساب سے ان پر کچھ نہیں ہے کہ آپ انہیں دور کریں یہ تقدیم و تاخیر پر ہے۔ ظلم اس کا اصل معنی کسی چیز کو اس کے مقام پر نہ رکھنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ اس آیت اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی کو جاہ و حشمت اور اس کے لباس کی وجہ سے عظیم نہیں سمجھنا چاہیے اور اس کے گمنام ہونے اور لباس پھٹے پرانے ہونے کی وجہ سے حقیر نہیں جاننا چاہیے۔

**وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝**

''اور اسی طرح ہم نے آزمائش میں ڈال دیا بعض کو بعض سے تاکہ کہیں (مال و زر کا فرنادار مسلمانوں کو دیکھ کر) کیا یہ ہیں احسان کیا ہے اللہ نے جن پر ہم میں سے، کیا نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ اپنے شکر گزار (بندوں کو)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ یعنی جس طرح ہم نے آپ سے پہلے لوگوں کو آزمائش میں ڈالا اسی طرح ان کو آزمائش میں ڈالا۔ الفتنۃ کا معنی آزمانا ہے یعنی ہم نے ان کے ساتھ آزمانے والوں کے معاملہ کی طرح معاملہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مجالسۃ الفقراء، حدیث نمبر 4117، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا۔ لِّيَقُوْلُوْٓا لام کی وجہ سے نصب دی گئی ہے یعنی اشراف و اغنیاء کہیں۔ اَهٰٓؤُلَآءِ یعنی ضعفاء اور فقراء۔ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا نحاس نے کہا: یہ مشکل سے ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کیسے آزمائے گئے تا کہ وہ یہ آیت کہیں، کیونکہ اگر یہ انکار ہوتو ان کی طرف سے کفر ہے۔ اس کے دو جواب ہیں: (۱) معنی یہ ہے کہ اغنیاء کو فقراء کے ساتھ آزمائش میں ڈالا گیا کہ ان کا مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں برابر ہے تا کہ وہ استفہام کے طور پر کہیں نہ کہ انکار کے طور پر اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ جب انہیں اس کے ساتھ آزمایا گیا تو ان کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے یہ انکار کے طور پر کہا۔ یہ اس قول کی مثل ہوگا فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) پس (دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھر والوں نے تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝ یعنی جن پر دولت ایمان کا احسان فرمایا، ان روسا پر نہیں جن کے متعلق اللہ کفر کو جانتا تھا۔ یہ استفہام تقریر ہے اور یہ ان کے قول اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ میں بَيْنِنَا کا جواب ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا اللہ تعالیٰ جانتا نہیں ہے جو اسلام کا شکر ادا کرے گا جب اسے اس کی طرف ہدایت ملے گی۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝

"اور جب آئیں آپ کی خدمت میں وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر تو ان سے فرمایئے: سلام ہو تم پر لازم کر لیا تمہارے رب نے (محض اپنے کرم سے) اپنے آپ پر رحمت فرمانا تو جو کوئی کر بیٹھے تم میں سے برائی نادانی سے پھر توبہ کر لے اس کے بعد اور سنوار لے (اپنے آپ کو) تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، السلام اور السلا مقدونوں کا ایک معنی ہے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے دین اور نفسوں میں سلامتی بخشے۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جن کو دور کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہی کی گئی تھی پھر جب آپ انہیں دیکھتے تو پہلے انہیں سلام کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب تعریفیں اس ذات کے لیے جس نے میری امت میں ایسے لوگ بنائے جنہیں پہلے سلام کرنے کا مجھے حکم دیا گیا" (1)۔ اس بنا پر سلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی جہت سے تھا، یعنی ہماری طرف سے انہیں سلام پہنچا دے۔ دونوں صورتوں میں اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت و مرتبہ کی دلیل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائذ بن عمرو سے مروی ہے کہ ابو سفیان آیا سلیمان، صہیب، بلال اور دوسرے افراد کے پاس تو انہوں نے کہا: اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن کی گردن سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ راوی فرماتے ہیں حضرت ابو بکر نے کہا: کیا تم یہ قریش کے شیخ اور

1۔ زاد المسیر لابن جوزی

سردار کو کہتے ہو؟ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہیں سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! شاید تو نے انہیں ناراض کیا ہے، اگر تو انہیں ناراض کرے گا تو تو اپنے رب کو ناراض کرے گا"۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ ان فقراء صحابہ کے پاس آئے اور کہا: اے بھائیو! میں نے تمہیں ناراض کیا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں، اے بھائی، اللہ تیری مغفرت فرمائے۔ یہ ان لوگوں کے بلند مرتبہ اور حرمت کی دلیل ہے اس سے نیک لوگوں کا احترام اور جو انہیں اذیت دیتے ہیں اور انہیں ناراض کرتے ہیں ان سے احتساب کا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، کیونکہ اس پر اللہ کا غضب ہوتا ہے یعنی جو اس کے اولیاء میں سے کسی کو اذیت دیتا ہے اس پر اس کا عقاب نازل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ فضیل بن عیاض نے کہا: مسلمانوں کا ایک گروہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ہم سے گناہ ہوئے ہیں آپ ہمارے لیے استغفار فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ان سے اعراض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت انس بن مالک سے اس کی مثل مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اپنے سچے وعدہ اور اپنی سچی خبر کے ساتھ رحمت کرنا واجب فرمایا۔ بندوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جس کو وہ جانتے تھے کہ اس نے اس چیز کو لکھا ہے تو اس نے اس کو اپنے اوپر واجب کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے لوح محفوظ میں اس کو لکھا۔

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ یعنی جس نے بغیر ارادہ کے کوئی خطا کی۔ مجاہد نے کہا: وہ حرام حلال کو نہیں جانتا تھا اور اپنی جہالت کی وجہ سے وہ کام کر دیا جس نے کوئی برا کام کیا تو وہ اس سے جاہل ہے۔ یہ مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے بعض علماء نے فرمایا: دنیا کو آخرت پر ترجیح دی وہ جاہل ہے۔

فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ابن عامر اور عاصم نے ان کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح انه من عمل میں بھی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع نے انه من عمل میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں میں کسرہ پڑھا ہے۔ جنہوں نے کسرہ پڑھا ہے انہوں نے استئناف کے طور پر پڑھا ہے اور جملہ رحمت کے لیے تفسیر کرنے والا ہے اور ان جب جملوں پر داخل ہوتا ہے تو اسے کسرہ دیا جاتا ہے اور فا کے بعد کا حکم ابتدا اور استئناف ہے اسی وجہ سے کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور جنہوں نے دونوں جگہ فتحہ پڑھا ہے پہلا محل نصب میں ہے، کیونکہ وہ الرحمة سے بدل ہے کسی شے کا بدل اس شے سے ہوتا ہے اور وہ وہی ہے پس اس میں کتب نے عمل کیا ہے گویا فرمایا: کتب ربکم علی نفسه انه من عمل اور رہا فانه غفور فتحہ کے ساتھ تو اس میں دو وجہیں ہیں۔

(۱) یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہو اور اس کی خبر مضمر ہو گویا فرمایا: فله انه غفور رحیم۔ کیونکہ فا کے جو بعد ہوتا ہے وہ مبتدا ہوتا ہے یعنی اس کے لیے اللہ کی مغفرت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مبتدا مضمر ہو اور ان اور اس کا معمول خبر ہو تقدیر عبارت اس طرح ہو فامرہ غفران اللہ له۔ یہ سیبویہ کا مختار ہے۔ پہلی صورت کو انہوں نے جائز قرار نہیں دیا اور ابو حاتم نے اسے جائز قرار دیا۔ بعض نے فرمایا: کتب نے اس میں عمل کیا ہے یعنی کتب ربکم انه غفور رحیم۔ علی بن صالح اور ابن ہرمز سے استئناف کی بنا پر پہلے میں کسرہ مروی ہے اور دوسرے میں فتحہ مروی ہے یا تو مبتدا ہے یا مبتدا کی خبر ہے یا کتب کا معمول ہے، اور

جنہوں نے پہلے کو فتحہ دیا ہے وہ نافع ہے۔ اس نے الرحمة سے بدل بنایا ہے اور دوسرے سے نئی کلام سمجھی ہے، کیونکہ وہ فا کے بعد ہے، یہ قرأت واضح ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

''اور اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ ظاہر ہو جائے راستہ گنہگاروں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ تفصیل سے مراد ایسا بیان ہے جس سے معانی ظاہر ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اس سورت میں ایسے دلائل اور مشرکین کے خلاف حجت کو بیان کیا اسی طرح ہم تمہارے لیے آیات بیان کریں گے جب تمہیں دین کے معاملہ میں ضرورت پڑے گی ہم تمہارے لیے ہر حق کے بارے میں اپنے دلائل اور حجتیں پیش کریں گے اہل باطل جس کا انکار کریں گے۔ قتبی نے کہا: نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ مطلب ہے ہم ایک چیز کے بعد دوسری چیز لائیں گے ہم ایک دفعہ سارا قرآن نازل نہیں کریں گے۔ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ کہا جاتا ہے: یہ لام فعل کے متعلق ہے تو پھر وہ فعل کہاں ہے جس کے یہ متعلق ہے؟ کوفیوں نے کہا: وہ مقدر ہے یعنی وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لنبين لكم وَ لِتَسْتَبِيْنَ نحاس نے کہا: اس حذف کی کوئی ضرورت نہیں۔ تقدیر یہ ہے نُفَصِّلُ آلآیات ولتستبين سبيل المجرمين فَصَّلْنٰهَا بعض علماء نے فرمایا: واو کا داخل ہونا معنی پر عطف کے لیے ہے یعنی تاکہ حق ظاہر ہو جائے اور واضح ہو جائے یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ سَبِيْلُ کے لام پر رفع اور نصب پڑھے گئے ہیں۔ تا کی قرأت کی صورت میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تاکہ آپ مجرموں کا راستہ واضح کر دیں۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو واضح کر چکے تھے؟ زجاج کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے، معنی یہ ہے کہ تم مجرموں کا راستہ ظاہر کرو، مگر کہا جائے کہ سبیل المومنین ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ یہ اس طرح ہے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) اس کا مطلب ہے وتقيكم البرد پھر اس کو حذف کیا گیا، اسی طرح یہ معنی بھی ہوگا ولِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ لیکن پھر اس کو حذف کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کہا جاتا ہے: استبان الشئ واستبنته جب مجرموں کا راستہ ظاہر ہوا تو مومنین کا راستہ بھی ظاہر ہوا۔ السبیل کا لفظ مذکر اور مونث استعمال ہوتا ہے۔ تمیم مذکر اور اہل حجاز مونث استعمال کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ (الاعراف: 146) میں مذکر اور لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (آل عمران: 99) میں مونث استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ولتستبين کو یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے تا کی صورت میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا اور مراد آپ کی امت ہوگی۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ فرمائیے: مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں پوجوں انہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا۔ آپ فرمائیے:

میں نہیں پیروی کرتا تمہاری خواہشوں کی ایسا کروں تو گمراہ ہو گیا میں اور نہ رہا میں ہدایت پانے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بعض علماء نے فرمایا: تَدْعُوْنَ بمعنی تعبدون ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عبادت کی جہت سے تم اپنے اہم امور میں جن کو پکارتے ہو، اس سے مراد بت ہیں۔

قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ تم ان اشیاء کی عبادت کا مطالبہ کرتے ہو اور جن کو تم دور کرنے کا ارادہ کرتے ہو میں تمہاری ان خواہشات کی اتباع نہیں کرتا۔ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا یعنی اگر میں تمہاری خواہشات کی اتباع کروں تو میں گمراہ ہو گیا۔ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝ میں راہ راست پر نہیں ہوں۔ ضللت لام کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابو عمرو بن علا نے کہا: لام کے کسرہ کے ساتھ تمیم کی لغت ہے، یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی یہی قرأت ہے۔ پہلی قرأت اصح اور افصح ہے، کیونکہ وہ اہل حجاز کی لغت ہے اور یہی جمہور کی قرأت ہے۔ جوہری نے کہا: الضلال اور الضلالۃ، الرشاد (ہدایت) کی ضد ہیں۔ وقد ضَلَلْتُ أَضِلُّ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ (سبا: 50) یہ نجدیوں کی لغت ہے یہ فصیح ہے۔ اہل العالیہ کہتے ہیں: ضللتِ کسرہ کے ساتھ۔ أَضَلُّ

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝

''آپ فرمایئے: بے شک میں قائم ہوں ایک روشن دلیل پر اپنے رب کی طرف سے اور جھٹلا دیا تم نے اسے نہیں ہے میرے پاس جس کی تم جلدی مچا رہے ہو، نہیں ہے حکم (کسی کا) سوائے اللہ کے وہی بتاتا ہے حق اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ یعنی میں دلالت، یقین، حجت اور برہان پر ہوں۔ خواہش پر نہیں ہوں اسی سے البینۃ (گواہی) ہے جس سے حق واضح اور ظاہر ہوتا ہے۔

وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ تم نے اس بینۃ (دلیل) کو جھٹلایا، کیونکہ یہ بیان کے معنی میں ہے اس لیے ضمیر مذکر ذکر کی جیسے فرمایا: وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ (النساء: 8) یہاں بھی ضمیر مذکر ذکر کر دی جب کہ ظاہر مرجع مونث ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت اسی آیت کے تحت کر دی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الرب ہے یعنی تم نے میرے رب کو جھٹلایا، کیونکہ اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: عذاب کی طرف راجع ہے۔ بعض نے کہا: قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کے معنی میں مصعب بن عبداللہ بن زبیر نے اشعار کہے ہیں وہ ایک عمدہ اور نیک شاعر تھے:

أ أ قعُدُ بعد ما رجعت عظامی　　وكان الموتُ أقربَ ما يليني

أجادلُ كلَّ مُعترِضٍ خَصِيمٍ　　وأجعل دِينَه غرَضًا لِدِينِي

فأترك ما علمتُ لرأى غيرى　　وليس الرأىُ كالعلم اليقين

وما أنا والخصومة وهي شَيءٌ يُصَرَّفُ في الشمال و في اليمين
و قد سُنَّت لنا سننٌ قِوام يَلُحْنَ بكلِّ فَجٍّ أو وَجِين
وكان الحقُّ ليس به خفاءٌ أغَرَّ كغُرّة الفَلَق المبينِ
وما عِوضٌ لنا مِنهاجُ جَهْمٍ بمنهاج أبنِ آمنةَ الأمين
فأمّا ما علمتُ فقد كَفَانِي وأمّا ما جهلتُ فجنِّبونِي

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِهٖ اس سے مراد عذاب ہے۔ وہ تکذیب میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے وہ استہزا نزول عذاب کا جلدی مطالبہ کرتے تھے جیسے انہوں نے کہا: اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا (الاسراء:92) یا آپ گرادیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔
اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال:32) اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے۔
بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب میرے پاس وہ نشانیاں نہیں جن کا مطالبہ اور تجویز تم کرتے ہو۔ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ عذاب کی تاخیر اور تعجیل کا فیصلہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ بعض نے فرمایا: حق و باطل کے درمیان فاصل حکم اللہ کے لیے ہے۔ يَقُصُّ الۡحَقَّ یعنی وہ سچے واقعات بیان کرتا ہے۔ جو علماء قرآن میں مجاز سے منع کرتے ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ نافع، ابن کثیر، عاصم، مجاہد، اعرج اور حضرت ابن عباس کی قرأت ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ (یوسف:3) ہم بیان کرتے ہیں ایک بہترین قصہ۔ باقی قراء يَقۡضِ الۡحَقَّ ضاد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ حضرت علی، ابوعبدالرحمن، سلمی اور سعید بن مسیب نے اسی طرح پڑھا ہے۔ مصحف میں بغیر یا کے لکھا گیا ہے اس پر وقف مناسب نہیں یہ قضا سے ہے اس پر دلیل بعد والی کلام وَهُوَ خَيۡرُ الۡفٰصِلِيۡنَ ۝ ہے۔ فیصلہ قضا میں ہوتا ہے نہ کہ قصص میں اس کی تائید اس لیے پہلے والی کلام اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ بھی کرتی ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت بھی اس کو تقویت دیتی ہے۔ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الۡحَقَّ۔ با کا دخول قضا کے معنی کو مؤکد کرتا ہے النحاس نے کہا: یہ لازم نہیں، کیونکہ یقضی کا معنی یاتی اور یضع بھی ہوتا ہے معنی ہو سکتا ہے وہ حق لاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ معنی ہو حق فیصلہ فرماتا ہے۔ مکی نے کہا: ضاد کی قرأت مجھے زیادہ پسند ہے کیونکہ حرمین اور عاصم کا اس پر اتفاق ہے۔ کیونکہ اگر یہ قصص سے ہوتا تو اس میں با لازم ہوتی جیسا کہ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حجت لازم نہیں کیونکہ یہ باء اکثر حذف بھی کی جاتی ہے۔

قُلۡ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِهٖ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ بَيۡنِیۡ وَبَيۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِيۡنَ ۝

''آپ فرمائیے: اگر میرے پاس ہوتی وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو (کبھی کا) فیصلہ ہو گیا ہوتا اس بات کا میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں اسے تم پر نازل کر دیتا حتیٰ کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا۔ الاستعمال کا مطلب ہے وقت سے پہلے کسی چیز کو جلدی طلب کرنا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکوں کو اور ان کی سزا کے وقت کو خوب جانتا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین والعاقبۃ للمتقین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۵۹﴾

''اوراسی کے پاس ہے ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا انہیں سوائے اس کے، اور جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور سمندر میں ہے۔ اور نہیں گرتا کوئی پتا، مگر وہ جانتا ہے اس کو، اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں''۔

اس میں تین مسائل ہیں

**مسئلہ نمبر 1**۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے ساتھ بارہ ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفاتح الغیب خمس لا یعلمها إلا الله لا یعلم ما تغیض الأرحام الا الله ولا یعلم ما فی غد الا الله ولا یعلم متی یأتی المطر إلا الله ولا تدری نفس بأی أرض تموت إلا الله ولا یعلم متی تقوم الساعة إلا الله۔

''غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جانتا جو کچھ رحمیں چھپائے ہوئے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا اسے جو کچھ کل ہونے والا ہے سوائے اللہ کے، اور کوئی نہیں جانتا بارش کب ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نفس نہیں جانتا کون سی زمین میں اسے موت آئے گی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا قیامت کب قائم ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

اور صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت موجود ہے انہوں نے فرمایا: جس نے گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے کل میں ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل: 65) ''آپ فرمائیے: (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

**مَفَاتِحُ** مفتح کی جمع ہے، اس میں لغت فصیحہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مفتاح کی جمع ہے اور اس کی جمع مفاتیح آتی ہے اور یہ ابن سمیقع کی قرأت ہے۔ مفاتیح اور مفتح ہر اس شئ سے عبارت ہے جو کسی بند شئ کو کھول دیتی ہے چاہے وہ بند محسوس ہو جیسا کہ گھر کا تالا یا معقول ہو جیسا کہ نظر۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم بستی نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من الناس مفاتیح للخیر مغالیق للشر وان من الناس مفاتیح للشر مغالیق للخیر فطوبی لمن جعل اللہ مفاتیح الخیر علی یدیہ وویل لمن جعل اللہ مفاتیح الشر علی یدیہ۔ (1)

''بے شک لوگوں میں بعض خیر اور بھلائی کی چابیاں (اور) شر اور برائی کے تالے ہیں۔ اور بلاشبہ لوگوں میں سے بعض شر کی چابیاں اور خیر کے تالے ہیں۔ پس مبارک ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے خیر کی چابیاں عطا فرمائیں اور ہلاکت و بربادی ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے شر کی چابیاں رکھیں''۔

اور آیت میں یہ لفظ استعارۃً غیوب تک پہنچنے کے معنی میں ہے جس طرح کہ ظاہر میں چابی کے ذریعے کسی انسان کی غیب چیز تک پہنچا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے: یہ لوگوں کے اس قول سے ماخوذ ہے افتح علی کذا یعنی مجھے عطا کیجئے یا مجھے وہ سکھا دیجئے جس کے ذریعے میں اس تک پہنچ جاؤں۔ پس اللہ تعالیٰ کے پاس ہی علم غیب ہے اور اسی کے دست قدرت میں اس تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا سوائے اس کے، پس وہ ان پر جسے مطلع کرنا چاہے اسے مطلع کر دے، اور جس پر انہیں چھپانا چاہے اس سے چھپالے۔ اور اس کی طرف سے یہ عطا اور فیضان نہیں ہوتا مگر رسولوں پر (علیہم الصلوات والتسلیمات)۔

اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد ہیں: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران: 179) ''اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لیے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے''۔

اور مزید فرمایا: عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ الآیۃ (جن) ''(اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفاتح سے مراد خزائن رزق ہیں، یہ سدی اور حسن رحمہما اللہ سے منقول ہے اور مقاتل اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس سے مراد زمین کے خزانے ہیں۔ اور یہ مجاز ہے۔ اور ان سے اس (ھی) کو تعبیر کیا گیا ہے جس کے ذریعے ان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کے علاوہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں حدیث کے معنی متضمن ہیں یعنی اس کے پاس عمروں کا علم اور ان کے گزرنے کے وقت کا علم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عمروں کا انجام اور اعمال کے خواتم کا علم ہے۔ علاوہ ازیں بھی کئی اقوال ہیں۔ لیکن مختار پہلا قول ہی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کی کئی آیات میں علم غیب کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے سوائے اپنے بندوں میں سے ان کے جنہیں اس نے چن لیا۔ لہٰذا جس کسی نے کہا: بلاشبہ وہ کل بارش برسائے گا اور اس کا یقین کر لیا تو وہ کافر ہے، اس نے اس کے بارے ان علامات اور نشانیوں کے سبب خبر دی جن کے سبب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب ابواب فی فضائل اصحاب رسول اللہ، باب من کان مفتاحا للخیر، حدیث 232-233، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس نے یہ دعویٰ کیا یا نہیں۔ اسی طرح جس نے کہا: بلاشبہ وہ اسے جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے تو وہ کافر ہے (1)۔ اور اگر اس نے یقین نہ کیا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ عادۃً نوء (ایک ستارہ کا مغرب میں غروب ہونا اور اس کے بالمقابل اسی ساعت میں مشرق میں ایک ستارہ کا طلوع ہونا) کے سبب بارش برساتا ہے، اور وہ عادۃً بارش کا سبب ہے اور یہ کہ وہ بارش کا سبب اس بنا پر ہے کہ اس نے اس کا اندازہ لگا لیا ہے اور وہ پہلے اس کے علم میں آ چکا ہے تو وہ کافر نہیں، مگر اس کے لیے مستحب اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ وہ اس کے بارے کلام نہ کرے، کیونکہ اس میں اہل کفر کے کلام کے ساتھ مشابہت ہے اور اس میں اس کی لطیف حکمت سے جہالت ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے بارش نازل فرما دیتا ہے، کبھی ستارے کے غروب وطلوع کے سبب اور کبھی اس کے بغیر۔ اللہ تعالیٰ نے (حدیث قدسی میں) ارشاد فرمایا ہے: أصبح من عبادی مؤمن بی و کافر (2) بالکوکب ''میرے بندوں میں سے (بعض نے) میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے اور ستارے کے ساتھ کفر کرتے ہوئے صبح کی) اس کا بیان سورہ واقعہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اور اسی طرح طبیب کا قول بھی ہے: جب عورت کے دائیں پستان کا سرا سیاہ ہو جائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر بایاں پستان اس طرح ہو جائے تو پھر بچی ہوتی ہے اور اگر عورت دائیں پہلو کو بوجھل پا رہی ہو تو بچی ہوتی ہے۔ اور انہوں نے خلقت کے بارے میں یہ دعویٰ عادۃً کیا ہے نہ کہ واجباً، لہٰذا یہ نہ کفر ہے اور نہ ہی فسق ہے۔ اور وہ آدمی جس نے مستقبل میں کسب اور کمائی کا دعویٰ کیا تو وہ کافر ہے یا اس نے مجمل یا مفصل واقعات ہونے کے بارے خبر دی اس سے پہلے کہ وہ وقوع پذیر ہوں تو اس کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں۔ اور جس نے سورج اور چاند گرہن کی خبر دی تو ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے تادیباً کچھ سزا دی جائے گی لیکن اسے قید نہیں کیا جائے گا۔ رہی اس کی عدم تکفیر تو اس کے بارے ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ یہ ایسا امر ہے جسے حساب اور تقدیر منازل کے ساتھ جانا جا سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (یٰسین: 39) ''اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لیے منزلیں''۔

اور جہاں تک ان کے لیے تادیبی سزا کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو شک میں ڈال دیتے ہیں، کیونکہ وہ تو اس کے اور اس کے غیر کے درمیان فرق کرنا نہیں جانتے۔ پس وہ اپنے عقائد کے بارے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے یقینی قواعد کو چھوڑ دیتے ہیں، پس تم انہیں ادب سکھاؤ تاکہ جب وہ اسے پہچان لیں تو وہ مخفی اور پوشیدہ رکھیں اور وہ اس کے بارے اعلان نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی باب سے وہ بھی ہے جو صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من أتی عرافا (فسألہ عن شیء) لم تقبل لہ صلاۃ اربعین لیلۃ ''جو کسی نجومی اور کاہن کے پاس آیا اور کسی شئ کے بارے اس سے پوچھا تو اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جائے گی''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 730　2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء باب قول اللہ تعالیٰ وتجعلون رزقکم الخ، حدیث نمبر 980

اور عراف سے مراد اندازہ لگانے والا اور وہ نجومی ہے جو علم غیب کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ عرافہ سے ماخوذ ہے اور اسے جاننے والے کو عراف کہا جاتا ہے، اور وہ وہ ہے جو ایسے اسباب اور مقدمات کے ساتھ امور پر استدلال کرتا ہے جن کی معرفت اور پہچان کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ اور اس فن کے بعض لوگ اس بارے میں کہا پرندہ اڑا کر فال پکڑنے، جادو منتر کے طور پر کنکریاں مارنے اور ستاروں کے ساتھ قوت اور مدد حاصل کرتے ہیں اور اس میں بھی اسباب عادیہ ہیں۔ اور یہی فن عیافہ (یا کے ساتھ) ہے اور ان تمام پر کہانت کا اسم بولا جاتا ہے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے اور کہانت سے مراد علم غیب کا دعویٰ کرنا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کتاب ''الکافی'' میں کہا ہے: وہ کمائی جس کے حرام ہونے پر اجماع ہے وہ سود، فاحشہ عورتوں کی اجرت، حرام کی کمائی، رشوت، اور نوحہ کرنے اور گانا گانے پر اجرت لینا، کہانت، غیب کا دعویٰ کرنے اور آسمان کی خبریں دینے پر اجرت لینا، بانسری بجانے، لہو ولعب اور ہر باطل کام کی اجرت ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ان زمانوں میں نجومیوں اور کاہنوں کے آنے کی وجہ سے احوال تبدیل ہو چکے ہیں بالخصوص دیار مصر میں، ان کے رؤساء، اتباع اور امراء میں نجومیوں سے ملنا عام ہو چکا ہے، بلکہ بہت سے فقہ اور دین کی طرف منسوب لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں وہ ان کاہنوں اور نجومیوں کے پاس آتے ہیں پس وہ ان پر سراسر فساد کی باتیں رکھتے ہیں اور وہ ان سے مال و دولت نکال لیتے ہیں، پس وہ ان کی باتوں سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے دین کے بارے میں فساد اور گمراہی میں واقع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب گناہ کبیرہ میں سے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جاتی''۔ تو کیا حال ہوگا ان کا جنہوں نے ان کی باتوں پر اعتماد کیا اور ان پر اپنا مال خرچ کیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انهم ليسوا بشیء ''بلاشبہ وہ کوئی شئی نہیں ہیں''۔ تو لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک بسا اوقات وہ ہمیں ایسی شئی کے بارے بتاتے ہیں جو بالکل حق اور سچ ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تلك الكلمة من الحق يخطفها الجنی فيقرها في اذن وليه (قر الدجاجة) فيخلطون معها مائة كذبة ''وہ کلمہ جو حق ہوتا ہے اسے جن اچک کر لے آتے ہیں اور چپکے سے اپنے ولی (یعنی جس کے وہ تابع ہو) کے کان میں ڈال دیتے ہیں (جیسے مرغی اپنی آواز منقطع کر لیتی ہے) اور وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ اور ملا لیتے ہیں''۔

حمیدی نے کہا ہے: یحییٰ بن عروہ کی اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس روایت کے سوا صحیح میں کوئی روایت نہیں ہے۔ اور اسے امام بخاری نے بھی ابو الاسود محمد بن عبد الرحمن کی حدیث سے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الملائكة تنزل في العنان وهو السحاب فتذكر الامر قضى في السماء فتسترق الشياطين السمع فتسمعه فتوحيه الى الكهان فيكذبون معها مائة كذبة من عند انفسهم۔

''بے شک فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہ اس امر کا ذکر کرتے ہیں جس کا فیصلہ آسمان میں ہو چکا ہوتا ہے پس شیاطین سننے کے لیے چھپے رہتے ہیں اور اسے سنتے رہتے ہیں اور پھر اسے کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ اور بولتے ہیں''۔ اس کا بیان سورۂ سبا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اللہ کریم نے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر فرمایا ہے، کیونکہ یہ دونوں انسان کے جوار میں اعظم المخلوقات ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شی کو جانتا ہے جو خشکی اور سمندر میں ہلاک ہوتی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: وہ خشکی میں نباتات، دانوں اور گٹھلیوں میں ہر شی کو اور سمندر میں رہنے والے جانوروں اور اس میں ان کے رزق میں سے ہر شی کو جانتا ہے۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا یزید بن ہارون نے محمد بن اسحاق سے، انہوں نے نافع سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما من زرع على الأرض ولا ثمار على الأشجار ولا حبة في ظلمات الأرض إلا عليها مكتوب بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ رزق فلان بن فلان ''زمین پر کوئی کھیتی نہیں اور درختوں پر کوئی پھل نہیں اور زمین میں چھپا ہوا کوئی دانہ نہیں مگر اس پر یہ لکھا ہوا ہے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے)''(1)۔

اور یہی اللہ تعالیٰ کی محکم کتاب میں ارشاد ہے: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ

نقاش نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ ورقہ سے مراد اولاد بنی آدم میں سے وہ بچے لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت گر جاتے ہیں اور حبہ سے مراد وہ لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت نہیں گرتے اور رطب سے زندہ مراد لیے جاتے ہیں اور یابس سے مراد مردہ لیے جاتے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول طریقہ رموز واشارات پر جاری ہے، اور جعفر بن محمد سے صحیح (مروی) نہیں ہے لہٰذا اس کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ کا معنی ہے کہ درخت کا کوئی پتہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب گرے گا، کہاں گرے گا اور کتنے وقت تک ہوا میں اڑتا رہے گا اور کوئی دانہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب آئے گا، کتنی مقدار میں وہ اگیں گے اور انہیں کون کھائے گا۔ اور فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ سے مراد زمین کا اندرونی اور باطنی حصہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہی حدیث کے موافق ہے اور یہی آیت کا مقتضیٰ ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ۔

اور فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں سے نیچے ہے۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ یہ دونوں لفظ پر عطف کی بنا پر مجرور ہیں۔ ابن السمیقع اور حسن وغیرہما نے ان دونوں کو من ورقة کے محل پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں من تاکید کے لیے ہوگا۔ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ کتاب مبین سے

1۔ الوسیط للواحدی، جلد 2، صفحہ 281

مراد لوح محفوظ ہے، کیونکہ ملائکہ وہیں سے (نصائح) اخذ کرتے ہیں، نہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی نسیان کی وجہ سے اسے لکھ رکھا ہے جو اسے لاحق ہوسکتا ہے، اس کی ذات تو اس سے منزہ اور برتر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس نے اسے تعظیم امر کے لیے لکھا ہے حالانکہ وہ اسے جانتا ہے، یعنی تم جان لو کہ یہ وہ ہے جس میں نہ ثواب لکھا ہوا ہے اور نہ ہی عقاب، تو پھر اس کے بارے کیا کیفیت ہوگی جس میں ثواب اور عقاب ہوگا؟۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو، پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن میں تاکہ پوری کردی جائے (تمہاری عمر کی) معیاد مقرر، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ بتائے گا تمہیں جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ اور وہی ہے جو تمہیں سلا دیتا ہے۔

اور وہ تمہارے ان نفوس کو قبضہ میں لے لیتا ہے جن کے ساتھ تم (چیزوں میں) تمیز کرتے ہو۔ اور وہ فی الحقیقت موت نہیں بلکہ نیند کے سبب تصرف سے ارواح کو قبضہ میں لینا ہے جیسا کہ وہ انہیں موت کے ساتھ قبضہ میں لے لیتا ہے۔ اور التوفی کا معنی استیفاء الشیٔ (کسی شی کو پورا کرنا) ہے۔ اور توفی المیت کہا جاتا ہے (کیونکہ) وہ اپنی عمر کے ایام کی تعداد کو پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ جو سو جاتا ہے گویا اس نے اپنی بیداری کی حرکات کو پورا کر لیا ہوتا ہے اور الوفاۃ کا معنی موت ہے۔ اور أوفیتك المال، وتوفیتہ، واستوفیتہ کہا جاتا ہے جب تو سارے کا سارا مال لے لے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إن بنی الأدرم لیسوا من أحد ولا توفاهم قریش فی العدد

اس میں ولا توفاهم (پورا کرنے) کے معنی میں ہے۔

اور کہا جاتا ہے: حالت نیند میں جب روح بدن سے نکلتی ہے تو اس میں حیات (زندگی) باقی رہتی ہے، اس لیے اس میں حرکت اور سانس لینا وغیرہ موجود رہتا ہے۔ اور جب اس کی عمر کی مقرر میعاد گزر جائے اور اس کی روح نکل جائے تو اس کا سلسلہ حیات منقطع ہو جاتا ہے اور وہ مردہ ہو جاتا ہے پھر نہ وہ حرکت کرتا ہے اور نہ ہی اس کی سانس جاری رہتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: (سونے والے سے) روح خارج ہوتی ہی نہیں بلکہ اس سے ذہن نکل جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: یہ ایک ایسا امر ہے جس کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور یہی صحیح ترین قول ہے، واللہ اعلم۔

ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ پھر وہ تمہیں دن میں (نیند سے) اٹھاتا ہے یعنی بیدار کرتا ہے۔

لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى یعنی تاکہ ہر انسان اس مدت کو پورا کر لے جو اس کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

ابو رجاء اور طلحہ بن مصرف نے ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیَقْضِیَ اَجَلًا مُّسَمًّى پڑھا ہے۔ یعنی جو میعاد اس کے نزدیک مقرر ہے وہ

اسے پورا کر دے۔ اور جَرَحْتُمْ بمعنی کسبتم ہے۔ اور سورۃ المائدہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اور آیت میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر عبارت اس طرح ہے ہوالذی یتوفاکم باللیل ثم یبعثکم بالنھار و یعلم ما جرحتم فیہ اس کی میعاد میں سے جو اہم ترین ہے اسے مقدم کیا اور بعث (دوبارہ اٹھانا) دن کے وقت واقع ہوتا ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ، ای فی المنام پھر وہ تمہیں خواب میں اٹھاتا ہے۔ آیت کا معنی ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کفار کو مہلت دینا ان کے کفر سے غفلت کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس نے ہر شے کی تعداد گن رکھی ہے وہ اسے جانتا ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے، بلکہ اس لیے ہے تاکہ وہ رزق اور حیات میں سے مقرر مقدار پوری کر دے، پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہ انہیں (ان کے اعمال کا بدلہ) اور جزا دے گا۔ اور یہ بعث (دوبارہ اٹھایا جانا) حشر و نشر (کے برحق ہونے پر) دلیل ہے، کیونکہ نشاۃ ثانیہ کا مرتبہ نشاۃ اولیٰ کے بعد ہے اسی طرح بیداری کا مرتبہ نیند کے بعد ہے۔ اس بارے میں کہ جو ذات ان میں سے ایک پر قادر ہے تو وہ دوسرے پر بھی قادر ہے۔

**وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝۶۱ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝۶۲**

''اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آ جائے تم میں سے کسی کی موت تو قبض کر لیتے ہیں اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور وہ کوتاہی نہیں کرتے، پھر لوٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے سنتے ہو اسی کا حکم ہے اور وہ سب سے تیز حساب کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ یعنی وہی عظمت اور رتبہ میں فوقیت رکھتا ہے (اس میں) مکان اور جہت کے اعتبار سے فوقیت مراد نہیں ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً یعنی ملائکہ میں سے نگہبان تم پر بھیجتا ہے۔ ارسال کا حقیقی معنی اطلاق الشیء بما حمل من الرسالۃ ہے (یعنی کسی شی کو اس کے ساتھ چھوڑنا ہے جو وہ پیغام وغیرہ میں سے اٹھائے ہوئے ہو) پس مقصود ملائکہ کو اس حفاظت اور نگہبانی کی ذمہ داری کے ساتھ بھیجنا ہے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ (انفطار) یعنی ملائکہ بندوں کے اعمال کی نگہبانی کرتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور حَفَظَةً حافظ کی جمع ہے، جیسا کہ کتبۃ کاتب کی جمع ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ دو فرشتے رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو فرشتے دن کے وقت ہوتے ہیں، ان میں سے ایک خیر اور نیکی لکھتا ہے اور دوسرا شر اور برائی لکھتا ہے، اور جب انسان چلتا ہے تو ان میں سے ایک اس کے آگے ہو جاتا ہے اور دوسرا اس کے پیچھے، اور جب بیٹھتا ہے تو ان میں سے ایک اس کی دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا بائیں طرف۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ الآیۃ (ق) ''(ان میں سے) ایک دائیں جانب اور (دوسرا) بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے''۔ اور کہا جاتا ہے: ہر انسان کے لیے پانچ فرشتے

ہیں: دو رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو دن کے ساتھ خاص ہیں اور پانچواں رات اور دن میں سے کسی بھی وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

ومن الناس من يعيش شقيا جاهل القلب غافل اليقظة

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو شقاوت، جہالت قلب اور بیداری میں غافل رہتے ہوئے زندگی گزارتا ہے''۔

فإذا كان ذاوفاء ورأى حذر الموت واتقى الحفظة

''اور جب وہ صاحب وفا اور صاحب رائے ہو تو وہ موت سے ڈرتا ہے اور نگہبان فرشتوں سے بچتا ہے''۔

إنما الناس راحل و مقيم فالذي بان للمقيم عظة

''بلاشبہ لوگ کوچ کر رہے ہیں اور مقیم ہیں پس جو ظاہر ہے وہ مقیم کے لیے نصیحت ہے''

قولہ تعالیٰ: **حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ** مراد موت کے اسباب کا آنا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ **تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا** جماعت کے مؤنث ہونے کی بنا پر فعل مؤنث مذکور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ** (مائدہ: 32) اور کذبت رسل اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر اسے توفاہ رسلنا پڑھا ہے۔ اور اعمش نے تتوفاہ رسلنا تا کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے اور مراد ملک الموت علیہ السلام کے معاونین اور مددگار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ روح کو جسم سے آہستہ آہستہ نکالتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کے قبض کا وقت ہوتا ہے تو ملک الموت علیہ السلام اسے قبض کر لیتے ہیں (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: حضرت ملک الموت علیہ السلام جسم سے روح قبض کرتے ہیں پھر اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اگر وہ مومن ہو یا ملائکہ عذاب کے سپرد کر دیتے ہیں اگر وہ کافر ہو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک الموت علیہ السلام کے ساتھ سات ملائکہ رحمت ہوتے ہیں اور سات ملائکہ عذاب ہوتے ہیں، پس جب وہ کسی مومن کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے ثواب کی بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں اور وہ اسے لے کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی کافر کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ عذاب کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے عذاب کی بشارت دیتے ہیں اور اسے خوب خوفزدہ کرتے ہیں، پھر اسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، پھر اسے سجین کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور بندہ مومن کی روح علیین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے (2)۔

اور التوفی (موت دینا) کی نسبت کبھی ملک الموت علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ** (سجدہ: 11) ''فرمائیے جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ'' اور کبھی ملائکہ کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہی اس کے والی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت اور دیگر آیات میں ہے۔ اور کبھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 291 2۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 490

کیونکہ حقیقت میں وہی موت دینے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا (زمر: 42) ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت''۔ قُلِ اللّٰہُ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ (الجاثیہ: 26) ''فرمائیے اللہ نے زندہ فرمایا ہے تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں''۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ (الملک: 2) ''جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو''۔

پس ملائکہ میں سے ہر مامور فرشتہ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ وَھُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ یعنی نہ وہ اسے ضائع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ادائیگی میں کوتاہی (اور غفلت) کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پوری پوری اطاعت اور پیروی کرتے ہیں، اور اس کا اصل معنی تو آگے بڑھنا اور پیش پیش ہونا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور فرط کا معنی ہے عجز کو پیش کرنا (اور طاقت نہ ہونے کا اظہار کرنا)۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) وہ کوئی کوتاہی اور لاپرواہی نہیں کرتے۔

عبید بن عمیر نے لَا یُفْرِطُوْنَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ اس بارے میں حد سے تجاوز نہیں کرتے اکرام اور اہانت میں سے جس کے بارے انہیں حکم دیا جائے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کر کے حساب کے لیے اٹھائے گا۔ مَوْلٰىھُمُ الْحَقِّ یعنی وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، وہ انہیں دوبارہ اٹھانے والا بھی ہے اور ان کا مالک بھی۔ اَلْحَقِّ قرات جمہور کے مطابق یہ مجرور ہے، کیونکہ یہ اسم جلالت کی نعت اور صفت ہے اور جس نے اسے الحق منصوب پڑھا ہے یا تو اس بنا پر کہ اس سے پہلے اعنی فعل مضمر ہے، یا پھر یہ مصدر ہے یعنی حقا۔

اَلَا لَہُ الْحُکْمُ یعنی جان لو اور کہو: قیامت کے دن صرف اسی کا حکم ہوگا، یعنی قضا (فیصلہ) اور فصل صرف اور صرف اسی کا ہوگا۔ وَھُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ یعنی وہ کسی فکر، رؤیت کا محتاج نہیں اور نہ ہی ہاتھ کی گانٹھوں پر گننے کا محتاج ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَہٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ ھٰذِہٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیْکُمْ مِّنْھَا وَمِنْ کُلِّ کَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِکُوْنَ ﴿۶۴﴾

''آپ فرمائیے کون نجات دیتا ہے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں جسے تم پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ (اور کہتے ہو) اگر نجات دی اللہ نے ہمیں اس (مصیبت) سے تو ہم ضرور ہو جائیں گے اس کے شکر گزار (بندے)۔ فرمائیے اللہ ہی نجات دیتا ہے تمہیں اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اس میں ظلمات سے مراد) خشکی اور سمندر کی تکالیف اور مصیبتیں ہیں: کہا جاتا ہے: یوم مظلم یعنی شدید اور مشقت آمیز دن۔ نحاس نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: یوم مظلم جب دن شدید اور سخت ہو، اور اگر دن کی شدت بہت زیادہ بڑھ جائے تو پھر کہتے ہیں: یوم ذو کواکب (یعنی ایسا دن جس میں ستارے نظر آئیں، اس میں مراد شدت اور تکلیف ہوتی ہے) اور سیبویہ نے کہا ہے:

بني أسدٍ هل تعلمون بلاءَنا إذا كان يوم ذوكواكب أشنعا

''اے بنی اسد! کیا تم ہماری آزمائش اور مصیبت کو جانتے ہو، جب دن ستاروں والا ہو تو وہ انتہائی شنیع اور تکلیف دہ ہوتا ہے''۔

ظُلُمٰتِ کو جمع اس بنا پر لایا گیا ہے، کیونکہ اس سے مراد خشکی کی تاریکی، سمندر کی تاریکی، رات کی تاریکی اور بادلوں کی تاریکی ہے، یعنی جب تم غلط راستے پر گامزن ہو جاؤ اور تمہیں ہلاکت کا خوف اور ڈر ہو تو تم اسے چھوڑ دو۔

لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو نے ہمیں ان مصائب سے نجات دی۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم ضرور شکر گزار اور فرمانبردار بندے ہو جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے شدائد و مصائب کے وقت اسے پکارنے پر انہیں ملامت کی اور جھڑکا۔ کیونکہ وہ آرام اور خوشحالی کی حالت میں اس کے ساتھ اوروں کو بھی پکارتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (پھر تم شریک ٹھہراتے ہو)

اعمش نے وخیفة پڑھا ہے یہ خوف سے ماخوذ ہے، اور ابوبکر نے حضرت عاصم سے خِفية خاء کے کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور فراء نے خُفوة اور خِفوة کا اضافہ کیا ہے اور کہا ہے: اس کی نظیر حُبیه، حِبیة، حُبوة اور حِبوة ہے۔ اور اعمش کی قرأت بہت بعید ہے۔

کیونکہ تَضَرُّعًا کا معنی ہے کہ تم گڑگڑانے (اور انتہائی عجز و انکساری) کا اظہار کرو اور خفية کا معنی ہے کہ تم اسی کی مثل چھپاؤ (اور اپنے اندر رکھو) اور کوفیوں نے لئن أنجانا پڑھا ہے۔ اور معنی کا سیاق تو تا کے ساتھ ہے جیسا کہ اہل مدینہ اور اہل شام نے قرأت کی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ کوفیوں نے اسے تشدید کے ساتھ يُنَجِّيْكُمْ پڑھا ہے اور باقیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا گیا ہے: دونوں کا معنی ایک ہے جیسا کہ نجا، أنجيته اور نجيته ہم معنی ہیں۔ اور کہا گیا ہے: تشدید، کثرت کا معنی بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور الکرب کا معنی وہ غم ہے جو نفس کو پکڑ لیتا ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: رجل مکروب (غمزدہ آدمی)۔ عنترہ نے کہا ہے:

و مكروبٍ كشفتُ الكرب عنه بطعنة فيصل لما دعانی

اور کربۃ اسی سے مشتق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ اس میں انہیں دھمکانا اور جھڑکنا مقصود ہے، جیسا کہ سورت کی ابتدا میں ہے۔ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۞ کیونکہ حجت جب معرفت کے بعد قائم ہو تو اخلاص واجب ہوتا ہے، اور انہوں نے اس کا بدل بنا لیا اور وہ اشراک (شرک کرنا) ہے۔ پس یہ اچھا ہے کہ انہیں اس حجت پر جھڑکا جائے اور انہیں ڈرایا دھمکایا جائے اگرچہ وہ نجات سے پہلے مشرک تھے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ

يَفْقَهُوْنَ ⊙

''فرمائیے وہ قادر ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے اور خلط ملط کر دے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی۔ دیکھو کیونکہ ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلوں کو تاکہ یہ لوگ (حقیقت کو) سمجھ لیں''۔

یعنی وہ تمہیں کرب اور مصیبت سے نجات دلانے پر بھی قادر ہے اور تمہیں عذاب دینے پر بھی۔ اور مِنْ فَوْقِكُمْ کا معنی ہے (اوپر سے) پتھر برسانا، طوفان، سخت چیخ اور ہوا، جیسا کہ اس نے عاد، ثمود، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم، اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کیا۔ یہ حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر وغیرہما سے مروی ہے۔ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسانا) اور زلزلہ وغیرہ ہے جیسا کہ اس نے قارون اور اصحاب مدین کے ساتھ کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ فَوْقِكُمْ سے مراد ظلم کرنے والے امراء (اور حکمران) ہیں۔ اور اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے مراد سفلہ مزاج اور برائی کرنے والے غلام ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا اور ابو عبداللہ مدنی سے اَوْ يُلْبِسَكُمْ یا کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی وہ تمہیں عذاب کے ساتھ ڈھانپ دے (تم پر عذاب مسلط کر دے) اور اسے تم پر عام کر دے، اور یہ لفظ اللبس (لام کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے۔ اور فتحہ کی قرأت اللبس سے ماخوذ ہے۔ یہ مشکل مقام ہے اور اعراب اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

یعنی وہ تم پر تمہارا معاملہ خلط ملط کر دے، پس دو مفعولوں میں سے ایک کو اور حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (مطففین: 3) (یعنی ان میں بھی مذکورہ حذف موجود ہے) اور یہ اختلاط یہ ہے کہ وہ ان کے معاملے کو خلط ملط کر دے اور ان کی خواہشات اور چاہت میں اختلاف پیدا کر دے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا کا معنی ہے کہ وہ تمہارے دشمن کو قوی کر دے یہاں تک کہ وہ تم میں مخلوط ہو جائے اور جب وہ تمہارے ساتھ آ ملے تو تحقیق وہ تم میں خلط ملط ہو گیا (اور تم پر قوت پکڑ گیا)۔ شِيَعًا کا معنی مختلف گروہ اور فرقے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے مختلف گروہ بنا دے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قتال کرنے لگو۔ اور یہ ان کا معاملہ خلط ملط ہو جانے اور طلب دنیا پر ان کے امراء کے متفرق ہونے کے سبب ہے۔ اور اس ارشاد گرامی وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ کا یہی معنی ہے یعنی فتنہ میں جنگ و قتل کے ساتھ تم میں سے بعض کو دوسروں کی شدت چکھائے۔ یہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں اور کفار تمام کو عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں خاص ہے اور حسن نے کہا ہے: یہ اہل صلوۃ (اہل قبلہ) کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ عملاً اور وجوداً اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے، ہم نے اپنے شہروں میں دشمن کے ساتھ

اختلاط کیا اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے والی بنے، ایسے فتنہ کے ساتھ جو ہم پر غالب اور مسلط رہتا کہ ہمارے بعض نے بعض کو قتل کیا اور بعض نے دوسروں کے مالوں کو مباح سمجھا۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظھر وما بطن (ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں ایسے فتنوں سے جو ظاہر ہوئے اور جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے)

اور حضرت حسن سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس کی تاویل کی ہے جو کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہوا(1)۔ مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إن اللہ زوی لی الأرض فرأیت مشارقھا و مغاربھا وإن أمتی سیبلغ ملکھا ما زوی لی منھا وأعطیت الکنزین الأحمر والابیض الی آخر الحدیث۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین لپیٹ دی تو میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور عنقریب میری امت کی سلطنت اور حکومت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لیے اسے لپیٹا گیا اور مجھے دو خزانے سرخ و سفید (سونا اور چاندی) عطا فرمائے گا اور میں نے اپنے پروردگار سے اپنی امت کے لیے یہ التجا کی ہے کہ وہ اسے عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہ کرے اور یہ کہ وہ ان پر ایسے دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان میں سے نہ ہو اور وہ ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھنے لگے۔ اور میرے رب نے فرمایا ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو اسے رد نہیں کیا جاتا۔ میں نے آپ کو آپ کی امت کے لیے یہ عطا فرما دیا کہ میں انہیں عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہیں کروں گا اور یہ کہ میں ان پر کسی بیرونی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھ لے اگرچہ وہ ان پر اطراف و اکناف سے جمع ہو جائے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض بعض کو ہلاک کرنے لگیں اور بعض بعض کو قیدی بنالیں''۔

نسائی نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور وہ ساری رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہبانی کرتے رہے یہاں تک کہ فجر ہوگئی، تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز سے سلام پھیرا تو جناب خباب رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں آپ نے آج کی رات ایسی نماز ادا کی ہے میں نے آپ کو اس طرح کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جی ہاں بلا شبہ یہ انتہائی عجز اور خوف کی نماز تھی میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی التجا کی ہے۔ ان میں سے دو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرما دی ہیں اور ایک کو مجھ سے روک لیا ہے۔ میں نے اپنے پروردگار سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں اس کے ساتھ ہلاک نہ کرے جس کے ساتھ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ مجھے عطا فرما دیا ہے (یعنی میری التجا کو قبول کر لیا ہے) اور میں نے اپنے رب سے یہ التجا کی ہے کہ وہ ہم پر کسی بیرونی دشمن کو غلبہ نہ دے، تو اس نے یہ بھی مجھے عطا فرما دیا ہے اور میں نے اپنے رب سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں مختلف گروہوں میں خلط ملط نہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہیں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 305

فرمایا"۔ ہم نے یہ اخبار کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہیں۔ والحمدللہ

اور یہ روایت بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل امین علیہ السلام سے کہا: "اے جبریل! کیا میری امت کی بقا اسی پر ہے"؟ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے عرض کی: بلاشبہ میں آپ کی مثل بندہ ہوں آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اور اپنی امت کے لیے التجا کیجئے"۔

پس رسول اللہ ﷺ اٹھے، وضو فرمایا اور خوب اچھی طرح وضو کیا (نفل) نماز پڑھی اور خوب اچھی طرح نماز پڑھی، پھر (رب کریم کی بارگاہ میں) دعا کی تو حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: یا محمد إن الله تعالیٰ سمع مقالتك واجارهم من خصلتين وهو العذاب من فوقهم ومن تحت أرجلهم (اے محمد! ﷺ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو سنا ہے اور انہیں دو خصلتوں سے پناہ عطا فرمادی ہے اور وہ عذاب ہے ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے جبریل! کیا میری امت باقی رہے گی جب ان میں خواہشات مختلف ہیں اور وہ ان کے بعض کو بعض کی شدت چکھائے گا"۔

تو حضرت جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا، الآیہ (عنکبوت:2) (الف، لام، میم کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا)۔

حضرت عمرو بن دینار نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے کہا: اعوذ بوجه الله (میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں (اس عذاب سے)) اور جب یہ نازل ہوئی اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ تو آپ نے کہا: هاتان اهون (یہ دونوں بہت آسان ہیں) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ صبح و شام ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم إني أسئلك العافية في الدنيا والآخرة (اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی التجا کرتا ہوں) اللهم إني أسئلك العفو والعافية في ديني ودنياي واهلي ومالي (اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا، اپنے گھر والوں اور اپنے مال کے لیے عفو اور عافیت کی التجا کرتا ہوں)۔ اللهم أستر عوراتي وآمن روعاتي وأحفظني من بين يدي ومن خلفي وعن يميني وعن شمالي ومن فوقي وأعوذ بك أن أغتال من تحتي (1) (اے اللہ! مجھے بے پردگی سے محفوظ فرما، مجھے خوف سے، ڈر سے امن عطا فرما، میرے سامنے سے، پیچھے سے، میرے دائیں اور بائیں سے اور میرے اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں اپنے نیچے کی جانب سے ہلاک ہوں) وکیع نے کہا ہے: اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسنا) ہے۔

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ دیکھو کیونکر ہم ان کے لیے حجتیں اور دلائل بیان کرتے ہیں۔ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ اس

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب مایدعو بہ الرجل اذا اصبح اذا امسی، حدیث نمبر 3860، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے مراد اس شرک اور گناہوں کا بطلان ہے جن میں وہ مبتلا تھے۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ۚ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

''اور جھٹلایا اسے آپ کی قوم نے حالانکہ یہ حق ہے فرمایئے نہیں ہوں میں تمہارا ذمہ دار۔ ہر ایک خبر (کے ظہور) کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب جان لوگے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ، ای بالقرآن یعنی آپ کی قوم نے قرآن کو جھٹلایا ہے۔

ابن ابی عبلہ نے وکذبت تاء کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ وَهُوَ الْحَقُّ حالانکہ اس کے قصص حق ہیں۔ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ حسن نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) میں تمہارے اعمال کا محافظ نہیں ہوں کہ میں تمہیں ان پر جزا اور بدلہ دوں، بلاشبہ میں تو ڈرانے والا ہوں میں نے پیغام (حق) پہنچادیا ہے، اس کی مثل یہ آیت بھی ہے وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿﴾ (انعام) (اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوتا) میں تم پر تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا ہوں۔

پھر یہ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ان کا ایمان آپ کی وسعت میں نہیں ہے۔ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ یعنی ہر خبر کی ایک حقیقت ہے، یعنی ہر شی کے لیے ایک مقررہ وقت ہے جس میں وہ بغیر تقدیم وتاخیر کے واقع ہوجاتی ہے۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے: ہر عمل کی جزا ہے۔ حسن نے کہا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کفار کے لیے وعید ہے، کیونکہ وہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار نہ کرتے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایسی شی کے ساتھ وعید ہو جو دنیا میں ان پر نازل ہوگی۔

سدی نے کہا ہے: بدر کے دن ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں ڈرا رہا ہے۔ اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بعض تفاسیر میں دیکھا ہے کہ یہ آیت داڑھ کے درد کے لیے باعث نفع ہے جب اسے کاغذ پر لکھ کر دانت پر رکھا جائے۔

وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۚ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾

''اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بیہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ وہ الجھنے لگیں کسی اور بات میں اور اگر (کہیں) بھلادے تجھے شیطان تو مت بیٹھو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے پاس''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ المحرر الوجیز

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا یعنی وہ ہماری آیتوں کی تکذیب اور ان کے ساتھ استہزا کی بیہودہ بحثیں کرتے ہیں فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ تو آپ ان سے اعراض کر لیں۔ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مومنین بھی اس خطاب میں داخل ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ علت اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث سننا ہے اور یہ علت مومنین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبھی کو شامل ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد اکیلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین سے اٹھنا ان پر شاق گزرتا تھا اور مومنین ان کے نزدیک اس طرح نہ تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اختلاف (اور نفرت) کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں جب کہ وہ استہزا کریں اور بیہودہ بحث کریں تا کہ وہ اس سے ادب سیکھیں اور بیہودہ بحث کرنا اور استہزا کرنا چھوڑ دیں۔

الخوض کا اصلی معنی ہے پانی میں غوطہ زن ہونا، پھر بعد میں ان اشیاء میں گم ہو جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جو جاہل بنا دینے والی ہیں، یہ غمرات الماء کے ساتھ تشبیہ ہے، پس محسوس کو معقول کے لیے بطور مجاز استعمال کیا گیا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خلط (باہم ایک دوسرے سے ملنا) سے ماخوذ ہے اور ہر وہ شی جس میں تو غوطہ زن ہو تو اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اسی سے خاض الماء بالعسل بھی ہے جب تو پانی کو شہد کے ساتھ ملا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھلایا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرک قوم کے پاس بیٹھتے تھے، آپ انہیں نصیحت فرماتے تھے اور انہیں دین اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور وہ قرآن کریم کے ساتھ استہزا کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے منہ پھیر لیں جس طرح کہ انکار اور نفرت کرنے والا اعراض کرتا ہے۔ تو اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب آدمی کسی دوسرے کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے اور اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کی بات قبول نہیں کرے گا تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے منکر کے اعراض کی طرح اعراض کر لے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں بیان کیا ہے وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ استہزا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ساتھ بیٹھنے سے منع فرما دیا ہے سوائے اس کے کہ آپ بھول جائیں۔ اور جب یاد آ جائے تو پھر اٹھ کھڑے ہوں۔ ورقاء نے ابن ابی نجیح کے واسطہ سے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے بارے میں ناحق باتیں کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں کتاب اللہ کی جانب سے ان کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ وہ ائمہ جو حجت اور دلیل ہیں اور ان کی اتباع کی جاتی ہے ان کے لیے جائز ہے کہ وہ فاسق لوگوں سے اختلاط کرتے اور اپنے تقویٰ کی بنا پر ان کی آراء کو درست اور صحیح قرار دیتے رہیں۔

علامہ طبری نے ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم جھگڑا کرنے والوں کی مجالست اختیار نہ کرو،

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 731

کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحثیں کرتے ہیں(1)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ اہل کبائر کی مجالست اختیار کرنا حلال نہیں ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث کرے اس کی مجالست چھوڑ دی جائے اور اسے بھی چھوڑ دیا جائے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔ فرمایا: اور اسی طرح ہمارے اصحاب نے دشمن کی سرزمین میں داخل ہونے اور ان کے چرچ اور عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے منع کیا ہے اور کفار اور اہل بدعت کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ کہ ان کی محبت و مودت کا اعتقاد نہ رکھا جائے اور نہ ان کا کلام سنا جائے اور نہ ان کے ساتھ مناظرہ کیا جائے۔

اہل بدعت میں سے کسی نے ابو عمران نخعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہا: مجھ سے ایک کلمہ سنو، تو آپ نے اس سے اعراض کر لیا اور فرمایا: نصف کلمہ بھی نہیں۔ اور اسی کی مثل ایوب سختیانی سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت فضیل بن عیاض نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو اکارت اور ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام نکال دے گا۔ اور جس نے اپنی بیٹی کی شادی کسی مبتدع سے کر دی تو اس نے اس کا تعلق منقطع کر دیا اور جس نے کسی بدعتی کے ساتھ مجالست اختیار کی اسے حکمت عطا نہیں کی جائے گی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کے بارے میں جان لے کہ وہ بدعتی کو مبغوض جانتا ہے تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا۔

ابو عبداللہ حاکم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الأسلام جس نے کسی بدعتی کی عزت و توقیر کی تحقیق اس نے اسلام کو گرانے میں (کمزور کرنے میں) معاونت کی۔

مذکورہ تمام روایات و اقوال سے اس کا قول باطل ہو گیا جس نے یہ گمان کیا کہ ان (اہل بدعت) کی مجالست جائز ہے جب کہ وہ ان کا کلام سننے سے محفوظ رہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۞

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ اس میں اِمَّا شرطیہ ہے، اسے نون ثقیلہ اغلباً لازم ہوتا ہے اور بعض اوقات لازم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اما يصبك عدوٌ فی مناواۃ　　يوماً فقد كنتَ تستعلی وتنتصرُ

(اما یصبک میں نون ثقیلہ موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس اور ابن عامر رضی اللہ عنہم نے معنی تکثیر کی بنا پر ینسینک سین کو مشدد پڑھا ہے: کہا جاتا ہے: نسی اور أنسی دونوں کا ایک معنی ہے اور یہ دو لغتیں ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 314

قالت سلیمی أتسری الیوم أم تقل      وقد ینسیك بعض الحاجة الکسل

اور امراُالقیس کا قول ہے:

لَنسِیِنی اِذا قُمتِ بِہِ بالی

آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! ﷺ اگر شیطان آپ کو ان کے پاس سے اٹھنا بھلا دے اور آپ اس نہی کے بعد ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى تو جب آپ کو یاد آئے تو پھر نہ بیٹھیں۔ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ یعنی مشرک قوم کے ساتھ اور ذکری تذکیر کا اسم ہے۔

**مسئلہ نمبر** 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ انہوں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ نسیان (بھول) سے مبرا ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب آپ ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہے اور آپ کے لیے نسیان جائز ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر ہم اپنے اصحاب کو ان کے اس قول میں معذور قرار دیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر: 65) میں حضور نبی مکرم ﷺ کے اسم کے ساتھ خطاب امت کو ہے اس لیے کہ آپ کی طرف شرک کی نسبت محال ہے، تو اس بارے میں ان کا کوئی عذر نہیں کیونکہ نسیان کی نسبت آپ کی طرف جائز ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نَسِیَ آدمُ فَنَسِیَتْ ذریتُہٗ (حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی اولاد کو بھی نسیان لاحق ہو گیا) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور آپ ﷺ نے اپنے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: إنما أنا بشر مثلکم أنسی کما تنسون فإذا نسیت فذَکِّرُونی (بلاشبہ میں تمہاری مثل انسان ہوں میں بھی بھول جاتا ہوں جیسا کہ تم بھولتے ہو پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو) اسے بھی آپ نے صحیح میں روایت کیا۔ پس اس میں آپ نے نسیان کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اور فرمایا: آپ نے ایک آدمی کی قرأت سنی۔ تحقیق اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی ہے میں انہیں بھول چکا تھا۔

آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز ہونے کے بعد علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ طریقہ تبلیغ سے متعلقہ افعال اور احکام شرع میں بھی لاحق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں جو کچھ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اس کے مطابق عام علماء اور محققین ائمہ کرام نے پہلے موقف کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ ظاہر قرآن و احادیث اس پر شاہد ہے۔ البتہ ائمہ کرام نے یہ شرط عائد کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو اس پر متنبہ کر دیتا ہے اور اس (حالت نسیان) پر برقرار نہیں رکھتا۔ پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اس تنبیہ کا واقعہ کے فوراً بعد متصل ہونا شرط ہے؟ یہ مذہب قاضی ابوبکر اور اکثر علماء کا ہے۔ یا واقعہ سے تنبیہ کا مؤخر ہونا بھی جائز ہے جب تک کہ نبی علیہ السلام کی عمر اختتام پذیر نہ ہو اور سلسلہ وعظ و تبلیغ منقطع ہو جائے۔ ابوالمعالی نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت نے وعظ و ارشاد اور عبادات شرعیہ میں آپ ﷺ کے سہو اور بھول کا انکار کیا ہے، جیسا کہ

انہوں نے بالاتفاق وعظ وارشاد سے متعلقہ اقوال میں اس (بھول) کا انکار کیا ہے اور اس بارے میں وارد ہونے والے ظاہر دلائل سے عذر بیان کیا ہے۔

اسی کو الاستاذ ابو اسحاق نے اختیار کیا ہے۔ باطنیہ اور ارباب علم قلوب کی ایک جماعت نے اسے شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے: آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز نہیں ہے، بلاشبہ آپ قصداً اور ارادۃً بھولتے ہیں اور صورۃً نسیان کا قصد کرتے ہیں تا کہ سنت قائم ہو جائے۔ ائمہ تحقیق میں سے ایک عظیم امام اس طرف گئے ہیں اور وہ ابو المظفر الاسفرائینی ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''الاوسط'' میں یہ کہا ہے۔ اور یہ میلان صحیح اور پختہ نہیں ہے اور ضد کا ضد کے ساتھ جمع ہونا بہت زیادہ محال ہے۔

وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾

''اور نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے ان کافروں کے حساب سے کچھ بوجھ البتہ پرہیزگاروں پر نصیحت کرنا فرض ہے شاید وہ باز آجائیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب یہ حکم نازل ہوا کہ آپ مشرکین کے ساتھ نہ بیٹھیں اور ارشاد باری تعالیٰ: فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ سے یہی مراد ہے تو مسلمانوں نے کہا: ہمارے لیے مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا ممکن نہ رہے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی: وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى یعنی اگر مومنین ان کے پاس بیٹھیں تو پھر چاہیے کہ وہ انہیں نصیحت کریں۔ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اسے ترک کرنے کے بارے ڈرتے رہیں جس میں وہ واقع ہوئے ہیں (1)۔

پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم اس ارشاد ربانی کے ساتھ منسوخ ہے: وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (النساء: 140) ''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جا رہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (کفر واستہزا کرنے والوں) کے ساتھ کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں''۔(2)

یہ فتح (مکہ) سے پہلے رخصت تھی اور وہ وقت احتیاط وتحفظ کا وقت تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا ہے: وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ تا قولہ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: اظہر یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور معنی یہ ہے: مشرکین کے حساب میں سے کوئی شی تم پر واجب نہیں ہے، پس تم پر انہیں نصیحت کرنا لازم ہے اور انہیں زجر وتنبیہ کرنا لازم ہے، پھر اگر وہ انکار کر دیں تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ذکری مصدر ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو۔

ای ولکن الذی یفعلونہ ذکری، ای ولکن علیھم ذکری اور کسائی نے کہا ہے: معنی یہ ہے ولکن ھذہ ذکری (البتہ یہ نصیحت ہے)

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ أَنْ تُبْسَلَ

1۔ المحرر الوجیز
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 315

نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ ۖ لَيۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ ۚ وَاِنۡ تَعۡدِلۡ كُلَّ عَدۡلٍ لَّا يُؤۡخَذۡ مِنۡهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا كَسَبُوۡا ۚ لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ ۝

''اور چھوڑ دے جنہوں نے بنالیا ہے اپنا دین کھیل اور دل لگی اور دھوکہ میں ڈال دیا ہے انہیں دنیوی زندگی نے اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے، نہیں ہے اس کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارشی اور اگر وہ معاوضہ میں دے ہر بدلہ تو نہ قبول کیا جائے گا اس سے، یہی وہ لوگ ہیں جو ہلاک کیے گئے ہیں بوجہ اپنے کرتوتوں کے ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے بوجہ اس کفر کے جو وہ کرتے رہے تھے''۔

یعنی آپ ان کے ساتھ قلبی تعلق قائم نہ کیجئے، کیونکہ وہ خطا اور لغزش کو تلاش کرنے والے لوگ ہیں اگرچہ آپ ان کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنے پر مامور ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ (توبہ:5) ہے۔

اور لَعِبًا وَّلَهۡوًا کا معنی ہے اس دین کے ساتھ استہزا کرنا جس کی طرف آپ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس دین کے ساتھ استہزا کیا جس پر وہ تھے، پس انہوں نے اس کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اور استہزاء دین میں جائز نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَعِبًا وَّلَهۡوًا کا معنی باطلاً و فرحاً ہے (یعنی باطل قرار دینا اور پھر خوش ہونا) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور لعب کا لفظ چار مقامات پر مقدم آیا ہے، اور اسے اس طرح نظم کیا گیا ہے:

اذا أتى لعبٌ و لهوٌ وكم من موضعٍ هو فى القرآن
فحرفٌ فى الحديد وفى القتال وفى الأنعام منها موضعان

''جب لعب ولہو مذکور ہو اور قرآن کریم میں یہ کتنے مقامات پر ہے پس ایک بار (سورہ) الحدید میں اور ایک بار القتال میں اور دو مقامات پر سورۃ الانعام میں ہے''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں دین سے مراد عید ہے۔ کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے عید بنائی ہے جس کی وہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور اس دن اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنی عید کو لعب و لہو بنا دیا ہے سوائے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے، کیونکہ انہوں نے اسے نماز، ذکر اور صدقہ وغیرہ دینے کا دن بنایا ہے، مثلاً جمعہ کا دن، عید الفطر کا دن اور قربانی کا دن۔

قولہ تعالیٰ: وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا یعنی وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

قولہ تعالیٰ: وَذَكِّرۡ بِهٖ آپ انہیں نصیحت کیجئے قرآن کے ساتھ یا (یوم) حساب کے ساتھ۔

اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ یعنی نفس کو گروی رکھ دیا جائے اور ہلاکت کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ معنی حضرت مجاہد،

قتادہ، حسن، عکرمہ اور سدی سے مروی ہے۔ اور ابسال کا معنی ہے: آدمی کو ہلاکت کے لیے پیش کرنا۔ لغت میں یہی معنی معروف ہے۔ أبسلت ولدی میں نے اپنے بچے کو رہن رکھا۔ عوف بن اُحوص ابن جعفر نے کہا ہے:

و أبسالی بنی بغیر جرم بعوناه ولا بدم مراقِ

بعوناہ یہ لفظ عین مہملہ کے ساتھ ہے اس کا معنی جنینا (ہم نے اسے مجرم قرار دیا)

اور البعو کا معنی الجنایۃ (جرم) ہے۔ بنی قشیر کے غنی نے بجیفہ کے دو بیٹوں کے خون کا ذمہ اٹھایا تو انہوں نے کہا: ہم تجھ سے راضی نہ ہوں گے، تو اس نے صلح کے مطالبہ میں اپنے بیٹوں کو ان کے پاس رہن رکھ دیا، اور نابغہ جعدی نے شعر کہا:

ونحن رھناً بالأفاقة عامراً بما کان فی الدرداء رھنا فأبسلا

الدرداء ان کا ایک دستہ تھا۔ لَیۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیۡعٌ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ تَعۡدِلۡ كُلَّ عَدۡلٍ لَّا یُؤۡخَذۡ مِنۡهَا الآیۃ عدل کا معنی فدیہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حَمِیۡمٍ کا معنی گرم پانی ہے اور قرآن کریم میں ہے۔ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِیۡمُ ﴿۱۹﴾ الآیہ (الحج) ''انڈیلا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی''۔

یَطُوۡفُوۡنَ بَیۡنَهَا وَ بَیۡنَ حَمِیۡمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ (الرحمٰن) ''وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جو از حد گرم ہوگا''۔ اور یہ آیت بھی آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ارشاد گرامی وَ ذَرِ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَهُمۡ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ذَرۡهُمۡ یَاۡكُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا (الحجر: 3) اور اس کا معنی ہے: آپ ان پر غمزدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ پر تبلیغ کرنا اور نفوس کی ہلاکت کے بارے نصیحت کرنا لازم ہے، پس جس نے (اپنے نفس کو) ہلاک کر دیا تحقیق اس نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور گروی رکھ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا اصل معنی حرام کرنا ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: ھذا بسل علیك ای حرام (یہ تجھ پر حرام ہے) گویا وہ جنت سے محروم کر دیئے گئے اور جنت ان پر حرام کر دی گئی۔ شاعر نے کہا:

أجارتکم بسل علینا محرم وجارتُنا حلٌ لکم وحلیلھا

أبسال بمعنی تحریم ہے۔

قُلۡ اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنۡفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤی اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسۡتَهۡوَتۡهُ الشَّیٰطِیۡنُ فِی الۡاَرۡضِ حَیۡرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصۡحٰبٌ یَّدۡعُوۡنَهٗۤ اِلَی الۡهُدَی ائۡتِنَا ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی ؕ وَ اُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۷۱﴾ وَ اَنۡ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّقُوۡهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝

''آپ فرمائیے کیا ہم پوجیں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے ہمیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور (کیا) ہم پھر جائیں الٹے پاؤں اس کے بعد کہ ہدایت دی ہے ہمیں اللہ نے؟ مثل اس شخص کے کہ بھٹکا دیا ہو اسے جنون نے زمین میں اور وہ حیران و پریشان ہو، اس کے ساتھی ہوں جو اسے بلا رہے ہوں ہدایت کی طرف کہ ہمارے پاس آجا، آپ فرمائیے اللہ کی رہنمائی ہی حقیقی رہنمائی ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں سارے جہانوں کے رب کے سامنے۔ اور یہ کہ صحیح صحیح ادا کرو نماز اور ڈرو اس سے اور وہی ہے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور جس روز وہ کہے گا کہ ہو جا تو بس وہ ہو جائے گا۔ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی جس دن پھونکا جائے گا صور، جاننے والا ہے ہر چھپی خبر کا اور ہر ظاہر چیز کا اور وہی ہے حکمت والا سب کچھ جاننے والا''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا یعنی وہ جو ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے پوجیں۔ وَلَا یَضُرُّنَا اور وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے چھوڑ دیں۔ اس سے مراد بت (اصنام) ہیں۔ وَنُرَدُّ عَلٰۤی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یعنی ہم ہدایت کے بعد ضلالت و گمراہی کی جانب لوٹ جائیں۔

اعقاب کا واحد عقب ہے اور یہ مؤنث ہے، اور اس کی تصغیر عقیبۃ ہے۔ جب کوئی الٹے پاؤں واپس لوٹے تو کہا جاتا ہے: رجع فلان علی عقبیہ ابو عبیدہ نے کہا ہے: جو کوئی اپنی حاجت اور ضرورت سے واپس لوٹ آئے اور وہ اس کے ساتھ کامیاب نہ ہو تو کہا جاتا ہے: قد رد علی عقبیہ۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تعقب بالشر بعد الخیر (وہ خیر اور بھلائی کے بعد شر کی طرف واپس لوٹا)۔ یہ اصل میں العاقبۃ اور العقبیٰ سے ماخوذ ہے اور یہ دونوں اس شی کے لیے (بولے جاتے) ہیں جو کسی شی کے پیچھے ہو اور واجب ہے کہ وہ اس کی اتباع اور پیروی میں ہو۔ اور اسی سے والعاقبۃ للمتقین ہے اور اسی معنی میں عقب الرجل (پاؤں کی ایڑی) بھی ہے اور اسی سے العقوبۃ ہے، کیونکہ وہ (سزا) گناہ کے پیچھے ہوتی ہے اور گناہ کے سبب ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: كَالَّذِیْ اس میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ یعنی جنوں نے اسے گمراہ کر دیا اور انہوں نے اس کی خواہش کو آراستہ اور مزین کیا اور اسے اس کی طرف دعوت دی۔ کہا جاتا ہے: هوی یهوی الی الشیء کسی شے کی طرف انتہائی تیزی سے بڑھنا۔ اور زجاج نے کہا ہے: هوی یهوی سے ماخوذ ہے اور یہ هوی النفس سے ماخوذ ہے۔

یعنی شیطان نے اس کے لیے اس کی خواہش کو آراستہ کیا اور جماعت کی قرأت استهوته ہے یعنی هوت به (جنات نے اسے بھٹکا دیا) یہ قرأت جماعت کے مؤنث ہونے کی بنا پر ہے۔ اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر استهواه الشیاطین

پڑھا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے استھواہ الشیطان مروی ہے اور حسن سے بھی مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابی کی قرأت میں ہے اور ائْتِنَا کا معنی تابعنا (تو ہماری پیروی کر) ہے۔

اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں بھی یدعونه الی الهدی بَیِّنًا ہے اور حسن سے بھی استھوته الشیاطون مروی ہے۔ حیران حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث حیریٰ ہے جیسا کہ سکران کی مونث سکریٰ اور غضبان کی مونث غضبیٰ ہے۔ اور حیران وہ ہوتا ہے جو اپنے معاملے کی جہت کی رہنمائی نہیں پا سکتا۔ اور حار یحار حیرا و حیرۃ و حیرورۃ کا معنی ہے تردد (مضطرب اور متردد ہونا) اور اسی وجہ سے وہ پانی جو متغیر ہو کر زرد رنگ ہو جائے اور اس کے باہر نکلنے کا راستہ (سوراخ) نہ ہو اس کا نام حائر رکھا گیا ہے اور اس کی جمع حوران ہے۔ اور الحائر وہ جگہ جس میں پانی متغیر اور متردد ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تخطو علی بردیتین غذاهما　　غدق بساحة حائر یعبوب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بت کی پوجا کرنے والے کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جسے کوئی جن بلاتا ہے اور وہ اس کی پیروی میں چل پڑتا ہے اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ اس نے اسے انتہائی گمراہ کن اور ہلاکت والی جگہ میں پھینک دیا ہوتا ہے، اور پھر وہ اسی کی مصیبت اور تکلیف میں سرگرداں رہتا ہے(1)۔ اور ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت حضرت عبد الرحمن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنے والدین کو کفر کی دعوت دیتے تھے اور ان کے والدین اور مسلمان انہیں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى کا یہی معنی ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے تھے۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: ان کی والدہ ام رومان بنت حارث بن غنم کنانیہ تھی اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے۔ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حالت کفر میں اپنی قوم کے ہمراہ بدر و احد (کے میدان) میں حاضر ہوئے اور دعوت مبارزت دی اور ان کے مقابلے کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ان کے والد محترم (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) ان کی طرف بڑھے اور یہ ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: متعنی بنفسک (مجھے اپنی ذات سے فائدہ پہنچاؤ) پھر وہ (عبد الرحمن) اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا اور وہ صلح حدیبیہ کے وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تھے۔ یہ اہل سیر کا قول ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ان کا نام عبد الکعبہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر عبد الرحمن رکھ دیا اور وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔

اور کہا جاتا ہے کہ نسل در نسل چار افراد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، یعنی باپ ہو اور اس کے بیٹے ہوں سوائے حضرت ابو قحافہ، ان کے صاحبزادے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹے حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر اور ان کے بیٹے ابو عتیق محمد بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہم کے۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 329

قولہ تعالیٰ: وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ، لِنُسْلِمَ پر لام، لام کی ہے، یعنی اُمِرْنَا کی نسلم و بأن اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (ہمیں حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم گردن جھکا دیں اور اس کے بارے میں کہ نماز صحیح صحیح ادا کرو) کیونکہ حروف اضافت میں سے بعض کو بعض پر عطف کیا جاتا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أمرنا بأن نسلم (ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں) کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمرتك لتذهب، وبأن تذهب دونوں کا معنی ایک ہے(1) (میں نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو چلا جا)

نحاس نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن بن کیسان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ لام جارہ ہے۔ اور کل لام تین قسم کے ہیں: لام خفض (لام جارہ) لام امر اور لام توکید، کوئی لام ان تین قسموں سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام کا معنی اخلاص ہے (یعنی مخلص ہونا)۔

اور إقامة الصلوٰة کا معنی ہے نماز ادا کرنا اور اس پر دوام اختیار کرنا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ کا معنی پر عطف ہو، یعنی یدعونه الی الهدی ویدعونه أن اقیموا الصلاة (وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں ہدایت کی طرف اور وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں کہ صحیح صحیح نماز ادا کرو) کیونکہ ائْتِنَا کا معنی ہے أن ائتنا۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور اسی طرح وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بھی ہے یعنی وہی وہ ذات ہے جس کے لیے واجب ہے کہ اس کی عبادت کی جائے نہ کہ بت اور بِالْحَقِّ کا معنی بکلمة الحق ہے (یعنی کلمہ حق کے ساتھ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا) اور اس سے مراد اس کا قول کن ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ اور یاد کرو اس دن کو جس دن وہ کہے گا: تو ہو جا یا تم اس دن سے ڈرو جس دن وہ كُنْ کہے گا یا اس دن کا اندازہ کرو جس دن وہ كُنْ کہے گا۔ (یعنی اس یوم سے پہلے اذکر یا اتقوا یا قدر فعل محذوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عطف وَ اتَّقُوْهُ کی ہاء پر ہے۔ فراء نے کہا ہے: كُنْ فَیَكُوْنُ کہا جاتا ہے یہ صور کے لیے خاص ہے۔ یعنی ویوم یقول للصور کن فیکون (جس دن وہ صور کو کہے گا تو ہو جا تو وہ ہو جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ لوگوں میں سے جن کی موت کا اور جن کی حیات کا ارادہ فرمائے وہ سب ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں تاویلوں کی بنا پر قَوْلُهُ الْحَقُّ مبتدا اور خبر ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قول باری قَوْلُهُ الْحَقُّ کے سبب مرفوع ہے، یعنی وہ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں وہ حکم دیتا ہے اور الْحَقُّ اس کی نعت ہے اور اس بناء پر مکمل معنی اس طرح ہوگا: فَیَكُوْنُ قَوْلُهُ الْحَقُّ۔

اور ابن عامر نے فَیَكُوْنُ نصب کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ حساب اور بعث بعد الموت کی سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے اور سورۃ البقرہ میں اس پر مکمل بحث گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ یعنی اس کی بادشاہی ہوگی جس دن صور میں پھونکا جائے گا یا اس کا حق ہوگا جس دن صور

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 339

میں پھونکا جائے گا (یعنی تقدیر عبارت یہ ہے ولہ الملک یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ اور ولہ الحق یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ (یوم) یوم یقول سے بدل ہے (1)۔ اور صور نور کا ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ فنا کے لیے ہوگا اور دوسرا اٹھانے اور زندہ کرنے کے لیے (2) اور یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے گمان کیا ہے، یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) میں پھونکا جائے گا جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے" ... پھر صور میں پھونکا جائے گا اور اسے کوئی بھی نہیں سنے گا مگر وہ گردن کو جھکائے گا اور گردن کو اٹھالے گا ... فرمایا ... اور پہلے پہلے جو آدمی اسے سنے گا وہ اپنے اونٹ کے حوض کو مٹی کا لیپ کر رہا ہوگا ... فرمایا ... پس وہ مر جائے گا اور لوگ بھی مر جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ بھیجے گا ... یا فرمایا اللہ تعالیٰ نازل فرمائے گا ... بارش جو شبنم کی طرح ہوگی اور اس سے لوگوں کے جسم اگ پڑیں گے پھر صور میں دوسری بار پھونکا جائے گا تب وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے" (3) آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور قرآن کریم میں بھی اسی طرح ہے ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰى (الزمر: 68) یہاں فیہا نہیں فرمایا، تو اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے اور تمام امتوں کا اس پر اجماع ہے کہ صور میں حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ ابو الہیثم نے کہا ہے: جو کوئی صور کے سینگ ہونے کا انکار کرے تو وہ اس کی طرح ہے جو عرش، میزان اور پل صراط کا انکار کرتا ہے اور ان کی تاویلات تلاش کرتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: وہ صور جس کا ذکر حدیث طیبہ میں ہے وہ سینگ کی مانند ہے اسی میں پھونکا جائے گا، اور صور صورۃ کی جمع ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: صور سینگ ہے۔ راجز کا قول ہے:

لقد نطحناهم غداة الجَمعين نطحًا شديدًا لا كنطح الصُّورين

اور اسی معنی میں یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (النمل: 87)

کلبی نے کہا ہے: میں نہیں جانتا وہ صور کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ صورۃ کی جمع ہے جیسا کہ بسرۃ اور بسر ہے۔ یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) اور ارواح میں پھونکا جائے گا۔ اور حسن نے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوَرِ پڑھا ہے، اور صور میں ایک لغت صاد کے کسرہ کے ساتھ صِور بھی ہے یہ صورۃ کی جمع ہے اور اس کی جمع صوار ہے، اور اس میں ایک لغت صیار یا کے ساتھ بھی ہے۔ اور عمرو بن عبید نے کہا ہے: عیاض نے پڑھا ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوَرِ اور اس سے مراد خلق ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس نے کہا ہے اس آیت میں صور سے مراد صورۃ کی جمع ہے وہ ابو عبیدہ ہے۔ اگرچہ اس کا احتمال ہے لیکن یہ کتاب وسنت کے ساتھ مردود ہے اور یہ بھی کہ دوبارہ زندہ کرنے کے لیے صور میں دو بار نہیں پھونکا جائے گا، بلکہ اس میں ایک بار پھونکا جائے گا، پس حضرت اسرافیل علیہ السلام اس صور میں ایک بار پھونکیں گے جو کہ سینگ ہے اور اللہ تعالیٰ جسموں کو زندہ فرما دے گا۔

اور قرآن کریم میں ہے: فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم: 12)

---

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 57
2۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الزمر، حدیث نمبر 3167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6555

قولہ تعالیٰ: عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اس میں عالم، الَّذِيْ کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے وہ عالم الغیب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (عالم الغیب) اپنے سے پہلے مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر مرفوع ہو۔ اور بعض سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے ینفخ پڑھا ہے تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ اس کا فاعل عٰلِمُ الْغَيْبِ ہو، کیونکہ جب اس میں پھونک اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھی ماری جائے گی تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ عالم معنی پر محمول کرتے ہوئے مرفوع ہو جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لیبك یزید ضارع لخصومة

حسن اور اعمش نے عالم کو لہ کی ہا سے بدل بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے: کیا تم بناتے ہو بتوں کو خدا، بے شک میں دیکھتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اس بارے میں علماء نے کافی کلام کیا ہے، پس ابوبکر محمد ابن محمد بن حسن جوینی شافعی اشعری نے ''النکت'' میں اس کی تفسیر میں کہا ہے: لوگوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح ہے۔ اور جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا نام آزر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک آزر ان کی لغت میں عیب اور برائی ہے گویا کہ یہ فرمایا: اور یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: یا مخطی (اے خطا کرنے والے) اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو) اور جب معنی اس طرح ہو تو اسے مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آزر بت کا نام ہے اور جب معنی یہ ہو تو یہ محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے فعل مضمر ہوگا، گویا کہ اس طرح کہا: واذ قال ابراهيم لأبيه أتتخذ آزر الها، أتتخذ أصناما آلهة (جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: کیا تم آزر کو الٰہ بنا رہے ہو)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس اتفاق کا دعویٰ کیا ہے اس پر اجماع نہیں ہے۔ پس محمد بن اسحاق، کلبی اور ضحاک نے کہا ہے: بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر ہے اور وہی تارح ہے، جیسا کہ اسرائیل اور یعقوب ہیں۔ (میں کہتا ہوں) پس یہ دونوں نام اسی کے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: آزر لقب ہے اور تارح نام ہے اور اسے ثعلبی نے ابن اسحاق قشیری سے بیان کیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ حسن نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر تھا۔ اور سلیمان التیمی نے کہا ہے: یہ گالی اور عیب ہے اور ان کے کلام میں اس کا معنی ہے وہ جو ٹیڑھا ہو (یعنی بداخلاق ہو)۔

معتمر بن سلمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ کلمہ انتہائی عیب اور بد خلقی پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہ شدید ترین کلمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے کہا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: آزر کا معنی ہے انتہائی پیر فرتوت (بہت بوڑھا)۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ ان کی لغت میں صفت ذم ہے، گویا کہ آپ نے کہا: اے خطا کرنے والے (یعنی یا مخطئ) یہ اس کے مرفوع ہونے کے مطابق ہے اور جنہوں نے اسے مجرور پڑھا ہے اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہوگی: واذ قال ابراھیم لِأبیه المُخطِئ (اور جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خطا کرنے والے باپ کو کہا)۔ اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ اَفعل کے وزن پر ہے۔

نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: آزر عجمی اسم ہے، اور یہ آزرَ فلان فلاناً سے مشتق ہے اس کا معنی ہے إذا عاونه (جب کوئی دوسرے کی مدد کرے) اور وہ بتوں کی عبادت پر اپنی قوم کی مدد اور معاونت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الفوۃ سے مشتق ہے۔ اور الأزر کا معنی قوت ہے۔ یہ ابن فارس سے منقول ہے۔ اور مجاہد اور یمان نے کہا ہے: آزر بت کا نام ہے اور یہ اس تاویل میں محل نصب میں ہے، تقدیر کلام ہوگی: أَتَتَّخِذُ آزَرَ اِلٰهًا (کیا آپ بت کو الٰہ بنا رہے ہیں) أَتَتَّخِذُ أصناما اور یہ قول بھی ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیر کلام ہے: اتتخذ آزر اصناما۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر آزر اسم جنس ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ثعلبی نے کتاب "العرائس" میں کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ باپ جس کا نام اس کے باپ نے تارح رکھا تھا، جب وہ نمرود کے ساتھ اس کے بت کدے کا با اختیار متولی بن گیا تو اس نے اس کا نام آزر رکھ دیا۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: بلاشبہ آزر آپ علیہ السلام کے باپ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو بت کا نام ہے اور آپ کا نسب اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بن تارح بن ناخور بن ساروع ابن اَرغو بن فالغ بن عامر بن شالخ بن اَرفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (1)۔

اور آزر میں کئی قرائتیں ہیں: أأزرًا یہ دو ہمزوں کے ساتھ ہے اس میں پہلا مفتوح اور دوسرا مکسور ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور آپ ہی سے أأزرًا دو مفتوح ہمزوں کے ساتھ بھی مروی ہے اور اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ آپ کی پہلی دونوں قراتوں کے مطابق تَتَّخِذُ بغیر ہمزہ کے ہے۔

مہدی نے کہا ہے: أإزرًا؟ تو کہا گیا: بلاشبہ یہ بت کا نام ہے اور یہ أَتَتَّخِذُ إزرًا کی تقدیر پر منصوب ہے اور اسی طرح أأزرًا بھی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ أأزرًا بنایا جائے اس بنا پر کہ یہ الأزر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے پیٹھ، پس یہ مفعول من أجله ہو جائے گا۔ گویا کہ یہ کہا: أَلِلقوۃ تَتَّخِذُ أصناما (کیا قوت کا سبب تم بتوں کو بناتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ ازرًا معنی وزرًا (بوجھ) ہو، اور واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہو۔

قشیری نے کہا ہے: مشرکین پر حجت قائم کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بتوں کی عبادت کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 344

آپ کا اپنے باپ کا رد کرنے کا واقعہ ذکر کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرنے کے قریب تر لوگ عرب تھے، کیونکہ وہ آپ کی ذریت اور اولاد تھے (اور آیت میں اذکر فعل محذوف ہے) تقدیر کلام ہے: واذکُرْ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ (اور یاد کرو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) یا پھر ذکر محذوف ہے جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں مذکور ہے: ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے) اور تقدیر کلام ہوگی: وذکّرہم اِذْ قَالَ اِبْراهیم (اور یاد دلایئے جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) اور آزرُ بھی پڑھا گیا ہے یعنی یا آزر، یہ منادی مفرد ہونے کی بنا پر ہے اور یہ حضرت ابی اور یعقوب وغیرہما کی قرأت ہے۔ اور یہ قرأت اس کے قول کو تقویت دیتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ہے: اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اس میں تَتَّخِذُ فعل کے دو مفعول ہیں اور فعل میں استفہام برائے انکار ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ۝۷۵

"اور اسی طرح ہم نے دکھادی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں"۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی مَلَكُوْتَ بمعنی ملك (بادشاہی) ہے اور معنی صفت میں اظہار مبالغہ کے لیے واؤ اور تا کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اسی کی مثل رغبوت، رہبوت اور جبروت ہیں (1)۔ اور ابو السمال العدوی نے لام ساکن کے ساتھ مَلْكوت پڑھا ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک فتحہ کو خفیف ہونے کی بنا پر حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ اور شاید یہ اس میں ایک لغت ہے اور نُرِیْ بمعنی أرینا ہے، پس یہ ماضی کے معنی میں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آسمانوں میں ملائکہ کی عبادت اور دیگر عجائب قدرت (کا دکھانا) ہے اور زمین میں اولاد آدم کی عصیاں شعاری (دکھانا) ہے، پس آپ جسے گناہ اور نافرمانی کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کے لیے بددعا کرتے تو الله تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا، پس الله تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے ابراہیم! میرے بندوں سے رک جا، (یعنی ان کی ہلاکت کی دعا نہ کیا کر) کیا تم جانتے نہیں کہ میرے اسماء میں سے الصبور (بہت زیادہ صبر کرنے والا) بھی ہے؟ اسی کے ہم معنی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الله تعالیٰ نے آپ کے لیے آسمانوں اور زمین کو ظاہر فرما دیا یہاں تک کہ عرش اور سب سے نیچے والی زمین کو بھی۔ اور ابن جریج نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: آپ علیہ السلام کے لیے ساتوں آسمان کھول دیئے گئے تو آپ نے ان کی طرف دیکھا یہاں تک کہ آپ کی نظر عرش تک پہنچ گئی اور آپ علیہ السلام کے لیے زمینوں کو کھول دیا گیا اور آپ نے ان کی طرف دیکھ لیا (3) اور آپ نے جنت میں اپنا محل بھی ملاحظہ فرمایا۔

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 265
2۔ تفسیر الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 24
3۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 449؛ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 349

پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا (العنکبوت:27) (اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جانثاری) کا اجر اس دنیا میں) یہ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان کی بادشاہی میں سے وہ دکھائی جو کچھ اس نے ستاروں کے بارے بیان کیا ہے اور زمین کی بادشاہی میں سے سمندر، پہاڑ اور درخت دکھائے اور اسی طرح کی چیزوں کے بارے استدلال کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے اور فرمایا: جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کو تہہ خانہ میں رکھا گیا اور آپ کا رزق آپ کی انگلیوں کی اطراف (پوروں) میں رکھ دیا گیا پس آپ انہیں چوستے رہتے تھے، نمرود لعین نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ اس کی بادشاہی اس بچے کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی جو ابھی پیدا ہوگا، تو اس نے مردوں کو عورتوں سے الگ رہنے کا حکم دے دیا۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اس نے پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ آزر نمرود کے مقربین میں سے تھا اس نے اسے ایک دن اپنے کسی کام کے لیے بھیجا تو اس دوران اس نے اپنی بیوی سے مجامعت کر لی اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حاملہ ہوگئی۔

اور یہ قول بھی ہے: بلکہ اس نے بت خانہ میں اس کے ساتھ مجامعت کی اور وہ حاملہ ہوگئی اور اسی وقت اس کے سامنے بت گر گئے، پس اس نے اسے ایک قبیلے میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنم دیا، اور آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے زمین میں ایک تہہ خانہ کھودا اور اس کے دروازے پر ایک چٹان رکھ دی تاکہ درندے اسے پھاڑ نہ دیں۔ آپ کی ماں آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور دودھ پلا دیتی تھی اور وہ انہیں اپنی انگلیاں چوستے ہوئے پاتی تھیں، ان میں ایک میں شہد تھا، ایک میں پانی تھا اور ایک میں دودھ آتا تھا، اور آپ نشوونما پاتے گئے، پس آپ ایک سال کی عمر میں تین سال کے لگتے تھے۔ پس جب اس نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا تو لوگوں کو اس سے وہم ہوا کہ یہ تو دو سال قبل پیدا ہوئے، تو آپ نے اپنی ماں سے پوچھا: میرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: میں۔ پھر آپ نے پوچھا: تیرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تیرا باپ۔ آپ نے پھر سوال کیا: اس کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا: نمرود۔ آپ نے پھر کہا: اور اس کا رب کون ہے؟ تو اس نے آپ کو تھپڑ دے مارا اور وہ جان گئی کہ یہی وہ بچہ ہے جس کے ہاتھوں ان کی بادشاہی ختم ہو جائے گی۔

امام کسائی کی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں یہ مکمل قصہ موجود ہے اور قصص میں اسی کتاب کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ کا مولد حران ہے لیکن آپ کے باپ نے آپ کو سرزمین بابل کی طرف منتقل کر دیا۔ اور اسلاف میں سے عام اہل علم نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بن کنعان بن سنحاریب بن کوش بن سام بن نوح کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ طوفان نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے درمیان ایک ہزار دو سو تریسٹھ برس کا فاصلہ تھا۔ اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے تین ہزار تین سو تیئس برس بعد تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ہم نے انہیں ملکوت دکھائے تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝

"پس جب چھا گئی ان پر رات (تو) دیکھا انہوں نے ایک ستارا بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا (تو) بولے میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ یعنی جب رات نے اسے اپنی تاریکی کے ساتھ ڈھانپ لیا، الجَنَّة، الجِنة، الجُنَة، الجنین، المِجَنّ اور الجن تمام الفاظ بمعنی ستر (ڈھانپنا) ہیں اور جنان اللیل کا معنی رات کا سخت تاریک ہونا اور اس کا ڈھانپ لینا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ولولا جنانُ اللیل أدرك رکضنا بذی الرمث والأرطی عیاض بن ناشب

اور کہا جاتا ہے: جنون اللیل بھی اسی معنی میں ہے۔ اور کہا جاتا ہے: جنة اللیل واجنه اللیل (رات نے اسے ڈھانپ لیا) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (1)

رَاٰ كَوْكَبًا یہ دوسرا قصہ ہے اور یہ آپ پر ملکوت پیش کرنے کے قصہ کے سوا ہے۔ کہا گیا ہے: آپ نے اس چٹان کو شق ہوتے دیکھا جو آپ کے تہہ خانہ کے منہ پر رکھی ہوئی تھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ جب آپ کے باپ نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا وہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا تو آپ نے اونٹ، گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور فرمایا: ان کے لیے رب کا ہونا ضروری ہے اور آپ نے مشتری یا زہرہ کو دیکھا، پھر چاند کو دیکھا اور سورج کو اور یہ سب مہینے کے آخر میں ہوا۔ اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس تھی اور سترہ برس عمر ہونے کا قول بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نمرود پر غالب آئے اس وقت آپ کی عمر سترہ برس تھی۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هٰذَا رَبِّيْ اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں اور کہا گیا ہے: آپ کا یہ قول نظر و فکر کی مہلت، عہد طفولیت میں اور حجت قائم ہونے سے پہلے کی حالت میں تھا۔ اور اس حال میں نہ کفر ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان (2)۔ یہ قول کرنے والوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کی سند سے مروی ہے۔ فرمایا: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ تو آپ نے اس کی پوجا کی یہاں تک کہ وہ آپ سے غائب ہو گیا۔

اور اسی طرح سورج اور چاند کا واقعہ بھی ہے، پس جب آپ کی نظر و فکر مکمل ہو گئی تو آپ نے کہا: اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ بلاشبہ میں تو اس سے بری ہوں جسے تم شریک ٹھہراتے ہو۔ اور آپ نے اس کے غروب اور متغیر ہونے سے استدلال کیا، کیونکہ یہ حدوث پر انتہائی ظاہر اور واضح علامت و نشانی ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول ہو اس پر اوقات میں سے کوئی ایسا وقت آئے مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنے والا اور اسے پہچاننے والا ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکر یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا وہم اس کے بارے کیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اس سے بچا لیا ہے اور اس سے پہلے ہی اس کی ہدایت اور رہنمائی فرما دی ہے اور اسے اپنی بادشاہی دکھا دی ہے تا کہ وہ کامل

1۔ صحاح مادہ جنن
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 360

یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے (1)۔ یہ جائز نہیں ہے کہ اسے معرفت سے خالی تصور کیا جائے بلکہ اس نے پہلی نظر میں رب کریم کا عرفان حاصل کر لیا۔

زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ جواب غلط ہے اور جس نے یہ کہا ہے اس نے غلطی کی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا: وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ (ابراہیم) (اور بچالے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی) اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ (الصافات) (جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہیں کیا۔

زجاج نے کہا: میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ انہوں نے کہا: (کیا) تمہارے قول کے مطابق یہ میرا رب ہے؟ کیونکہ وہ بتوں، سورج اور چاند کی عبادت کرتے تھے۔ اور اسی قول کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَيْنَ شُرَكَآءِيَ (القصص:62) (میرے شرکاء کہاں ہیں) حالانکہ وہ تو وحدہ لاشریک ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے: تمہارے قول کے مطابق جو میرے شریک ہیں وہ کہاں ہیں؟ این شرکائی علی قولکم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تہہ خانے سے نکلے تو آپ نے ستارے کی روشنی دیکھی اور آپ اپنے رب کے طالب تھے، تو آپ کو گمان ہوا کہ یہ نور اور روشنی اسی کی ہے، تب آپ نے یہ کہا: هٰذَا رَبِّيْ یعنی وہ مجھے اپنا نور دکھا رہا ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے جان لیا کہ یہ ان کا رب نہیں ہے۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر جب آپ نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا اور اس کی روشنی پر آپ کی نظر پڑی۔

قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی گمراہ قوم سے) پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ اور یہ شرک نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ نے اس روشنی اور نور کی نسبت اپنے رب کی طرف کی ہے، لیکن جب آپ نے اسے زائل ہوتے ہوئے دیکھا تو علم نے آپ کی رہنمائی کی کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، تو آپ نے اپنے دل سے اس کی نفی کر دی اور یہ یقین کر لیا کہ یہ مربوب ہے رب نہیں ہے۔

اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ آپ نے هٰذَا رَبِّيْ کے الفاظ اپنی قوم پر حجت پختہ کرنے کے لیے کہے، پس (پہلے) آپ نے ان کے ساتھ موافقت ظاہر کی، لیکن جب ستارہ ڈوب گیا تو حجت مکمل اور پختہ ہو گئی اور فرمایا: جو شی متغیر ہو جائے وہ رب نہیں بن سکتی۔ اور وہ لوگ ستاروں کی تعظیم بجالاتے تھے، ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کے ساتھ حکم لگاتے تھے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں حسین ترین قول وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح مروی ہے۔ انہوں نے قول باری تعالیٰ: نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (النور:35) کے بارے کہا ہے: اسی طرح بندہ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 359

اور اس پر اپنے دل سے استدلال کرتا ہے اور جب وہ اسے پہچان لیتا ہے تو وہ نور پر نور کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور اس پر اپنے دلائل سے استدلال کیا، تو آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ کا رب اور خالق ہے، پھر جب اللہ عزوجل نے اپنی ذات کے بارے میں آپ کو عرفان عطا فرمایا تو معرفت میں اور اضافہ ہو گیا، تب آپ نے فرمایا: اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دے دی ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول ان کے فعل اور عمل کا انکار کرتے ہوئے استفہام اور زجر و توبیخ کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے: أَهٰذَا رَبِّي کیا یہ میرا رب ہے یا کیا اس کی مثل رب ہو سکتا ہے؟ پھر ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ (الانبیاء: 34) یعنی أفهم الخالدون۔ اور ہذلی نے کہا ہے:

رَفَوْنِي وقالوا يَا خُويلد لَا تُرَعْ　　فقلتُ وأنكرتُ الوجوهَ هُمُ هُمُ

ایک دوسرے نے کہا ہے:

لعمرُكَ ما أدري وإنْ كنتَ دَارِيًا　　بسبعٍ رمين الجمر ام بثمان

(دونوں شعروں میں ہمزہ استفہام محذوف ہے)

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: هٰذَا رَبِّي عَلٰى زَعْمِكُمْ (تمہارے گمان کے مطابق یہ میرا رب ہے)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (القصص) (کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے۔) اور مزید فرمایا: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان) ای عِنْدَ نَفْسِكَ (یعنی اپنے نفس کا ذائقہ چکھ) (لو چکھو، تم بڑے معزز و مکرم ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور تم کہتے ہو یہ میرا رب ہے۔ اس میں قول کو مضمر کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں قول کا اضمار کثیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ هٰذَا رَبِّيْ میں یہ معنی ہے ای هذا دليلٌ عَلٰى رَبِّي (یہ میرے رب پر دلیل ہے)

**فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ**

"پھر جب دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی اس گمراہ قوم سے"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا۔ کہا جاتا ہے: بَزَغَ الْقَمَرُ جب چاند طلوع ہونا شروع ہو اور البزغ کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے، گویا چاند اپنے نور کے ساتھ تاریکی اور اندھیرے کو پھاڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے ہے بَزَغَ البيطار الدابة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب سالوتری جانور کا خون بہادے۔

لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ یعنی اگر وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم نہ رکھتا۔ حالانکہ آپ ہدایت یافتہ تھے۔ تو یہ نظر و فکر کی مہلت

میں جاری ہوسکتا ہے یا آپ نے جواز عقلی کے امکان کے سبب ثابت قدمی کا سوال کیا، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا ہے: وَمَا يَكُونُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (اعراف: 89) (اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ۔)

اور قرآن کریم میں ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

''پھر جب دیکھا سورج کو جگمگاتے ہوئے (تو) بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ یہ تو ان سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا (تو) آپ نے فرمایا: اے میری قوم! میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً، بَازِغَةً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کیونکہ یہ آنکھ کی رؤیت ہے(1)۔ بَزَغَ يَبْزُغُ بزوغاً کا معنی ہے جب وہ طلوع ہوا۔ اور أَفَلَ يَأْفِلُ أفولاً کا معنی یہ ہے جب وہ غروب ہوا۔

اور فرمایا: هٰذَا اور الشَّمْسَ مونث ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَفَلَتْ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ شمس کی تانیث اس کی تفخیم اور اس کی عظمت کے سبب ہے۔ اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: رجل نسابة وعلامة اور کہا: هٰذَا رَبِّيْ اس کا معنی ہے: هذا الطالع ربي (کیا یہ طلوع ہونے والا میرا رب ہے)۔ کسائی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: هذا الضوء (کیا یہ روشنی میرا رب ہے)۔ ابوالحسن علی بن سلیمان نے کہا ہے: ای هذا الشخص (کیا یہ شخص میرا رب ہے)، جیسا کہ اعشیٰ نے کہا:

قامت تبكّيه على قبره  مَن لِيَ مِنْ بعدِك يا عامرُ
تركتَنِي في الدار ذا غُرْبَةٍ  قد ذَلَّ من ليس له ناصرُ

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

''بے شک میں نے پھیر لیا ہے اپنا رخ اس ذات کی طرف جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو یکسو ہو کر اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ یعنی میں نے اپنی عبادت اور توحید سے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کا قصد کیا۔

آیت میں الوجہ کا ذکر کیا کیونکہ چہرہ ان اعضاء میں سے زیادہ ظاہر ہے جن سے انسان پہچانا جاتا ہے۔ حَنِيْفًا اس کا معنی ہے حق کی طرف مائل ہوتے ہوئے۔ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ ما کا اسم اور خبر ہے۔ اور جب تو وقف کرے تو کہے: أنا تو تو نے بیان حرکت کے لیے الف کا اضافہ کر دیا اور یہی صحیح لغت ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں:

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 77

أن۔ اور کسائی نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: أنہ یہ تین لغات ہیں۔

اور حالت وصل میں تین لغات ہیں کہ درج کلام میں الف کو حذف کر دیا جائے، کیونکہ یہ حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے زائد کیا گیا ہے۔ اور عربوں میں سے بعض حالت وصل میں الف کو ثابت رکھتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

أنَا سَیف العشِیرة فأعرفونی

اور یہی بعض بنی قیس اور ربیعہ کی لغت ہے۔ یہ فراء سے منقول ہے اور بعض عرب حالت وصل میں کہتے ہیں: آن فعلت، مثلاً عان فعلت، اسے کسائی نے بعض قضاعہ سے بیان کیا ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۸۰

"اور جھگڑنے لگی ان سے ان کی قوم، آپ نے کہا: کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے ہدایت دے دی ہے مجھے۔ اور نہیں ڈرتا میں ان سے جنہیں تم شریک بناتے ہو اس کا، مگر یہ کہ چاہے میرا ہی پروردگار کوئی تکلیف پہنچانا، گھیرے ہوئے ہے میرا رب ہر چیز کو (اپنے) علم سے تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ یہ جھگڑنے اور جدال کرنے پر دلیل ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں آپ سے جھگڑا کیا۔ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ نافع نے نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے نون کو مشدد پڑھا ہے۔ اور اس میں ابن عامر سے ہشام کی روایت مختلف ہے۔ جس نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہے: اس میں اصل دو نون ہیں۔ پہلی علامت رفع ہے اور دوسری فعل اور یا کے درمیان بطور فاصلہ ہے، پس جب فعل میں دو ہم مثل حرف جمع ہو گئے اور وہ ثقیل ہو گئے تو ایک نون کو دوسری میں ادغام کر دیا گیا چنانچہ تشدید واقع ہو گئی اور واؤ کو مد کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے تاکہ التقائے ساکنین نہ ہو، ایک واؤ اور دوسرا مشدد حروف میں سے پہلا۔

پس یہ مد دو ساکنوں کے درمیان فاصلہ ہو گئی۔ اور جنہوں نے تخفیف کی ہے انہوں نے اجتماع مثلین کو خفیف سمجھتے ہوئے دوسرے نون کو حذف کر دیا ہے اور پہلی کو حذف نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ رفع کی علامت ہے۔ اور اگر اسے حذف کر دیا جائے تو مرفوع، مجزوم اور منصوب کے ساتھ مشتبہ ہو جائے گا۔ اور ابو عمرو ابن العلاء سے بیان کیا گیا ہے کہ قرأت غلط ہے۔ اور سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: انہوں نے تضعیف (مضاعف) کو ثقیل سمجھا ہے۔ اور شعر بھی کہا ہے:

تراہ کالثَّغامِ یُعَلُّ مِسْکًا　　یَسوء الفالِیاتِ إذا فَلَیْنِی

قولہ تعالیٰ: وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ یعنی کیونکہ وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

اور انہوں نے آپ کو اپنے الہوں کی کثرت کے سبب خوفزدہ کیا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دے اور اسے قدرت دے دے تو اس وقت اسے اس کے ضرر اور نقصان کا خوف ہو گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا کا یہی معنی ہے۔ یعنی مگر یہ کہ میرا رب ہے کہ وہ مجھے گناہ کے بدلے کوئی

تکلیف دہ شے اور مصیبت لاحق کرے، جس کے مطابق میں نے عمل کیا تو اس کی مشیت مکمل ہو گئی۔ یہ استثنا ہے یہ پہلے کلام میں سے نہیں ہے۔ اور بہ میں ہا ضمیر میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ معبود کے لیے ہو اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا کہ میں ان سے خوفزدہ ہوں، پھر فرمایا: وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا یعنی اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ كَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

”اور کیسے ڈروں میں (ان سے) جنہیں تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے حالانکہ تم نہیں ڈرتے (اس سے) کہ تم نے شریک بنایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسے کہ نہیں اتاری اللہ نے اس کے متعلق تم پر کوئی دلیل تو (تم ہی بتاؤ) دونوں فریقوں سے کون زیادہ حق دار ہے امن (وسلامتی کا) اگر تم (کچھ) جانتے ہو؟ وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لیے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ یہاں كَیْفَ میں انکار کا معنی ہے۔ یہ ان پر اس بات کا انکار ہے کہ وہ اسے بتوں سے ڈرا سکتے ہیں، حالانکہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، یعنی میں کیسے ڈروں ان سے جو مردہ ہیں، حالانکہ تم اس اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جو ہر شے پر قادر ہے۔

مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا اس میں سلطان کا معنی حجت اور دلیل ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ یعنی دونوں فریقوں میں سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن وسلامتی کا کون زیادہ حق دار ہے؟ کیا موحد یا مشرک۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اس میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت سلمان اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول میں سے ہے، جیسا کہ عالم سوال کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا قول ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے ساتھ جواب دیا جو ان پر حجت اور دلیل ہے۔ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔

اور صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر یہ خاصی شاق گزری، وہ کہنے لگے: ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟ تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ایسا نہیں جس طرح تم گمان کر رہے ہو بلکہ یہ تو اس طرح ہے جیسے لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝ (لقمان) (اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ

بنانا، یقیناً شرک ظلم عظیم ہے) وَهُم مُّهْتَدُونَ اور وہی دنیا میں ہدایت یافتہ ہیں۔(1)

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں۔ ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ اس میں تلک آپ کے تمام دلائل کی طرف اشارہ ہے، یہاں تک کہ آپ نے ان کے ساتھ جھگڑا کیا اور آپ دلیل کے ساتھ ان پر غالب رہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا یہ قول ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آپ کی ان کے خلاف وہ دلیل ہے کہ جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا آپ ڈرتے نہیں اس سے کہ ہمارے الٰہ آپ کو ہلاک کر دیں گے اس لیے کہ آپ انہیں سب وشتم کرتے ہیں؟ تو آپ نے ان کو جواب دیا: کیا تم ان سے ڈرتے نہیں جب کہ تم عبادت اور تعظیم میں چھوٹے اور بڑے کو مساوی قرار دیتے ہو، کہ بڑا غضب ناک ہو جائے گا اور وہ تمہیں ہلاک کر دے گا؟

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ یعنی ہم علم، فہم وفراست، امامت اور بادشاہی عطا فرما کر جس کے چاہتے ہیں درجات بلند فرما دیتے ہیں۔ قراء کوفہ نے درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل سورۂ یوسف میں بھی ہے انہوں نے فعل کو مَنْ پر واقع کیا ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے: وَنَرْفَعُ مَنْ نَشَاءُ اِلٰی دَرَجَاتٍ پھر الی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اہل حرمین اور ابو عمرو نے اضافت کی بنا پر بغیر تنوین کے پڑھا ہے، اس میں فعل درجات پر واقع ہے، اور جب درجات بلند کیے گئے تو صاحب درجہ کو بلند کر دیا گیا۔ اس قرأت کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ (غافر: 15) تقویت دیتا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَهٗ (اے اللہ! اس کا درجہ بلند فرما) اس کے لیے باعث تقویت ہے، پس بلندی کی نسبت درجات کی طرف فرمائی۔ اور وہی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے (وہی) اپنے شرف وفضل میں رفیع اور بلند ہے۔ پس دونوں قرأتیں باہم متقارب ہیں، کیونکہ جس کے درجات بلند کر دیئے گئے تحقیق اسے بلند کر دیا گیا، اور جسے بلند کر دیا گیا تحقیق اس کے درجات بلند کر دیئے گئے۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ ہر شی کو اس کے محل میں رکھتا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ لقمان، باب لا تشرک باللہ، حدیث نمبر 4403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری

اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ۭ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے عطا فرمائے انہیں اسحاق اور یعقوب ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی تھی ان سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (راہ راست دکھائی) اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو۔ اور (ہم نے ہدایت دی) زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔ اور (ہدایت دی) اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ان سب کو ہم نے فضیلت دی سارے جہان والوں پر''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ یعنی ہم نے انہیں دین کے بارے میں استدلال کرنے (غلبہ پانے) اور دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کی جزا کے طور پر اسحاق اور یعقوب علیہما السلام عطا فرمائے۔

كُلًّا هَدَيْنَا یعنی ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ ہے۔ اور (ترکیب کلام میں) كُلًّا، هَدَيْنَا کی وجہ سے منصوب ہے اور نُوْحًا دوسرے هَدَيْنَا کے سبب منصوب ہے۔ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے اور طبری اور کئی دیگر مفسرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے مثلاً قشیری اور ابن عطیہ وغیرہ نے۔

اور پہلا قول زجاج نے کیا ہے، اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس ذریت میں حضرت یونس اور حضرت لوط علیہما السلام کو بھی شمار کیا گیا ہے اور وہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں حضرت لوط علیہ السلام آپ کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بھانجے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ تمام کے تمام انبیاء علیہم السلام ذریت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اگرچہ ان میں وہ بھی ہیں جو باپ اور ماں کی جہت سے ولادت کے اعتبار سے آپ کے ساتھ نہیں ملتے، کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے اور عرب چچا کو اب (باپ) ہی شمار کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے بارے خبر دی کہ انہوں نے کہا: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ (البقرہ: 133) (ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم واسماعیل اور اسحاق کے خدا کی)

اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ آپ ان کی بیٹی کے بیٹے (نواسے) تھے۔ اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اولاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہے اور اسی سے انہوں نے استدلال کیا ہے جن کی یہ رائے ہے کہ بیٹیوں کی اولاد اسم الولد (مراد لفظ الولد) میں داخل ہوتی ہے (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 317

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جس نے ولدہ وولد ولدہ پر کچھ وقف کیا تو اس میں بیٹوں کی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد بھی نسل میں داخل ہوگی۔ اور اسی طرح جب کسی نے اپنے قرابت داروں کے لیے وصیت کی تو اس میں بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرابت سے مراد ہر ذی رحم محرم ہے۔ اور آپ کے نزدیک چچا کا بیٹا، پھوپھی کا بیٹا، ماموں کا بیٹا، خالہ کا بیٹا یہ بھی اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ محرم نہیں ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قرابت کا اطلاق ہر ذی رحم محرم اور دوسروں پر ہے۔ پس آپ کے نزدیک نہ ابن العم ساقط ہوا اور نہ کوئی اور۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہ ہوگی۔ اور اس کا قول: لقرابتی وعقبی۔ اس کے قول لولدی وولد ولدی کی طرح ہے۔ اس میں بیٹوں کی اولاد داخل ہوتی ہے اور اس کی جو باپ کے عصبہ اور صلب کی طرف راجع ہوتا ہے، اور اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں ہوتی۔ اس طرح کا بیان حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (النساء: 11) (حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں) اور مسلمانوں نے ظاہر آیت سے صرف صلبی اولاد اور خاص کر بیٹوں کی اولاد ہی سمجھا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى (الانفال: 41) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرابت داروں کو عطا فرمایا، ان میں سے آپ کے چچا ہیں نہ کہ آپ کے ماموؤں کی اولاد۔ پس اسی طرح بیٹیوں کی اولاد بھی نسب کے اعتبار سے آپ کی طرف منسوب نہیں ہوتی، اور نہ وہ لفظ اب میں آپ کے ساتھ ملیں گے۔ ابن القصار نے کہا ہے: جنہوں نے بیٹیوں کو اقارب میں داخل کیا ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے فرمایا: اِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ (بلاشبہ یہ میرا بیٹا سردار ہے) اور ہم کسی کو نہیں جانتے جو بیٹیوں کی اولاد کے بارے یہ کہنے سے روکتا ہو کہ وہ ان کی ماں کے باپ کی اولاد ہے۔ اور معنی اسی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ ولد، تولد سے مشتق ہے۔ اور وہ بالیقین ان کی ماں کے باپ سے متولد ہیں۔ اور ماں کی جہت سے متولد ہونا باپ کی جہت سے متولد ہونے کی طرح ہے۔ اور اس پر قرآن کریم بھی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۚ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آپ کی ذریت میں سے بنایا گیا ہے، حالانکہ وہ آپ کی بیٹی کے بیٹے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ان اسماء میں سے جو غیر منصرف ہیں ان کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے اور داؤد منصرف نہیں، کیونکہ عجمی اسم ہے، اور جب یہ فاعول کے وزن پر ہو تو اس میں الف لام لگانا اچھا نہیں ہوتا لہٰذا یہ منصرف نہیں۔ اور الیاس بھی عجمی اسم ہے۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اور قلبی نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے نواسے تھے۔

اعرج، حسن، اور قتادہ نے وَالْيَاسَ کو الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور اہل حرمین، ابو عمرو اور عاصم نے وَالْيَسَعَ کو لام مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا کوفیوں نے واللَّيْسَع پڑھا ہے۔ اور اسی طرح کسائی نے بھی قرأت کی

ہے اور اس کی قرأت کا رد کیا ہے جس نے وَالْيَسَعَ پڑھا ہے۔ کہا: کیونکہ الیفعل نہیں کہا جا سکتا جیسا الیحیی نہیں کہا جا سکتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: الیعمل اور الیحمد اور اگر یحییٰ کو نکرہ قرار دیا جائے تو پھر یقیناً تو الیحیی کہے گا۔ اور ابو حاتم نے اس کا رد کیا ہے جس نے اللَّيْسَع پڑھا ہے اور کہا ہے: لَيْسَع نہیں پایا جاتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ کلام عرب میں حیدر اور زینب موجود ہے۔ اس میں حق بات یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے، اور عجمہ قیاس کے ذریعہ نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ سماعاً لیا جاتا ہے اور عرب کثرت سے تغیر و تبدل کرتے ہیں۔ اور ایک اسم کا دو لغتوں میں آنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ کی نے کہا ہے: جس نے دو لاموں کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی اصل لَیْسَع ہے، پھر اس پر الف لام تعریف کا داخل کر دیا گیا۔ اور اگر اس کی اصل یسع ہوتی تو پھر اس پر الف لام داخل نہ ہوتا، کیونکہ یہ (الف لام) یزید اور یشکر پر داخل نہیں ہوتا۔ یہ دونوں دو آدمیوں کے نام ہیں، کیونکہ یہ دونوں معرفہ اور علم ہیں۔ اور رہا لَیْسَع تو یہ نکرہ ہے تو اس پر الف لام تعریف کے لیے داخل ہو سکتا ہے، اور ایک لام کے ساتھ قرأت کرنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اکثر قرأت اسی کے مطابق ہے۔ اور مہدوی نے کہا ہے: جس نے ایک لام کے ساتھ الیسع پڑھا ہے تو اس میں اسم یسع ہے، اور اس پر الف لام زائدہ داخل کر دیا گیا ہے جیسا کہ الخمسة عشر میں الف لام زائدہ ہے اور اسی طرح اس قول میں بھی ہے:

وجدنا اليزيد بن الوليد مباركاً　　شديدا بأعباء الخلافة كاهلهُ

اس میں الیزید پر الف لام زائدہ ہے۔

اور انہوں نے فعل مضارع پر بھی الف لازم زائدہ داخل کیا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

فيستخرج اليربوع من نافقائه　　ومن بيته بالشيخة اليتقصعُ

اس میں مراد الذی یتقصعُ ہے۔

قشیری نے کہا ہے: اسے لام کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور معنی ایک ہے، کیونکہ یہ ایک مشہور و معروف نبی علیہ السلام کا اسم گرامی ہے، جیسا کہ اسماعیل اور ابراہیم علیہما السلام، لیکن یہ ان اسماء سے خارج ہے جو الف لام داخل کرنے کے سبب اسماء عجمیہ ہیں۔ اور ایک قوم کو وہم ہوا ہے کہ الیسع الیاس علیہ السلام ہیں، حالانکہ اس طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے۔ اور وہب نے کہا ہے، الیسع صاحب الیاس تھے، اور یہ دونوں حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الیاس ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے دادا تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ الیاس ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نہیں، بلکہ حضرت الیسع حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

اور ''لوط'' عجمی اسم ہے اور اپنے خفیف ہونے کی بنا پر منصرف ہے۔ اس کا مادہ اشتقاق عنقریب سورۃ اعراف میں آئے گا۔

وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ وَ هَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

''اور ہدایت دی ان کے کچھ باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کو اور ہم نے چن لیا ان (سب) کو

اور ہدایت دی ان (سب) کو راہ راست کی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اس میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ہم نے ان کے باپ دادوں، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو ہدایت دی۔

وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں خالص کر دیا، اور یہ اہل لغت کے نزدیک بمعنی اخترناھم (ہم نے انہیں چن لیا) ہے۔ یہ جَبَیْتُ الماءَ فی الحوض سے مشتق ہے یعنی میں نے پانی حوض میں جمع کر لیا۔ اور اجتباء کا معنی وہ شی ہے جسے تو چن رہا ہے اسے اپنے خواص کے ساتھ ملا رہا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: جَبَیْتُ الماءَ فی الحوض جبیا یہ مقصود ہے (یعنی میں نے پانی کو حوض میں بند کر دیا) اور الجابیہ کا معنی حوض ہے، جیسے کسی نے کہا:

کجابیۃ الشیخ العراقی تفھق

اور اصطفاء اور ھدایۃ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۸۸

''یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ جس کی چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتا ان سے وہ (عمل) جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا یعنی اگر وہ میرے سوا کسی کی عبادت کرتے تو یقیناً ان کے اعمال ضائع ہو جاتے، لیکن میں نے انہیں محفوظ رکھا، بچا لیا۔ حبوط کا معنی بطلان (باطل ہونا) ہے۔ اس کا بیان سورہ البقرہ میں گزر چکا ہے(1)۔

اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَ كَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ۝۸۹

''یہ وہ لوگ تھے ہم نے عطا کی تھی جنہیں کتاب اور حکمت اور نبوت تو اگر انکار کریں اس کا یہ (مکہ والے) تو ہم نے مقرر کر دیئے ہیں اس کو ماننے کے لیے ایسے لوگ جو اس کے ساتھ سفر کرنے والے نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ترکیب کلام میں یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور حکم کا معنی علم اور فقاہت ہے۔ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا تو اگر وہ ہماری آیات کا انکار کریں۔ هٰۤؤُلَآءِ آپ کے زمانے کے کفار اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم۔ فَقَدْ وَ كَّلْنَا یہ جواب شرط ہے۔ یعنی تو ہم نے اس کے ساتھ ایمان لانے کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ مراد اہل مدینہ میں سے انصار ہیں اور اہل مکہ میں سے مہاجرین ہیں۔

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 455

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے بعد فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

ابورجاء نے کہا ہے: مراد ملائکہ ہیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ جن وانس اور ملائکہ میں سے ہر مومن کے لیے عام ہے۔ اور بِكٰفِرِيْنَ میں باز ائدہ ہے اور برائے تاکید ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ ۹۰

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہدایت دی تھی اللہ نے تو انہیں کے طریقے کی پیروی کرو۔ آپ فرمایئے: میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ قرآن) پر کوئی اجرت، نہیں ہے وہ (قرآن) مگر نصیحت سارے جہانوں کے لیے''

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اقتدا کا معنی ہے: طلبُ موافقةِ الغیرِ فی فعلِهِ کسی غیر کے فعل میں اس کی موافقت اور پیروی کرنا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اِصْبِرْ كَمَا صَبَرُوْا تم صبر کرو جیسے انہوں نے صبر کیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کا معنی ہے تم توحید اور احکام شرعیہ میں ان کی پیروی کرو، حالانکہ وہ احکام مختلف ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت سے ان انبیاء علیہم السلام کی شرائع کی پیروی اور اتباع واجب ہونے پر استدلال کیا ہے ان امور میں جن میں نص موجود نہیں۔

جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک آدمی کو زخمی کر دیا تو ان کا جھگڑا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قصاص لازم ہے، قصاص لازم ہے''۔ تو ام الربیع نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فلانہ سے قصاص لیا جائے گا؟ قسم بخدا اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ اے ام الربیع! قصاص تو کتاب اللہ کا حکم ہے''۔ اس نے عرض کی: قسم بخدا! اس سے کبھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔

راوی نے بیان کیا: پس وہ اپنے (موقف پر) قائم رہی یہاں تک کہ انہوں نے دیت کو قبول کر لیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انّ من عبادِ اللهِ مَنْ لو أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا لیں تو وہ اسے یقیناً پوری فرما دیتا ہے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس قول باری تعالیٰ پر موقوف کر دیا۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الآیہ (المائدہ: 45) (اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لیے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان)۔

اور کتاب اللہ میں اس آیت کے سوا کہیں بھی دانت کے قصاص کے بارے کوئی نص موجود نہیں، اور یہ تورات کے حکم کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 389

بارے خبر ہے اور اس کے باوجود آپ نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اور اس پر اسے موقوف کر دیا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے بڑے بڑے اصحاب نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اور یہ کہ جو کچھ اس میں پایا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ ابن بکیر نے کہا ہے: یہی وہ ہے جس کا تقاضا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کرتے ہیں اور اس میں بہت سے اصحاب مالک، اصحاب شافعی اور معتزلہ نے اختلاف کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ تقیید کا احتمال رکھتی ہے، سوائے ان امور کے جن کی اخبار تم پر بیان کی گئیں اور ان کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود نہیں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے سورۂ ص کے سجدہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ ''ص'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو یہ پڑھتا ہے وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۭ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ۭ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اور حضرت داؤد علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم تمہارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2۔** حمزہ اور کسائی نے اقْتَدِهْ ۭ قُلْ وصل کلام میں بغیر ہا کے پڑھا ہے اور ابن عامر نے اقتدهي قل قرأت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ ہا حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے ہوتی ہے اور ہا کے ساتھ اور نہ اس کے بعد کوئی واؤ یا یا مضمر ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ اور جس نے غلطی سے اجتناب کیا ہے اور سواد اعظم کی اتباع اور پیروی کی ہے تو اس نے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ پڑھا ہے۔ پس اس نے وقف کیا ہے اور وصل نہیں کیا، کیونکہ اگر وہ ہا کے ساتھ وصل کرے تو یہ غلطی ہے اور اگر اسے حذف کرے تو یہ سواد اعظم کی مخالفت ہے اور جمہور نے حالت وصل میں نیت وقف سے نہ نیت ادراج کی بنا پر رسم الخط میں اس کے ثابت ہونے کی اتباع کرتے ہوئے اسے ہا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن عیاش اور ہشام نے اقْتَدِهِ قُلْ ہا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ غلط ہے عربی میں جائز نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا یعنی میں تم سے اس (تبلیغ) قرآن پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ اِنْ هُوَ یعنی یہ قرآن نہیں ہے۔ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ مگر یہ مخلوق کے لیے نصیحت ہے۔ اور ہدایت کی نسبت ان کی طرف کی اور فرمایا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ان کے سبب ہدایت واقع ہونے کی وجہ سے (انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو) اور فرمایا: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، کیونکہ وہی ہدایت کا خالق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ص، حدیث نمبر 4433، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3388

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ۞

”اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا، جب کہا انہوں نے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی آدمی پر کوئی چیز (یعنی وحی)، آپ پوچھیے: کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے لے آئے تھے موسیٰ (جو سراسر) نور تھی اور (سراپا) ہدایت تھی لوگوں کے لیے تم نے بنالیا ہے اسے الگ الگ کاغذ ظاہر کرتے ہو اسے اور چھپالیتے ہو (اس کا) بہت سا (حصہ) اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا۔ آپ فرمادیجئے! پھر چھوڑ دیجئے انہیں (تاکہ) وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں“۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ یعنی اس حق کے بارے میں جو اس کے لیے واجب (ثابت) ہے اور جو اس کے لیے محال ہے اور جو جائز ہے (یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں واجب، محال اور جائز کی پہچان ہی نہیں کی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اس پر ایمان ہی نہیں لائے کہ وہ ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی عظمت کا حق تھا۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: لِفُلَانٍ قَدْرٌ (فلاں کی قدر اور عظمت ہے) اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انہوں نے کہا: مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نسبت اس طرف کردی کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی حجت قائم نہیں کرتا، اور نہ وہ انہیں ایسے امور کے بارے حکم دیتا ہے جن میں ان کی اصلاح اور فائدہ ہو۔ تو اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی تعظیم کا حق تھا اور نہ انہوں نے اس طرح اللہ تعالیٰ کو پہچانا جس طرح اسے پہچاننے کا حق تھا۔

اور ابوعبیدہ نے کہا: یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس طرح معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا۔ ما عرفوا اللہ حق معرفتہ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین معنی ہے، کیونکہ قدرت الشیٔ و قدرتہ کا معنی ہے میں نے اس کی مقدار کو پہچان لیا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ یعنی انہوں نے اس کی معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا، جب انہوں نے کوئی رسول بھیجے جانے کا انکار کیا۔ دونوں معنی باہم قریب ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی جس طرح ان کی قدر کرنے کا حق تھا۔ ابوحیوۃ نے وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدَرِهٖۤ دال کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ (1)

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 82

اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: (کہ یہ قول کہنے والے) مشرکین قریش ہیں۔ اور حسن اور سعید بن جبیر نے کہا ہے جس نے یہ قول کیا تھا وہ ایک یہودی تھا۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ سدی نے کہا ہے: اس کا نام فنحاص تھا(1)۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے بھی مروی ہے انہوں نے کہا: وہ مالک بن صیف تھا، وہ آیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنے لگا تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسے فرمایا: ''میں تجھے اس کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔ کیا تو تورات میں نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ انتہائی موٹے اور بھاری عالم کو مبغوض جانتا ہے''؟۔ وہ خوب موٹا عالم تھا، تو وہ غضب میں آ گیا اور کہنے لگا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ تو اس کے ساتھ موجود ساتھیوں نے اسے کہا: تیری ہلاکت اور بربادی ہو! کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نہیں؟ تو اس نے پھر کہا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نازل نہیں کی (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس کے قول کو توڑنے اور اس کے رد کے لیے فرمایا: قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ یعنی تم نے اسے الگ الگ کاغذ میں کر دیا ہے۔ (بمعنی فی قراطیس۔ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا یہ ان یہودیوں کے بارے ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور دیگر احکام کو چھپایا۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى یہ مشرکین کو خطاب ہے اور قولہ: تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ یہ یہودیوں کو خطاب ہے اور قول باری تعالیٰ: وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ اس کی قرأت کے مطابق صحیح ہو سکتا ہے جس نے یَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ یُبْدُوْنَهَا وَ یُخْفُوْنَ تمام کو یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تا کی قرأت کی بنا پر یہ تمام آیت یہود کے لیے ہوگی اور وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا کا معنی ہوگا۔ وعلمتم مالم تکونوا تعلمونہ انتم ولا اباؤکم (اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا) یہ معنی تورات نازل کرنے کے ساتھ ان پر احسان جتلانے کی بنا پر ہے۔ اور تورات کو صحف بنا دیا گیا اسی لیے ارشاد فرمایا: قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا یعنی تم کاغذات کو ظاہر کرتے ہو۔ اور یہ ان کی مذمت ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے قرآن کریم کو اجزاء میں لکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے وہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور یہ کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے۔ یا قل اللہ عَلَّمَكُمُ الكتاب یعنی آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتاب کا علم دیا ہے۔ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ یَلْعَبُوْنَ بمعنی لاعبین ہے۔ یعنی پھر تم اسے چھوڑ دو اس حال میں کہ وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں۔ اور اگر یہ جواب امر ہوتا تو پھر یلعبوا کہا جاتا۔ اور کلام کے معنی میں جھڑک اور تہدید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یجعلونہ۔

قول باری تعالیٰ: نُوْرًا وَّ هُدًى کے لیے محل صفت میں ہے اور پھر یہ صلہ میں ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مستانفہ ہو، اور تقدیر کلام ہوگی: یجعلونہ ذا قراطیس اور قول باری تعالیٰ: تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ یہ

---

1۔ تفسیر طبری، جلد، صفحہ 394

2۔ ایضاً

قراطیس کی صفت ہو، کیونکہ نکرہ کی صفت جملہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور اس کے جملہ مستانفہ ہونے کا احتمال بھی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹۲

''اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اس کو بابرکت ہے، تصدیق کرنے والی ہے اس (وحی) کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) اور اس لیے تا کہ ڈرائیں آپ مکہ (والوں) کو اور جو اس کے ارد گرد ہیں۔ اور جو ایمان لائے ہیں آخرت کے ساتھ وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر (بھی) اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هٰذَا كِتٰبٌ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَنْزَلْنٰهُ یہ صفت ہے مُبٰرَكٌ یعنی اس میں برکت رکھی گئی ہے اور برکت کا معنی زیادتی اور اضافہ ہے۔ اور غیر قرآن میں حال ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اسی طرح مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ہے۔ یعنی وہ کتب جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ (قرآن کریم) شرک کی نفی کرنے اور توحید کے اثبات میں ان کی موافقت کرتا ہے۔

وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہاں مراد اس کے باسی اور رہنے والے ہیں۔ پس اس میں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی ہم نے قرآن کریم برکت اور ڈرانے کے لیے نازل فرمایا۔ وَ مَنْ حَوْلَهَا مراد جمیع آفاق ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ان سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ اور اس کا ایمان تو معتبر اور کافی نہیں جو آخرت کے ساتھ تو ایمان لائے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا کہے کہ وحی کی گئی ہے میری طرف حالانکہ نہیں وحی کی گئی اس کی طرف کچھ بھی اور (کون زیادہ ظالم ہے اس سے) جو کہے کہ میں (بھی) نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے نازل کیا ہے اللہ نے۔ کاش! تم دیکھو جب ظالم موت کی سختیوں میں (گرفتار) ہوں اور فرشتے بڑھا رہے ہوں (ان کی طرف) اپنے ہاتھ (اور انہیں کہیں کہ) نکالو اپنی جان کو۔ آج تمہیں دیا جائے گا ذلت کا عذاب اس وجہ سے کہ تم بہتان لگاتے تھے اللہ تعالیٰ پر ناحق اور تم اس کی آیتوں (کے ماننے) سے تکبر کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ اَظْلَمُ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کوئی اس سے بڑھ کر ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰی اس سے جس نے جھوٹ گھڑا۔ عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ پس اس نے گمان کیا کہ وہ نبی ہے۔ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ (حالانکہ اس کی طرف کوئی شی وحی نہیں کی گئی)

یہ آیت رحمان الیمامہ، اسود عنسی اور مسیلمہ کی بیوی سجاح کے بارے نازل ہوئی، ان تمام نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور ہر ایک نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی ہے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل فرمائی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طریقہ سے جس نے فقہ، سنت اور اس طریقہ سے جس پر اسلاف عمل پیرا رہے، اعراض کر لیا تو وہ کہنے لگتا ہے: میرے دل میں اس طرح واقع ہوا ہے، یا میرے دل نے مجھے اس طرح خبر دی ہے، پس وہ اسی کے مطابق فیصلے کرنے لگتے ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں واقع ہوتا ہے اور ان کے احساسات میں جو ان پر غالب آجاتا ہے، اور وہ یہ مان کرنے لگتے ہیں کہ یہ ان کے دلوں کی کدورتوں سے صاف ہونے اور اغیار کے تصور سے ان کے خالی ہونے کے سبب ہے، پس ان کے لیے علوم الٰہیہ اور حقائق ربانیہ ظاہر ہو رہے ہیں، اور وہ کلیات کے اسرار پر واقفیت رکھتے ہیں اور جزئیات کے احکام جانتے ہیں پس وہ اس کے سبب تمام شریعتوں کے احکام سے مستغنی ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ احکام شرعیہ عام ہیں، ان کے ساتھ کند ذہنوں اور عام لوگوں پر حکم لگایا جاتا ہے، اور رہے اولیاء اور خواص لوگ تو وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہوتے۔ تحقیق اس میں آیا ہے جو وہ نقل کرتے ہیں کہ اپنے دل سے فتویٰ لو اگرچہ تجھے لوگوں نے فتویٰ دے رکھا ہو اور وہ اس پر حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ان علوم کے سبب جو ان پر ظاہر ہوئے اس سے مستغنی ہو گئے جو ان کا مفہوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھا۔ یہ قول زندقہ اور کفر ہے، اس کے قائل کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اور اس کے ساتھ سوال و جواب کی ضرورت اور حاجت نہ ہوگی، کیونکہ اس سے احکام کو گرانا (باطل کرنا) اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کو ثابت کرنا لازم آتا ہے۔ اس معنی کا مزید بیان عنقریب سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس میں مَنْ محل جر میں ہے۔ یعنی عبارت اس طرح ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ قَالَ سَاُنْزِلُ (اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے کہا میں بھی نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے اللہ نے نازل کیا ہے) اور اس سے مراد وہ عبد اللہ بن ابی سرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا، پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ اور اس کا سبب جو مفسرین نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب سورۃ المومنون کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے یہ آیت املا کرائی۔ جب آپ آخر میں اس قول تک پہنچے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (المومنون: 14) (پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا)

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 406

توعبداللہ نے انسان کی تخلیق کی تفصیل میں بڑا تعجب کیا اور یہ کہنے لگا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۝ (المومنون) (بڑا بارکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے)۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هكذا انزلت علی مجھ پر اسی طرح نازل کی گئی ہے۔ تو اس وقت عبداللہ کو شک لاحق ہو گیا اور اس نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو تحقیق میری طرف اسی طرح وحی کی گئی ہے جیسے ان کی طرف وحی کی گئی ہے، اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو تحقیق میں نے اسی طرح کہا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے۔ پس وہ اسلام سے مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ تو اسی کے بارے یہ قول ہے: وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اسے کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (1)۔ اور اسے محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے شرحبیل نے بیان کیا ہے کہ آیت وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی وہ اسلام سے مرتد ہو گیا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور عبداللہ بن خطل اور مقیس بن صبابہ کو قتل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اگرچہ یہ لوگ غلاف کعبہ کے نیچے پائے جائیں، تو عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھاگ گیا۔ آپ اس کے رضاعی بھائی تھے۔ اس کی ماں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا تھا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے چھپائے رکھا یہاں تک کہ اہل مکہ کے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور اس کے لیے امان طلب کی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر فرمایا نعم (ہاں)۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما صمتُّ إلّا ليقوم إليه بعضكم فيضرِبَ عُنُقَه (میں خاموش نہیں رہا مگر صرف اس لیے کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن کاٹ دے (یعنی اسے قتل کر دے)۔ تو انصار میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو کیوں آپ نے میری طرف اشارہ نہیں کر دیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ النبيَّ لا ينبغي أن تكونَ له خائنةُ الأعين (بلاشبہ نبی کے لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ اس کی آنکھ خیانت کرے) (2)

ابوعمر نے بیان کیا ہے: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ایام فتح میں اسلام لایا اور خوب اچھی طرح اسلام لایا، اور اس کے بعد اس سے کوئی ایسا فعل ظاہر نہیں ہوا جو ناپسندیدہ اور منکر ہو۔ وہ قریش کے نجباء، صاحب عقل اور کریم اور سخی لوگوں میں سے ایک تھا، اور بنی عامر بن لوئی کے شہسواروں میں شمار تھا، پھر اس کے بعد 25ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مصر کا والی مقرر فرمایا اور 27ھ میں اس کے ہاتھ پر افریقہ فتح ہوا اور وہاں سے اس نے 31ھ میں سرزمین نوبہ سے اساود کی جنگ لڑی، اور اس نے اس کے ساتھ ایسی صلح کی جو صلح آج دن تک باقی ہے۔ اور 34ھ میں ارض روم سے صواری کی جنگ لڑی اور جب یہ اپنے وفدوں کے ساتھ واپس لوٹا تو ابن ابی حذیفہ نے اسے فسطاط میں داخل ہونے سے روک دیا، پس وہ عسقلان کی طرف چلا گیا اور وہیں مقیم ہو گیا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ رملہ میں مقیم رہا یہاں تک کہ فتنہ سے بھاگتے ہوئے فوت ہو گیا۔ اور اس نے اپنے رب کریم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 407　　2۔ سنن ابی داؤد کتاب الجہاد، باب قتل الاسیر، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اس طرح دعا مانگی: اے اللہ! میرا آخری عمل صبح کی نماز کو بنادے۔ چنانچہ اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی اور پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ العادیات تلاوت کی، اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت پڑھی پھر اس نے اپنی دائیں طرف سلام پھیرا، پھر اپنی بائیں طرف سلام پھیرنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی۔

یہ سب یزید بن ابی حبیب وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور اس نے حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اس کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں کے اجتماع سے پہلے ہو چکی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ افریقہ میں فوت ہوئے۔ اور صحیح قول یہ ہے کہ ان کا وصال 36ھ یا 37ھ میں عسقلان میں ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ 36ھ میں فوت ہوئے۔ حفص بن عمر نے حکم بن ابان سے اور انہوں نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قرآن کریم کا معارض لایا اور اس نے کہا: والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا، فالخابزات خبزا، فاللاقمات لقما۔ (1)

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ، غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد سکرات الموت اور اس کی سختیاں ہیں۔ اور الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے۔ اور اس کی اصل وہ شی ہے جو چیزوں کو ڈھانک لیتی ہے اور انہیں چھپا لیتی ہے۔ اور اسی سے غَمَرَہُ الماءُ ہے (پانی نے اسے چھپا لیا) پھر یہ لفظ شدائد اور تکالیف کے معنی میں وضع کیا گیا۔ اور اسی لیے غمرات الحرب ہے (یعنی جنگ کی سختیاں)

جوہری نے کہا ہے: الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے اس کی جمع غُمَر ہے جیسا کہ نَوْبَۃ کی جمع نُوَب ہے۔ قطامی نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وحَانَ لِتالِكَ الغُمَرِ انحِسَارُ

اور غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد موت کی تکالیف اور سختیاں ہے۔ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ بَاسِطُوْۤا اصل میں باسطون تھا۔ کہا گیا ہے کہ فرشتے عذاب اور لوہے کے گرزوں کے ساتھ ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔

یہ حسن اور ضحاک سے مروی ہے اور یہ قول بھی ہے: ان کی ارواح قبض کرنے کے لیے (فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (الانفال: 50) (اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر) یہ آیت دونوں قولوں کو جمع کیے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے: بَسَطَ اِلَیهِ یَدَهُ بِالمَکرُوہِ (اس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ شدت اور سختی کے ساتھ آگے کیا)۔

اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنی جانوں کو عذاب سے خلاصی دلاؤ اگر تمہارے لیے ممکن ہو۔ اور یہ زجر و توبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم انہیں سختی کے ساتھ نکالو، کیونکہ بندۂ مومن کی روح اپنے رب کی ملاقات کے لیے بہت تیزی اور فرحت کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 459

ساتھ نکلتی ہے، اور کافر کی روح کو انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچ کر نکالا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے: اے خبیث نفس! تو نکل آ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی رسوائی کی طرف اس حال میں کہ تو بھی ناراض ہے اور وہ تجھ سے ناراض ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے (1)۔ اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قائل کے اس کے لیے اس قول کی مانند ہے جسے وہ عذاب دے رہا ہو: لَاُذِيقَنَّكَ العذاب وَلَاُخْرِجَنَّ نفسكَ (میں یقیناً تجھے عذاب چکھاؤں گا اور تیری جان کو نکالوں گا) اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ وہ خود اپنی جانوں کو نہیں نکالتے بلکہ حضرت ملک الموت علیہ السلام اور ان کے ساتھی اسے قبض کرتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ کفار کو کہا جائے گا اس حال میں کہ وہ آگ میں ہوں گے اور امر کے عظیم ہونے کی وجہ سے جواب امر محذوف ہے، یعنی اگر تو ظالموں کو اس حال میں دیکھے تو یقیناً تو نے بہت بڑے عذاب کو دیکھا ہے۔ اَلْهُوْنِ اور الھوان معنی میں دونوں برابر ہیں (رسوائی) اور تَسْتَكْبِرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کو قبول کرنے سے تکبر اور نفرت کرتے ہو۔

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۗ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

''اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ اور تم چھوڑ آئے ہو جو ہم نے عطا فرمایا تھا تمہیں اپنے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں۔ بے شک ٹوٹ گئے تمہارے سارے رشتے اور کھو گئے تم سے جو تم دعویٰ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى یہ حشر سے عبارت ہے اور فُرَادٰى حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث کا ہے۔ ابو حیوہ نے فراداً تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے، اور وہ محل رفع میں فراد نہیں کہتے۔ احمد بن یحییٰ نے فراد بغیر تنوین کے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: یہ ثلاث اور رباع کی مثل ہے۔ اور فرادی، فردان کی جمع ہے جیسا کہ سکاری، سکران کی جمع ہے اور کسالی، کسلان کی جمع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا واحد فرد ہے۔

اس میں راجز دم ہے اور فردرا کے کسرہ کے ساتھ۔ اور فرد را کے فتحہ کے ساتھ اور فرید ہے۔ اور معنی یہ ہے: تم ہمارے پاس آ گئے ہو اکیلے اکیلے، تم میں سے ہر ایک منفرد ہے گھر والوں، مال اور اولاد میں سے کوئی ساتھ نہیں، اور نہ ہی ان میں سے کوئی مددگار ہے جو گمراہی میں تمہارے مصاحب تھے، اور انہوں نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا تم عبادت کرتے رہے۔ اعرج نے فردی بغیر الف کے پڑھا ہے جیسا کہ سکری اور کسلی ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ، حدیث نمبر 4251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی جس طرح تم پہلی بار اکیلے اکیلے پیدا کیے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ننگے بدن جیسا کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکلے، ننگے پاؤں، غیر مختون، ایک رنگ (بے عیب) ان کے ساتھ کوئی شے نہ ہوگی۔ اور علماء نے کہا ہے: بندے کو کل (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اور اس کے وہ تمام اعضاء ہوں گے جو اس کی ولادت کے دن تھے۔ پس جس کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا قیامت کے دن وہ اس پر لوٹا دیا جائے گا۔ یہی معنی ہے آپ کے قول غُرْلًا کا یعنی غیر مختون، یعنی ختنہ کے وقت جو حصہ کاٹ دیا گیا تھا وہ ان پر واپس لوٹا دیا جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں عطا کیا اور ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ اور خول کا معنی ہے: وہ غلام اور دیگر نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ یعنی تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا۔

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کی تم پرستش کرتے رہے اور جنہیں تم نے میرا شریک بنایا۔ مراد بت ہیں، اور مشرک کہتے تھے: بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اور اس کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ نافع، کسائی اور حفص نے ظرف ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھا ہے یعنی بَيْنَكُمْ، معنی یہ ہے تحقیق تمہارے درمیان تمہارے رشتے ٹوٹ گئے۔

لقد تقطع وصلکم بینکم اور وصل کے حذف پر یہ قول دلیل ہے وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ پس یہ ان کے درمیان اور ان کے شرکاء کے درمیان تعلق منقطع ہونے اور ایک دوسرے کو چھوڑنے پر دلیل ہے، جب کہ انہوں نے ان سے برأت اختیار کر لی اور وہ ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ اور ان کے لیے ان کا مقاطعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان سے اپنا رشتہ اور تعلق چھوڑ دیا۔ پس تقطع کے بعد الوصل کو مضمر کرنا اچھا ہے، کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ما نصب پر دلالت کرتا ہے یعنی لقد تقطع ما بینکم اور اس میں سوائے نصب کے کوئی اور جائز نہیں۔ کیونکہ تم نے جسے قطع کیا ہے اس کو ذکر کر دیا ہے اور وہ ما ہے گویا کہ یہ کہا: لقد تقطع الوصل بینکم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے لقد تقطع الامر بینکم (معاملہ تمہارے درمیان کٹ گیا)۔ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔ اور باقیوں نے بینکم رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے یہ اسم ظرف نہیں، پس فعل کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے لہٰذا اسے رفع دیا گیا۔ اور بین کے اسم ہونے کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اس پر حرف جر داخل ہے: وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (فصلت:5) اور هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ (الکہف:78) اور یہ بھی جائز ہے کہ نصب کی قرأت رفع کے معنی پر ہو، اور اسے نصب اس لیے دی گئی کیونکہ اس کا اکثر استعمال ظرف منصوب کی بنا پر ہے، حالانکہ یہ محل رفع میں ہے اور یہی اخفش کا مذہب ہے۔ پس اس اعتبار سے دونوں قرأتیں ہم معنی ہیں، لہٰذا جس طرح چاہے قرأت کرو وَضَلَّ عَنْكُمْ اور تم سے کھو گئے۔ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (وہ سب) جن کے ساتھ تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔

روایت ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو عرض کی: یا رسول اللہ!

صلی اللہ علیہ وسلم کتنا برا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھ رہے ہوں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس دن ان میں سے ہر آدمی اپنی فکر میں ہوگا جو اسے مستغنی کر دے گی نہ مرد عورتوں کی طرف دیکھیں گے اور نہ عورتیں مردوں کی طرف دیکھیں گی، وہ ایک دوسرے سے مشغول (غافل) ہوں گے''۔ یہ حدیث صحیح میں ثابت ہے اور اسی کی ہم معنی روایت مسلم نے نقل کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی پھاڑنے والا ہے دانے اور گٹھلی کو، نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، یہ ہے اللہ پس کدھر تم بہکے چلے جا رہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ اللہ تعالیٰ کی صنعت وکاریگری کے عجائب کو شمار کیا گیا ہے جن میں سے ادنیٰ شی سے بھی ان کے الہ عاجز ہیں۔ الفلق کا معنی شق کرنا (پھاڑنا) ہے۔ یعنی وہ مردہ گٹھلی کو پھاڑتا ہے اور اس سے سبز پتے نکالتا ہے، اور اسی طرح دانہ بھی ہے اور وہ سبز پتوں سے مردہ گٹھلی اور دانے نکالتا ہے۔ اور یہی معنی ہے کہ وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ حسن اور قتادہ سے یہی منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَالِقُ کا معنی خالق ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فلق سے مراد وہ شق اور چیر ہے جو دانے اور گٹھلی میں ہوتا ہے اور النوی، نواۃ کی جمع ہے، اور یہ ہر اس شی میں جاری ہو سکتا ہے جس میں گٹھلی ہو مثلاً کشمش اور اخروٹ۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ وہ زندہ انسان کو مردہ نطفہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ نطفہ زندہ انسانوں سے نکالتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: والذی فلق الحبۃ وبرأ النسمۃ إنه لعهد النبی الأمی صلی اللہ علیه وسلم إلی أن لا یحبنی إلا مؤمن ولا یبغضنی إلا منافق (1) (قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور آدمی کو پیدا فرمایا! بلاشبہ اس نے میرے بارے میں حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا کہ مجھ سے سوائے مومن کے کوئی محبت نہیں کرے گا اور مجھ سے سوائے منافق کے کوئی بغض نہ رکھے گا)۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ یہ ترکیب کلام میں مبتدا اور خبر ہیں۔ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ پس تم حق سے کہاں پھرے جا رہے ہو اس کے باوجود کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت ملاحظہ کر رہے ہو؟۔

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ، الفصل الاول

الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾

''وہ نکالنے والا ہے صبح کو (رات کی تاریکی) سے اور بنایا ہے اس نے رات کو آرام کے لیے اور (بنایا ہے) سورج اور چاند کو حساب کے لیے یہ اندازہ ہے (مقرر کیا ہوا) سب سے زبردست سب کچھ جاننے والے کا''۔

قولہ تعالیٰ: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی نعت (اور صفت) ہے، یعنی ذالکم اللہ ربکم فالق الاصباح۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے إن اللہ فالقُ الإصباح (بے شک اللہ تعالیٰ صبح کو نکالنے والا ہے) الصبح اور الصباح سے مراد اوّل النہار (دن کا پہلا حصہ) ہے، اور اسی طرح الْاِصْبَاحِ بھی ہے۔ یعنی وہ ہر دن صبح کو نکالنے والا ہے، مراد فجر ہے۔ اور الْاِصْبَاحِ، أصبح کا مصدر ہے۔ اور معنی ہے: وہ تاریکیوں سے روشنی کو پھاڑ کر نکالنے والا اور اسے ظاہر کرنے والا ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کا معنی ہے خالقُ النھارِ (دن کو پیدا کرنے والا) یہ معرفہ ہے نحویوں میں سے کسی کے نزدیک اس میں تنوین جائز نہیں ہے۔

حسن اور عیسیٰ بن عمر نے فالقُ الاَصباح ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہ صبح کی جمع ہے۔ اعمش نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فلقَ الإصباحِ فعل کے وزن پر پڑھا ہے ہمزہ مکسور ہے اور حا منصوب ہے۔ حسن عیسیٰ بن عمر، حمزہ اور کسائی نے وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور دونوں مقامات میں فَالِقُ کے معنی پر محمول کرتے ہوئے الَّيْلَ کو نصب دی ہے، کیونکہ وہ بمعنی فلق ہے، کیونکہ وہ امر ہے جو ہو چکا پس اسے معنی پر محمول کیا گیا۔

اور یہ بھی کہ اس کے افعال ماضیہ ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ، اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً پس اوّل کلام کو آخر پر محمول کیا گیا ہے۔ فعل کو مضمر کرنے کی بنا پر الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کو نصب دینے پر ان کا اجماع اسے تقویت دیتا ہے۔ انہوں نے اسے فاعل پر محمول نہیں کیا کہ وہ اسے خبر دیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے اور نحاس نے کہا ہے: تحقیق یزید بن قطیب سکونی نے لفظ پر عطف کرتے ہوئے جر کے ساتھ اس طرح قرأت کی ہے وجاعلُ اللَّیلِ سکنًا والشمسِ والقمرِ حُسبانًا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مکی اور مہدوی وغیرہما قراء سبع کا اجماع مراد لیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور یعقوب نے اس سے رویس کی روایت میں وجاعلُ اللَّیلِ ساکنًا پڑھا ہے اور اہل مدینہ نے سکون کے محل کی وجہ سے وجاعلُ اللَّیلِ سکنًا پڑھا ہے۔ اور مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے یہ روایت ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے تھے اور کہتے تھے: اللھم فالقُ الإصباحِ وجاعلُ اللَّیلِ سکنًا والشمس والقمر حسبانًا إقضِ عَنِّی الدینَ وأَغْنِنِی من الفقرِ وأمتعنی بسَمْعِی وبَصَرِی وقُوّتِی فی سبیلك (اے اللہ! صبح کو نکالنے والے (رات کی تاریکی سے) اور رات کو بنانے والے آرام کے لیے اور سورج اور چاند کو بنانے والے حساب کے لیے! مجھ سے قرض ادا فرما دے اور مجھے فقر و افلاس سے غنی کر دے اور مجھے اپنے راستے میں میرے کانوں، میری آنکھوں اور میری قوت وطاقت کے ساتھ ہمیشہ فائدہ پہنچا)

اور اگر کہا جائے: کیسے یہ فرمایا: وأمتعنی بسَمْعِی وبَصَرِی اور نسائی اور ترمذی وغیرہما کی کتاب میں ہے واجعلْهُ الوارِثَ مِنِّی (اور اسے میرا وارث بنا دے) اور وہ تو بدن کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے؟ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ کلام

میں مجاز ہے اور معنی یہ ہے: اللھم لا تعدمہ قبلی (اے الله! اسے مجھ سے پہلے معدوم نہ کرنا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں سمع اور بصر سے مراد حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں، کیونکہ ان دونوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: هما السمع والبصر (1) (یہ دونوں کان اور آنکھ ہیں) یہ تاویل حقیقت سے بہت دور ہے، بلاشبہ ان دونوں سے مراد دو اعضاء ہیں (یعنی کان اور آنکھ) اور حُسْبَانًا کا معنی ہے یعنی ایسے حساب کے لیے جس کے ساتھ بندوں کے مصالح اور فوائد متعلق ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا کے تحت کہا ہے ای الحساب یعنی حساب لگانے کے لیے۔ اور اخفش نے کہا ہے: حسبان، حساب کی جمع ہے، جیسا کہ شہاب اور شہبان ہیں۔ اور یعقوب نے کہا ہے: حسبان مصدر ہے حسبتُ الشی کا أحسبه حسبانا وحسبانا وحسبة اور الحساب اسم ہے۔ اور ان کے سوا دوسرے نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے سورج اور چاند کی چال کو حساب کے مطابق رکھا ہے اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔

تو اس کے ساتھ الله تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وحدانیت پر دلیل بیان فرمائی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حُسْبَانًا کا معنی ضیا (روشنی) ہے اور الحسبان کا لغت میں معنی آگ ہے۔ تحقیق الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ (الکہف: 40) (اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حُسْبَانًا کا معنی نار (آگ) ہے۔ اور الحسبانۃ کا معنی ہے: چھوٹا تکیہ۔

**وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾**

''اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے ستاروں کو تاکہ سیدھی راہ معلوم کرسکو ان سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں، بے شک ہم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں دلائل ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ الله تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کو بیان فرمایا ہے اور ستاروں میں بہت زیادہ منافع اور فوائد ہیں۔ اس آیت میں ان کے بعض منافع ذکر فرمائے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی معرفت اور پہچان شرعاً مستحب ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ (الصافات) (اور اسے محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے) وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ (الملک: 5) (اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ) یہاں جَعَلَ بمعنی خلق ہے قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ یعنی ہم نے مفصل دلائل بیان کر دیئے ہیں تاکہ اعتبار میں یہ انتہائی بلیغ ہو جائیں۔ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ اہل علم کو اس لیے خاص فرمایا، کیونکہ یہی لوگ ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

**وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾**

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب مناقب ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما الفصل الثانی

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے پھر (تمہارے لیے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی، بے شک ہم نے تفصیل سے بیان کردی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) سمجھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ اس میں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ سورت کی ابتدا میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَمُسْتَقَرٌّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر، حضرت حسن، حضرت ابوعمرو، حضرت عیسیٰ، اعرج، شیبہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے، مگر جنہوں نے کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک تقدیر عبارت فمنها مستقر ہے اور جنہوں نے فتحہ دیا ہے ان کے نزدیک لها مستقر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس اس کے لیے ٹھہرنے کی جگہ ہے، رحم میں اور امانت رکھے جانے کی جگہ اس زمین میں ہے جس میں وہ مرے گا۔ یہ تفسیر قاف کے فتحہ پر دلالت کرتی ہے، اور حسن نے کہا ہے: پس ٹھہرنے کی جگہ قبر میں ہے۔ اور اکثر مفسرین کہتے ہیں: مستقر وہ جگہ ہے جو رحم میں تھی اور مستودع وہ ہے جو صلب میں تھی۔ اسے حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے مستقرٌ فی الأرض، و مستودعٌ فی الأصلاب (ٹھہرنے کی جگہ زمین میں ہے اور امانت رکھے جانے کی جگہ اصلاب میں ہے)(1)

حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے پوچھا کیا تو نے شادی کی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ تیری پشت سے انہیں نکالے گا جنہیں اس میں بطور ودیعت رکھا ہوا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مستقر وہ ہے جسے پیدا کیا جائے اور مستودع وہ ہے جسے پیدا نہ کیا گیا ہو۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: مستودع عند الله (اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھے جانے کی جگہ ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور قرآن کریم میں ہے وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (توبہ) (اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقرر تک) استیداع کا اشارہ ان کے قبر میں ہونے کی طرف یہاں تک کہ انہیں حساب کے لیے وہاں سے اٹھا لیا جائے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں پہلے ہو چکا ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ حضرت قتادہ نے فرمایا: فَصَّلْنَا کا معنی ہے ہم نے بیان کر دیا (اور ہم نے پختہ کر دیا یعنی بمعنی بیننا و قدرنا، واللہ اعلم)۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 435

''اور وہی ہے جس نے اتارا بادل سے پانی، تو ہم نے نکالی اس کے ذریعے سے اگنے والی ہر چیز پھر ہم نے نکال لیں اس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں، اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اس کے گابھے اور گچھے نیچے جھکے ہوئے اور (ہم نے پیدا کیے) باغات انگور اور زیتون اور انار کے بعض (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ دیکھو ہر درخت کے پھل کی طرف جب وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اس کے پکنے کو، بے شک ان میں نشانیاں ہیں (اس کی قدرت کاملہ کی) اس قوم کے لیے جو ایمان دار ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور وہی ہے جس نے بادل سے بارش نازل فرمائی۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اس کے ذریعے ہم نے اگنے والی چیزوں کی ہر قسم ہم نے نکالی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر حیوان کا رزق ہم نے نکالا۔ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا اخفش نے کہا ہے: یعنی اخضر (یعنی پھر ہم نے اس سے سبزہ نکالا) جیسا کہ عرب کہتے ہیں: أَرِنیھا نمرۃ أرِکھا مطِرۃ (مجھے بکھرے بادل دکھاؤ میں تمہیں بارش دکھاؤں گا، یعنی بکھرے بادل بارش ضرور برساتے ہیں) اور الخضر سے مراد سبزیوں کی ہریالی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس سے مراد گندم، جو، سفید جو، مکئی، چاول اور عام قسم کے دانے ہیں۔

نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا یعنی ان میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوتے ہیں جیسے سٹہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ فراء نے غیر قرآن میں ماقبل پر عطف کرتے ہوئے قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ پڑھنا جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: قُنوان۔ فراء نے کہا ہے: یہ بنی قیس کی لغت ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: قِنوان اور بنی تمیم کہتے ہیں: قنیان پھر واحد میں ان تمام کا اتفاق ہے۔ اور وہ کہتے ہیں: قِنْوٌ اور قُنْوٌ کھجور کا گابھا شگوفہ پھوٹنے سے پہلے بند ہوتا ہے۔ اور اغریض (شگوفہ) کو بھی طلع (گابھا) کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور طلع وہ ہے جو کھجور کا خوشہ دکھائی دیتا ہے۔ قنوان، قنو کی جمع ہے اور اس کا تثنیہ قنوان ہے جیسے صنو اور صنوان ہے (یہ نون کے کسرہ کے ساتھ ہے)۔ اور اس کی جمع بھی تثنیہ کے وزن پر آئی ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: تثنیہ صنوانِ ہے اور جمع صنوانٌ ہے (یعنی اس میں نون مرفوع ہے) اور القنو کا معنی ہے خوشہ۔ اور اس کی جمع القنوان اور الاقناء ہے، جیسے اس قول میں ہے: طویلۃُ الأقناء والأثاکل کسی اور نے کہا ہے: أقناء جمع قلت ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: ابن ہرمز نے قنوان قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے قاف کا ضمہ بھی مروی ہے اور فتحہ کی صورت میں یہ جمع غیر مکسر کا اسم ہے، یہ قائم مقام رکب کے ہے سیبویہ کے نزدیک، اور قائم مقام باقر اور حامل کے ہے۔ کیونکہ فعلان جمع کی امثلہ میں سے نہیں ہے اور قاف کو ضمہ اس بنا پر دیا گیا ہے کہ یہ قنو کی جمع ہے اور اس کا معنی خوشہ ہے یعنی العذق عین کے کسرہ کے ساتھ اور یہی کہاسہ ہوتا ہے اور یہی عنقود النخلہ (کھجوروں کا گچھا) ہے اور العَذق عین کے فتحہ کے ساتھ نفس کھجور کو کہتے ہیں (مراد کھجور کا پھل دار درخت ہے)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قنوان کا معنی کھجور کے درخت کا گوند بھی ہے۔ دَانِيَةٌ یعنی قریب۔ جنہیں کھڑے ہونے والا اور بیٹھنے والا سبھی حاصل کر سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم وغیرہما سے یہ مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ان میں سے کچھ قریب ہیں اور کچھ بعید ہیں۔ اور اسے کلام سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اسی کی مثل سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) بھی ہے۔

اور خاص طور پر قریب کا ذکر کیا ہے، کیونکہ آیت میں مقصود اپنی قدرت کا ذکر اور نعمت کے ساتھ احسان جتلانا ہے اور احسان اسی میں ہوتا ہے جو قریب ہو اور اکثر اسے حاصل کیا جا سکتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ یعنی ہم نے باغات پیدا کیے۔ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور اعمش رحمہم اللہ نے وَجَنّٰتٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں سے صحیح یہی ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے اس قرأت کا انکار کیا ہے، حتی کہ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ محال ہے، کیونکہ کھجوروں کے باغات نہیں ہوتے۔ نحاس نے کہا: قرأت جائز ہے اور تاویل اس طور پر نہیں ہے، بلکہ مبتدا ہونے کی بنا پر اسے رفع دیا گیا ہے اور خبر محذوف ہے (تقدیر عبارت ہے) ولهم جنات (اور ان کے لیے باغات ہیں) جیسا کہ قراء کی ایک جماعت نے وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (الواقعہ) پڑھا ہے۔ اور اس کی مثل کو سیبویہ، کسائی اور فراء نے جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور اسی بنا پر وحوذ اعینا بھی ہے اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

جئني بمثلِ بني بَدْرٍ لقومهم　　او مثلَ أُسْرَةِ مَنْظُورِ بن سيارِ

اور کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ، اخرجناها (یعنی انگور کے باغات ہم نے پیدا کیے) یہ اسی طرح ہے جیسے تمہارا یہ قول ہے: أكرمتُ عبدَالله وأخوه، اي وأخوه اكرمتُ ايضا (یعنی میں نے عبداللہ کی تکریم کی اور اس کے بھائی کی بھی ہم نے تکریم کی) اور رہے زیتون اور رمان کے الفاظ تو ان میں بالاجماع نصب کے سوا کوئی اعراب جائز نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَجَنّٰتٌ رفع کے ساتھ قنوان پر لفظاً معطوف ہے، اگرچہ معنی میں یہ اس کی جنس میں سے نہیں ہے۔ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ یعنی وہ پتوں میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، یعنی زیتون کے پتے تمام ٹہنی پر ہونے اور اپنے حجم کے اعتبار سے انار کے پتوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں لیکن ذائقے میں وہ ان جیسے نہیں ہیں۔ حضرت قتادہ وغیرہ سے یہ مروی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ دیکھنے میں ایک جیسے ہیں اور ذائقے میں ایک جیسے نہیں ہیں، جیسا کہ دو انار اپنے رنگ میں ایک جیسے ہوتے ہیں اور اپنے ذائقے میں مختلف ہوتے ہیں۔ انار اور زیتون کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں ان (عربوں) کے قریب تھے اور یہ دونوں ان کے نزدیک ذی قدر تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ (الغاشیہ) اس میں انہیں اونٹ کی طرف دیکھنے کی دعوت دی کیونکہ یہ ایسا جانور ہے جس کی پہچان وہ سب سے زیادہ رکھتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ یعنی تم عبرت کی نظر سے دیکھو نہ کہ ایسی نظر سے جو غور وفکر سے خالی ہو۔ اور ثمر لغت میں درخت چننے کو کہتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ثُمُرِهٖ تا اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں میں فتحہ پڑھا ہے اور یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ بقرۃ اور بقر، شجرۃ اور شجر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ثمر سے مراد مال کی مختلف اقسام ہیں۔ اور تمر سے مراد کھجور کا پھل ہے گویا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق معنی یہ ہوگا۔ دیکھو ان مالوں کی طرف جن سے پھل حاصل ہوتا ہے۔ ثمر ثا اور م دونوں کے ضمہ کے ساتھ ثمار کی جمع ہے اور اس سے مراد پھل دار مال ہے۔ اور اعمش سے ثُمْرہ ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمر ثَمَرۃ کی جمع ہو جیسا کہ بَدَنۃ اور بُدْن ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمُر جمع الجمع ہو، پس آپ کہیں گے: ثمرۃ و ثمار و ثمر جیسا کہ حمار اور حمر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ ثمرۃ کی جمع ہو جیسا کہ خشبۃ کی جمع خشب ہے نہ کہ جمع الجمع ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَنْعِهٖ محمد بن سمیقع نے ویانعہ پڑھا ہے اور ابن محیصن اور ابن ابی اسحاق نے ویُنْعِہ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض اہل نجد کی لغت ہے کہا جاتا ہے: یَنَعَ الثمر (پھل پک گیا) یَیْنَعُ اور الثمر یانع۔ أینع یونع (والثمر مُونِع)۔ اس کا معنی ہے پھل کا پک جانا۔ ینع اور أینع تب کہا جاتا ہے جب پھل پک جائے اور اسے پالیا جائے۔ حجاج نے اپنے خطبہ میں کہا تھا: أری رؤسا قد أینعت وحان قِطافها (میں بعض سروں کو دیکھ رہا ہوں وہ پک چکے ہیں اور انہیں توڑنے کا وقت آپہنچا ہے)۔

ابن الانباری نے کہا ہے: الینع یانع کی جمع ہے، جیسا کہ راکب اور رکبہ اور تاجر و تجر ہیں۔ مراد بہت زیادہ پکنے والا پھل ہے اور فراء نے کہا ہے: أینع، ینع کی نسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہے احمر (سرخ) اور اسی سے وہ بھی ہے جو حدیث ملاعنہ میں مروی ہے: إن ولدته أحمر مثل الینعة (اگر اس نے بچے کو پکے ہوئے پھل کی مانند سرخ جنا) اور یہی خرزہ حمراء (سرخ پتھر) ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ عقیق ہے یا اس کی کوئی قسم ہے۔

پس یہ آیت اس کے لیے دلیل ہے جس نے تدبر کیا اور قلب ونظر کے ساتھ دیکھا اور خوب نظر وفکر کرتے ہوئے دیکھا کہ تبدیلیوں کے لیے کسی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضرور ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ پس تم اسے دیکھتے ہو کہ یہ پہلے طلع (گابھا) ہے پھر جب گابھا پھٹ گیا تو یہ اغریض (شگوفہ) ہوگیا۔ اور اغریض کو ضحک کا نام بھی دیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد بلح پھر سیاب، پھر جدال جب کہ یہ سبز ہو اور گول ہو اس سے پہلے کہ یہ سخت ہو، پھر جب یہ بڑھ جائے تو بسر، پھر جب سرخ ہو جائے تو زہو کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: أزهی یُزهی، پھر جب اس میں پکنے کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو یہ مُوَکّت کہلاتی۔ اور اگر یہ آثار ذنب (پیچھے) کی جانب سے ظاہر ہوں تو یہ مُذَنِّب کہلاتی ہے اور یہی تَذْنُوب ہے پھر جب یہ نرم ہو جائے تو یہ ثَعْد کہلاتی ہے اور جب یہ نصف پک جائے تو اس کا نام مُجَزَّعة ہے اور جب دو تہائی تک پک جائے تو یہ حُلْقانہ کہلاتی ہے اور جب یہ ساری پک جائے تو یہ مُنْسِبة کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: رطب مُنْسَبت، پھر جب یہ

خشک ہو جاتی ہے تو تمر بن جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کر کے، اس میں تغیر اور تبدیلی لا کر اور عدم سے اسے وجود عطا کر کے اپنی وحدانیت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کیا ہے اور یہ کہ اسے بنانے والا قادر اور عالم ہے۔ اور یہ دوبارہ اٹھائے جانے کے جواز پر دلیل ہے۔ اس طرح کہ وہ نباتات کو خشک ہونے کے بعد پھر وجود اور تازگی عطا فرماتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: ینع الثمر ینیع و ینیع ینعا و ینعا و ینوعا اس کا معنی ہے پھل پک گیا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھی طرح پکنا وہ ہوتا ہے جو بغیر فساد کے ہو اور اس میں نقش (کانٹوں کے ساتھ سوراخ کرنا) نہ ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقش یہ ہے کہ اہل بصرہ پھل میں سوراخ کرتے تھے تاکہ اسے پکایا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پھل میں اس طرح سوراخ کر دیا جائے کہ اس میں ہوا تیزی سے داخل ہونے لگے پس اس طرح وہ جلدی پک جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس طرح پکنا مراد نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مراد ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کو مربوط کیا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسا پکنا ہے جو بالذات ہو اور بغیر کسی حیلہ کے ہو۔ اور انجیر وا۔ بعض شہروں میں جو (آب و ہوا کے اعتبار سے) ٹھنڈے ہیں، ان میں وہ پکتا نہیں یہاں تک کہ ان کے منہ میں ایک لکڑی سی داخل کی جاتی ہے درآنحالیکہ اسے تیل لگایا ہوتا ہے، پس جب وہ پک جاتا ہے تو اس کی بیع حلال ہوتی ہے، کیونکہ ایسا ہوا کی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے اور اہل شہر کی یہ عادت اور رواج ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ بروقت اچھے طریقہ سے پک کر تیار نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ ایسا پکنا ہے جس پر کھجوروں کی بیع کا جائز ہونا موقوف ہوتا ہے اور اسی کے سبب وہ کھانے کے قابل ہوتی ہیں اور وہ آفت کے سبب ضائع ہونے سے محفوظ ہوتی ہیں اور یہ ثریا (ستارہ) کے طلوع کے وقت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک عادت جاریہ قرار دیا ہے اور اسے اپنے علم و قدرت کے ساتھ محکم کر دیا ہے۔ معلّٰی بن اسد نے وہیب سے، انہوں نے عسل بن سفیان سے، انہوں نے حضرت عطاء سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب صبح کے وقت ثریا طلوع ہوتا ہے تو اہل علاقہ سے آفت کو اٹھا لیا جاتا ہے''۔ اور ثریا ستارہ ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا طلوع مئی کے مہینے کی گیارہ راتیں گزرنے کے بعد صبح کے وقت ہوتا ہے۔ اور بخاری میں ہے اور مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنی زمین کا پھل نہیں بیچتے تھے یہاں تک کہ ثریا طلوع ہو جاتا اور زردی سرخی سے واضح اور ظاہر ہو جاتی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جنہوں نے پھلوں میں آفات کو ساقط کیا ہے انہوں نے ان آثار سے اور ان کی مثل ارشادات نبویہ سے استدلال کیا ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے۔ اور پھلوں کی بیع کرنے سے آپ نے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان سے آفت اور ہلاکت کے آثار ختم ہو جائیں۔ عثمان بن سراقہ نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ایسا کب ہوتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب ثریا طلوع ہوتا ہے (1)۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 5012

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کے وضع اور ساقط کرنے کا حکم دیا ہو اور اگر میرے نزدیک ثابت ہوتا تو میں اسے نہ چھوڑتا، وہ اصل اور بنیاد جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ جس کسی نے کوئی ایسی شی خریدی جس کی بیع اور اس پر قبضہ جائز ہوتا ہے تو اس کی آفت اور بیماری اسی کے لیے ہوگی، فرمایا: اگر میں آفات کو ساقط کرنے کا قائل ہوتا تو میں اسے قلیل وکثیر مقدار میں ساقط کر دیتا۔ اور یہی قول امام ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔

امام مالک اور اکثر اہل مدینہ نے اس کی وضع کا موقف اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کی وضع کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے۔ اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اصحاب حدیث کا قول ہے۔ اور اہل ظاہر نے عموم حدیث کی بنا پر خریدی ہوئی شی سے اسے ساقط کیا ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے تب اس کا اعتبار کیا ہے جب آفت پھل کی تہائی یا اس سے زیادہ مقدار کو پہنچ جائے اور جو آفت تہائی سے کم مقدار میں ہو اسے انہوں نے لغو قرار دیا ہے اور اسے تابع قرار دیا ہے، کیونکہ کوئی پھل اپنی خوبی میں قلیل عذر سے خالی نہیں ہوتا اور اپنی تھوڑی مقدار میں فساد اور عیب پڑنے سے محفوظ نہیں ہوتا۔ اصبغ اور اشہب پھل کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ قیمت کی طرف دیکھتے تھے۔ جب قیمت تہائی یا زیادہ مقدار کو پہنچ جاتی تو وہ اس سے ساقط کر دیتے۔ اور ابن قاسم کے نزدیک تو آفت کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر یہ ہے کہ سرقہ (چوری) آفت نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں ہے اور کتاب میں یہ بھی ہے کہ وہ آفت ہے اور یہ ابن القاسم سے مروی ہے اور ان کے اصحاب اور لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور مطرف اور ابن الماجشون نے کہا ہے: آسمان سے پھلوں کو زیادہ تری (بارش) یا سردی یا خشکی یا گرمی یا آدمی کے اختیار اور عمل کے بغیر درختوں کا ٹوٹنا (یعنی آندھی اور طوفان کے سبب) لاحق ہوتا ہے وہ آفت ہے، البتہ خشکی کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور ابن القاسم کی روایت میں ہے کہ وہ بھی آفت ہے۔ اور سبزیوں کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی پھلوں کی طرح ہیں (اور ان میں بھی آفت کا اعتبار ہوتا ہے)۔ جس کسی نے پھل کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اسے بیچ دیا اس شرط پر کہ وہ اسے باقی رہنے دے گا تو اس کی بیع فسخ کر دی جائے گی اور مردود ہوگی، کیونکہ اس سے منع کیا گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانے کے مترادف ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تیرا کیا خیال ہے اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک لے تو کیونکر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا مال بغیر حق کے لے سکتا ہے؟''۔ یہ جمہور کا قول ہے، اسے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے صحیح قرار دیا ہے اور نہی کو کراہیت پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور نے پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع کو اس شرط پر جائز قرار دیا ہے کہ اسے توڑ لیا جائے۔ اور امام ثوری اور ابن ابی لیلیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں موجود نہی سے استدلال کیا ہے اور جمہور نے اسے قیاس جلی کے ساتھ خاص کیا ہے، کیونکہ اس میں مبیع معلوم ہے اور حالت عقد میں اس پر قبضہ صحیح ہوتا ہے پس اس کی بیع بھی دیگر تمام بیچی جانے والی چیزوں کی طرح صحیح ہوگی۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ

تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝

''اور بنایا انہوں نے اللہ کا شریک جنوں کو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے انہیں اور گھڑ لیے ہیں انہوں نے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں محض جہالت سے۔ پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ یہ ان کی جہالت کی دوسری نوع کا ذکر ہے، یعنی ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جنات میں سے شرکاء کا اعتقاد رکھ لیا ہے (یعنی انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا ہے)۔ نحاس نے کہا ہے: ترکیب کلام میں الْجِنَّ مفعول اوّل ہے اور شُرَكَآءَ مفعول ثانی ہے، جیسا کہ ان ارشادات میں ہے: وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ:20)، وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ (المدثر) اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: وَ جَعَلُوا لِلّٰهِ الْجِنَّ شُرَكَاءَ اور یہ بھی جائز ہے کہ الجنّ شرکاء سے بدل ہو اور مفعول ثانی لِلّٰهِ ہو۔ اور کسائی نے الجن پر رفع بھی جائز قرار دیا ہے تو پھر کلام اس طرح ہوگی هُمُ الْجِنُّ وَ خَلَقَهُمْ اسی طرح جمہور کی قرآت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنانے والوں کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ خَلَقَ الْجَاعِلِيْنَ لَهٗ شُرَكَاءَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خَلَقَ الْجِنَّ الشُّرَكَاءَ اور اسی نے شریک جنوں کو پیدا کیا ہے (یہ دراصل ضمیر کے مرجع کی طرف اشارہ ہے)۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے هو کی زیادتی کے ساتھ وهو خَلَقَهُمْ قرأت کی ہے، اور یحییٰ بن یعمر نے وَ خَلْقَهُمْ لام کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، اور کہا: ای وجعلوا خلقهم لله شركاء (اور انہوں نے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا) کیونکہ وہ چیزوں کو بناتے تھے پھر ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ یہ آیت مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور ان کے جنوں کو شریک ٹھہرانے کا معنی یہ ہے کہ وہ ان کی اطاعت و پیروی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن وغیرہ سے مروی ہے۔

حضرت قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ وہی ہیں جنہوں نے کہا ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت زنادقہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ کہتے: اللہ تعالیٰ اور ابلیس دونوں بھائی ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) پس اللہ تعالیٰ انسانوں اور جانوروں کا خالق ہے، اور ابلیس جنوں، درندوں اور بچھوؤں وغیرہ کا خالق ہے۔ اور اسی کے قریب قریب مجوسیوں کا قول بھی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: عالم کے دو صانع ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا شیطان ہے جو الٰہ قدیم کی فکر سے پیدا ہونے والا ہے۔ (یعنی وہ حادث ہے)۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ شر اور برائی کا صانع حادث ہے۔ اور معتزلہ میں سے حائطیہ جو کہ احمد بن حائط کے اصحاب ہیں نے بھی اسی طرح کہا ہے، ان کا گمان بھی یہ ہے کہ کائنات کو بنانے والے دو ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا محدث ہے، اسے پہلے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے پھر تدبیر عالم کا فریضہ اس کے سپرد کر دیا ہے اور یہ وہی ہے جو آخرت میں مخلوق کا محاسبہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند اور عظیم ہے جو کچھ ظالم اور انکار کرنے والے لوگ اس کے بارے کہتے ہیں۔

وَ خَرَقُوْا نافع نے تکثیر کی بنا پر اسے تشدید کے ساتھ (خَرَّقُوْا) پڑھا ہے، کیونکہ مشرکین نے دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی

بیٹیاں ہیں اور وہ ملائکہ ہیں اور انہوں نے انہیں چھپے جانے کے سبب جن کا نام دیا۔ اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور یہودیوں نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، پس اس طرح ان کا کفر کثیر ہو گیا۔ پس معنی کی مطابقت کی وجہ سے فعل کو مشدد لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے برتر اور بلند ہے جو وہ کہتے ہیں۔ باقیوں نے تقلیل کی بنا پر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے وَخَرَقُوْا لَهٗ کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ اور وخرقوا بالتخفیف، عربی کلمہ ہے، آدمی جب اپنی پکار اور دعویٰ میں جھوٹ بولے تو کہا جاتا ہے: خرقها ورب الکعبہ (اس نے اسے گھڑ لیا رب کعبہ کی قسم)

اور اہل لغت نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے اِخْتَلَفُوْا وافْتَعَلُوْا (انہوں نے اختلاف کیا اور فعل کیا) اور وخرقوا کثیر پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے انہوں نے جھوٹ بولا۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک خَرَقَ، اِخْتَرَقَ اور اِخْتَلَقَ کا معنی ایک ہی ہے، یعنی اَحْدَثَ (اس نے گھڑ لیا، اس نے جھوٹ بولا)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (101)

”موجد ہے آسمانوں اور زمین کا، کیوں کر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے“۔

قولہ تعالیٰ: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی وہ ان دونوں کو بنانے والا ہے، تو پھر کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ اور بَدِيْعُ مبتدا مضمر کی خبر ہے یعنی ھُوَ بَدِيْعٌ۔ کسائی نے للہ کی صفت ہونے کی بنا پر اس پر کسرہ بھی جائز قرار دیا ہے اور بمعنی بدیعا السموات والأرض اس پر نصب بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک یہ خطا ہے، کیونکہ یہ ماضی کے معنی کے لیے ہے (کیونکہ بصریوں کے نزدیک اسم فاعل جب آل کا صلہ نہ ہو تو عمل کے لیے دو شرطیں ہیں یا وہ بمعنی حال ہو یا بمعنی استقبال ہو۔ اور امام کسائی نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے جب یہ ماضی کے لیے بھی ہو)

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ یعنی کہاں سے اس کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور ہر شے کا بیٹا اس کے مشابہ ہوتا ہے، اور اس کی تو کوئی شبیہ نہیں ہے؟ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ عبارت عام ہے اور اس میں معنی خاص ہیں، یعنی اس نے عالم (کائنات) کو پیدا کیا ہے اس میں اس کا کلام داخل نہیں اور نہ اس میں اس کی ذاتی صفات داخل ہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف: 156) اس (رحمت) کی وسعت نہ ابلیس کو شامل ہے اور نہ ہی اسے جس کی موت حالت کفر پر ہو۔ اور اس کی مثل تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف: 25) بھی ہے (وہ ہر شئی کو برباد کر دے گا) حالانکہ اس نے آسمانوں اور زمین کو برباد نہیں کیا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

وَّ كِيْلٌ ۝

''یہ اللہ ہے (جو) تمہارا پروردگار ہے نہیں کوئی خدا سوائے اس کے پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا پس عبادت کرو اس کی اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، ذٰلِكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور اللّٰهُ رَبُّكُمْ بدل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَبُّكُمْ خبر ہو اور خَالِقُ دوسری خبر ہو، یا پھر اس کا مبتدا مضمر ہو، یعنی هُوَ خَالِقُ۔ کسائی اور فراء نے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

''نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو اور وہ بڑا باریک بین (اور) پوری طرح باخبر ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ حدوث کی علامات سے منزہ اور پاک ہے، اور انہیں میں سے ایک ادراک ہے اس کا معنی احاطہ کرنا اور حدود قائم کرنا ہے، جیسا کہ تمام مخلوقات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، اور رؤیت ثابت ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کی حقیقت کی کنہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدركتُ كذا وكذا (میں نے فلاں فلاں کی حقیقت کو پہچان لیا) کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ سے قیامت کے دن رؤیت کے بارے میں صحیح احادیث ثابت ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ نظریں دنیا میں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور آخرت میں مومنین اس کا دیدار کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اپنے اس ارشاد میں خبر دی ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (قیامہ) (کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)

اور سدی نے یہی کہا ہے اور یہی احسن ہے جو کہا گیا ہے، کیونکہ اس پر قرآن کریم بھی دال ہے اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے بارے اخبار بھی وارد ہیں۔ اس کا بیان عنقریب سورۂ یونس میں آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، حالانکہ وہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دلوں کی آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، یعنی عقلیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں کہ وہ اس کے بارے وہم میں مبتلا ہو جائیں۔ کیونکہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) (اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آنکھیں جو دنیا میں پیدا کی گئی ہیں وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن وہ جس کے لیے شرف و کرامت کا ارادہ فرماتا ہے اس کے لیے وہ نظر اور ادراک پیدا فرما دیتا ہے جس کے ساتھ وہ اسے دیکھ لیتا ہے جیسا کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں عقلاً جائز ہے، کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رؤیت کے بارے عرض کرنا امر محال ہوگا اور یہ محال ہے کہ نبی علیہ السلام اس سے ناواقف اور بے علم ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے

بارے میں کون سی چیز جائز ہے اور کون سی جائز نہیں ہے، بلکہ وہ تو عرض ہی نہ کرتے (تو ان کے عرض کرنے سے ثابت ہوا) کہ رؤیت جائز ہے محال نہیں ہے۔

ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے رب کی رؤیت کے بارے میں سلف نے اختلاف کیا ہے، پس صحیح مسلم میں حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تکیہ لگائے بیٹھا تھا، تو انہوں نے کہا: اے ابا عائشہ! (ابو عائشہ امام مسروق کی کنیت ہے) تین چیزیں ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں جس نے گفتگو کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟ انہوں نے کہا: جس نے یہ گمان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ مسروق نے کہا: میں تکیہ لگائے ہوئے تھا پھر میں سیدھا بیٹھ گیا اور میں نے کہا: اے ام المومنین! تم نظر و فکر کر لیجئے اور اتنی جلدی نہ کیجئے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ (التکویر) (اور بلاشبہ اس نے اسے دیکھا ہے روشن کنارے پر) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ (النجم) (اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا) تو انہوں نے فرمایا: میں اس امت میں سے پہلی ہوں جس نے اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ جبریل امین ہیں میں نے انہیں دو بار کے سوا اس صورت اور شکل میں نہیں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق فرمایا ہے، میں نے انہیں آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا کہ وہ اپنی خلقت کے عظیم ہونے کی وجہ سے زمین و آسمان کے مابین کو بھرے ہوئے تھے''۔ تو انہوں نے فرمایا: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ یا تو نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (الشوریٰ) (اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے)''۔

انہوں نے فرمایا: جس نے یہ خیال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ میں کسی شی کو چھپا کر رکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) اور مزید انہوں نے فرمایا: اور جس نے یہ خیال کیا کہ وہ آئندہ کل ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے)

عدم رؤیت اور جبرائیل امین کو دیکھنے کے جس نظریہ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اختیار کیا ہے وہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین کو دیکھا، اور ان دونوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اور محدثین، فقہاء اور متکلمین کی ایک جماعت نے اس کے اور امتناع رؤیت کے انکار کا قول

کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اِنَّهٗ رَاٰهُ بِعَیْنِهٖ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے رب کا دیدار کیا۔ آپ سے یہ روایت مشہور ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ (النجم) (نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ) نے)۔

اور عبداللہ بن حارث نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اکٹھے ہوئے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم بنی ہاشم کہتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبار اپنے پروردگار کو دیکھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم تعجب کر رہے ہو کہ خلت حضرات ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہے، کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے، اور رؤیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ فرمایا: پس حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا یہاں تک کہ پہاڑوں نے بھی اس کا جواب دیا، پھر فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت اور کلام کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی نصیب ہوا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف دیدار عطا ہوا۔ (1)

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ حسن اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتے تھے: تحقیق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ اور اسے ابو عمر طلمنکی نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، اور بعض متکلمین نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور ان سے پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور نقاش نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق کہتا ہوں: بِعَیْنِهٖ رَاٰهُ رَاٰهُ! حَتّٰی اِنْقَطَعَ نَفَسُهٗ۔ یعنی نفس احمد، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے (آپ مسلسل یہ کہتے رہے) یہاں تک کہ آپ کی سانس کٹ گئی یعنی حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سانس (اکھڑ گئی)۔

اور یہی موقف شیخ ابوالحسن اشعری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نظر کے ساتھ اور اپنے سر کی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَى اللّٰهَ بِبَصَرِهٖ وَعَيْنَيْ رَاْسِهٖ اور حضرت انس، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت عکرمہ، حضرت ربیع اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت حسن قسم کھایا کرتے تھے بِاللّٰهِ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَقَدْ رَاٰى مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عليه وَسَلَّمَ رَبَّهٗ (قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں یقیناً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے)

اور ایک جماعت نے کہا ہے ان میں سے ابو العالیہ، قرظی اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہم ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل (کی آنکھوں) کے ساتھ اپنے پروردگار کو دیکھا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہ بیان کیا گیا ہے اور ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ والنجم، حدیث نمبر 3200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کے ساتھ اسے دیکھا ہے، اور یہ دنیا میں آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے قول سے پیچھے ہٹ گئے (کمزور پڑ گئے) اور حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: دنیا میں اسے نہیں دیکھا گیا، کیونکہ وہ باقی رہنے والی ذات ہے اور باقی کو فانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب وہ آخرت میں ہوں گے اور انہیں باقی رہنے والی نظریں عطا کی جائیں گی تو پھر وہ باقی کو باقی کے ساتھ دیکھ لیں گے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کلام بہت خوب اور اچھا ہے، اور اس میں رؤیت کے محال ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے مگر صرف اس حیثیت سے کہ قدرت ضعیف اور کمزور ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے قوت عطا فرما دے اور رؤیت کے بوجھ کو اٹھانے پر اسے قادر کر دے تو اس کے حق میں رؤیت ممتنع نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اس بارے کچھ بیان عنقریب سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ یعنی اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اسے جانتا ہے، اور تجنیس کلام کے لیے ابصار کو خاص کیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کلام میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق آنکھوں کا ادراک نہیں کر سکتی، یعنی وہ بصر کی حقیقت کی کیفیت نہیں پہچان سکتے، اور وہ شے جس کے سبب انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے وہ دیکھنے کی شے ان دو کے سوا اس کے تمام اعضائے بدن میں نہیں ہے۔ پھر فرمایا: وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ یعنی وہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ کہا جاتا ہے: لَطُفَ فلانٌ بفلانٍ يَلْطُفُ یعنی اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا (مہربانی کی) اور اللُّطْفُ فِي الْفِعْلِ کا معنی ہے کام میں نرمی کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف کا مفہوم توفیق بخشنا اور بچانا ہے۔ اور أَلْطَفَهُ بِكَذا، یعنی اس نے اس کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کیا اور اس کا اسم اللَّطَف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاءتنا من فلانٍ لَطَفَة یعنی فلاں کی جانب سے ہمارے پاس ہدیہ آیا۔ اور ملاطفة کا معنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور مہربانی برتنا ہے۔

جوہری اور ابن فارس سے یہ منقول ہے، ابو العالیہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے وہ چیزوں کو نکالنے میں بڑا باریک بین اور ان کی جگہ سے باخبر ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لطیف وہ ہے جس نے تیرے دل کو ہدایت سے منور کر دیا، اور تیرے جسم کی غذا کے ساتھ تربیت اور نشوونما کی، اور اس نے تجھے مصیبت اور آزمائش میں ولایت عطا فرمائی، اور وہ تیری حفاظت کرتا ہے حالانکہ تو آگ (جہنم) میں گرتا ہے اور وہ تجھے جنۃ الماویٰ میں داخل کر دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے معنی بیان کیے گئے ہیں جو اتفاق اور دوسرے معنی کی طرف راجع ہیں۔ عنقریب سورۂ الشوریٰ میں اس کے بارے علماء کے اقوال آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴

''بے شک آئیں تمہارے پاس آنکھیں کھولنے والی دلیلیں اپنے رب کی طرف سے تو جس نے آنکھوں سے

دیکھا تو اس نے اپنا فائدہ کیا اور جو اندھا بنا رہا تو اس نے اپنا نقصان کیا اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان''۔

قولہ تعالیٰ: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی ایسی علامات اور دلائل جن کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ بَصَآئِرُ، بصیرۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی دلالت اور رہنمائی ہے، جیسا کہ شاعر کا قول بھی ہے:

جاؤا بصائرھم علی اکتافھم　　وبصیرتی یَعْدُو بھا عَتَدٌ وَأَی

بصیرۃ سے مراد حجت بینہ اور ظاہرہ ہے۔ اور دلیل کو تعظیم شان کے لیے مجئ (آنے) کی صفت کے ساتھ متصف کیا گیا، جب کہ یہ اس غائب کے قائم مقام ہے جس کا حاضر ہونا نفس کے لیے متوقع ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے: جاءتُ العافیۃُ وقد انصرفَ المرضُ (عافیت آئی اس حال میں کہ مرض چلا گیا) اور اَقبلَ السعُودُ وأدبرَ النَّحوسُ (سعادت آگئی اور نحوست چلی گئی۔)

فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ، الْاِبْصَارُ اس کا معنی ہے ھوالإ دراكُ بِحاسةِ البصرِ (آنکھ کے ساتھ کسی چیز کو دیکھنا، اس کا ادراک کرنا) پس جس کسی نے استدلال کر لیا اور پہچان لیا تو اس نے اپنے آپ کو نفع پہنچایا۔

وَ مَنْ عَمِیَ اور جس نے رہنمائی حاصل نہ کی تو وہ اندھے کے قائم مقام ہو گیا، تو اس اندھا بننے کا نقصان اور ضرر اس کی اپنی ذات کو ہوگا۔ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ یعنی میں نے اس پر تمہاری حفاظت اور نگہبانی کا حکم نہیں دیا کہ تم اپنے آپ کو ہلاک کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے عذاب سے میں تمہاری محافظت اور نگہبانی نہیں کروں گا۔ اور یہ قول بھی ہے: بِحَفِیْظٍ اس کا معنی برقیب (تاکنے والا) ہے۔ میں تم پر تمہارے اعمال کو شمار کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پیغامبر (رسول) ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، اور وہ تم پر نگہبان ہے اس پر تمہارے افعال و اعمال میں سے کوئی شے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ آیت فرضیت قتال سے پہلے نازل ہوئی، پھر آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں تلوار کی قوت کے ساتھ بتوں کی عبادت سے روکیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۝

''اور اسی طرح ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید) کی دلیلوں کو اور تا کہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے اور تا کہ ہم واضح کر دیں اس کو اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ، كَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے۔ یعنی نُصَرِّفُ الآیاتِ مثلَ مَاتَلَوْنَا عَلَیْكَ (یعنی ہم دلائل طرح طرح سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے آپ پر انہیں تلاوت فرمایا ہے) یعنی جیسا کہ ہم نے اس سورت میں وعدہ، وعید، وعظ اور تنبیہ کے بارے مختلف دلائل بیان کیے ہیں اسی طرح ہم انہیں دوسری سورتوں میں بھی بیان کریں گے۔ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ اس میں واؤ فعل مضمر پر عطف کے لیے ہے تقدیر کلام یہ ہے: ای نُصَرِّفُ الآیاتِ لِتَقُومَ الحجۃُ ولیقولوا دَرَسْتَ (ہم دلائل بیان کرتے ہیں تا کہ حجت قائم ہو جائے اور تا کہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ، صَرَّفْنَاهَا (تاکہ وہ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے ہم نے انہیں بیان کیا) تو اس صورت میں لام صیرورت کے لیے ہوگا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اسی طرح ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں: كَتَبَ فلانٌ هَذَا الكِتَابَ لِحَتْفِهِ (فلاں نے یہ تحریر اپنی موت کے وقت لکھی) یعنی اس کا حکم اس کی طرف لوٹ آیا۔ اور اسی طرح جب دلائل بیان کردیے گئے تو ان کا امر اس طرف لوٹ آیا کہ وہ کہیں: آپ نے خود پڑھ سنایا ہے اور آپ نے جبر و یسار سے خوب سیکھا ہے، اور یہ دونوں مکہ مکرمہ میں نصرانی غلام تھے، تو اہل مکہ نے کہا: بلاشبہ یہ ان دونوں سے پڑھتے ہیں (تعلیم حاصل کرتے ہیں)۔ نحاس نے کہا ہے: اس معنی میں دوسرا قول اچھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ کا معنی ہو کہ ہم اس کے بارے یکے بعد دیگرے دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ وہ کہہ اٹھیں: آپ نے ہمیں خوب پڑھ سنایا ہے۔ نَأْتِي بِهَا آيَةً بعدَ آيَةٍ لِيَقُولُوا دَرَسْتَ عَلَيْنَا پس وہ اوّل کو آخر کے ساتھ ملا کر ذکر کرتے ہیں اور یہی حقیقت ہے اور جو کچھ ابو اسحاق نے بیان کیا ہے وہ مجاز ہے۔

اور دَرَسْتَ میں سات قرأتیں ہیں۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے دارست دال اور را کے درمیان الف کے ساتھ قرأت کی ہے، جیسا کہ فاعلت اور یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم اور اہل مکہ کی قرأت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دارست کا معنی ہے تالیت (آپ نے خوب موافقت اور تابعداری کی ہے، پڑھ کر سنانے میں)۔ ابن عامر نے درست پڑھا ہے یعنی سین کے فتحہ اور تا کے سکون کے ساتھ بغیر الف کے جیسا کہ خرجت۔ اور یہ حسن کی قرأت ہے اور باقیوں نے درست پڑھا ہے، جیسا کہ خرجت۔ پس پہلی قرأت کے مطابق معنی ہوگا: دارست اهل الكتاب و دارسوك یعنی آپ نے ان (اہل کتاب) کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور اس معنی پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (الفرقان: 4) یعنی یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن پر معاونت کی اور انہوں نے اس بارے میں آپ سے مذاکرات کیے اور یہ سب مشرکین کا قول ہے اور اس کی مثال ان کا یہ قول ہے: وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (الفرقان) (اور کفار نے کہا: یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے اس شخص نے لکھوا لیا ہے انہیں، پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تاکہ ازبر ہو جائیں)۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (النحل) (اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے؟ کہتے ہیں: (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دارستنا تو پھر اس کا معنی درست کے معنی کی طرح ہو جائے گا، نحاس نے اسے ذکر کیا ہے اور اسے ہی پسند کیا ہے، اور پہلا معنی مکی نے ذکر کیا ہے۔ اور نحاس نے گمان کیا ہے کہ وہ مجاز ہے، جیسا کہ کسی نے یہ کہا ہے:

لِلْمَوتِ مَا تَلِدُ الوالِدَة

اور جنہوں نے درست پڑھا ہے تو اس قرآت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اچھا یہ ہے کہ معنی یہ ہو: وَلِئَلَّا يَقُولُوا انقطعت وامحت (تا کہ وہ کہہ اٹھیں: کٹ گیا اور مٹ گیا، اور محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں لائیں گے (1)۔

اور حضرت قتادہ نے دُرست پڑھا ہے بمعنی قرئت (پڑھا گیا): سفیان ابن عیینہ نے عمرو بن عبید سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے دارست پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ قرأت جائز نہیں۔ انہوں نے کہا: کیونکہ آیات تکرار اور مذاکرہ نہیں کرتیں۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس طرح قرأت جائز ہے، اور معنی وہ نہیں ہے جو ابو حاتم نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کا معنی ہے دارستْ امتك، ای دارستك أُمتك (آپ کی امت نے آپ کے ساتھ تکرار اور مذاکرہ کیا) اگرچہ اس کا ذکر پہلے نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ (ص) (پھر انہیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے) اور اخفش نے بیان کیا ہے وَلِيَقُولُوا دَرَسَتْ اور یہ بمعنی درستَ ہے مگر یہ زیادہ بلیغ ہے۔ اور ابو العباس نے بیان کیا ہے کہ وَلِيَقُولُوا دَرَسَتَ امر کی بنا پر لام کو ساکن پڑھا گیا ہے اور اس میں تہدید (جھڑک) کا معنی ہے، یعنی چاہیے کہ وہ جو چاہیں کہیں کیونکہ حق تو بین اور واضح ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا (توبہ: 82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ)۔

اور جنہوں نے لام کو کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک یہ لام کی ہے۔ ان تمام قرأتوں کا اشتقاق تو ایک شی کی طرف ہی راجع ہے، یعنی تلیین اور تذلیل کی طرف۔ اور درست، درس یدرس دراسة سے ہے، اور اس کا معنی ہے کسی غیر پر پڑھنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: درسته یعنی ذللته بكثرة القرأة (میں نے اسے کثرت قرأت کے سبب پامال کر دیا) اور اس کی اصل درس الطعام ہے یعنی گندم گہنا۔ اور دیاس کا معنی لغت شام کے مطابق دراس ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل درست الثوب أدرسه درسا سے ہے یعنی میں نے کپڑے کو پرانا کر دیا۔ اور دَرَس الثوبُ درسا کا معنی ہے اخلق یعنی کپڑا پرانا ہو گیا۔ اور یہ معنی بھی تذلل کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: حضرت ادریس علیہ السلام کو کتاب اللہ کثرت کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے ادریس کا نام دیا گیا۔ اور دارست الكتب و تدارستها اور إدارستها یہ سب درستها کے معنی میں ہیں۔ اور درست الكتاب درسا و دراسة (میں نے کتاب خوب اچھی طرح پڑھی) اور درست المرأة درسا ای حاضت (عورت حائضہ ہوگئی) اور کہا جاتا ہے کہ عورت کی شرمگاہ کو کنایۃ ابا ادراس کہا جاتا ہے۔ اور یہ بمعنی حیض ہے۔ اور الدرس خفیہ راستے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور اصمعی نے بیان کیا ہے: بعیرلم یدرس یعنی اونٹ پر سوار نہیں ہوا گیا، اور درست، درس المنزل سے ماخوذ ہے جب منزل کا نشان مٹ جائے۔ اور حضرت ابن مسعود اور آپ کے اصحاب نے، حضرت ابی، حضرت طلحہ، حضرت اعمش نے ولیقولوا درس قرأت کی ہے۔ یعنی درس محمد الآیات (حضرت محمد ﷺ نے آیات پڑھیں) وَلِنُبَيِّنَهُ یعنی تاکہ ہم قول اور تصریف کو واضح کر دیں، یا تا کہ ہم قرآن کو واضح کر دیں۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 89

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ۝

''پیروی کیجئے آپ اس کی جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اور منہ پھیر لو مشرکوں کی طرف سے''۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ یعنی قرآن کی اتباع کیجئے، یعنی اپنے دل اور طبیعت کو ان کے ساتھ مشغول نہ رکھیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رکھیے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِیۡنَ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَكِیۡلٍ ۝

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہیں آپ ان کے ذمہ دار''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكُوۡا یہ اس پر نص ہے کہ شرک اس کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ مذہب قدریہ کا بطلان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَمَا جَعَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کی حفاظت اور نگہبانی کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔

وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَكِیۡلٍ یعنی آپ ان کے امور اور معاملات کو ان کے دین یا ان کی دنیا کے مصالح اور منافع میں مضبوط اور پختہ کیجئے، یہاں تک کہ ان کے لیے اسے پانا آسان ہو جائے جو ان کے لیے واجب اور ضروری ہے۔ پس اس بارے میں نہ آپ نگہبان ہیں اور نہ ہی ذمہ دار ہیں، بلاشبہ آپ تو صرف مبلغ (اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں) اور یہ جنگ وقتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمۡ مَّرۡجِعُهُمۡ فَیُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

''اور نہ تم برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔ یونہی آراستہ کر دیا ہے ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل، پھر اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور انہوں نے پھر وہ انہیں بتائے گا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ یہ نہی ہے۔ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ یہ جواب نہی ہے۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو اس سے منع کیا ہے کہ وہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب وہ انہیں برا بھلا کہیں گے تو کفار نفرت کریں گے اور وہ اپنے کفر میں اور بڑھ جائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کفار قریش نے حضرت ابو طالب کو کہا: یا تو آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو ہمارے الٰہوں کو برا بھلا کہنے اور ان سے نفرت کرنے سے منع کریں اور یا پھر ہم بھی اس کے الٰہ کو برا بھلا کہیں گے اور اس کی ہجو کریں گے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے بیان کیا ہے: اس کا حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے پس جب کافروں کو اس سے منع کیا گیا ہے اور خوفزدہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کو یا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ تعالیٰ عزوجل کو برا بھلا کہیں، تو پھر مسلمانوں کے لیے بھی حلال نہیں ہے کہ وہ ان کی صلیب، ان کے دین اور ان کے گرجا گھروں کو برا بھلا کہیں، اور نہ ہی وہ اس طرح کا تعرض کریں جو انہیں اس حالت تک پہنچا دے، کیونکہ یہ معصیت پر ابھارنے کے قائم مقام ہے۔ اور انہیں اصنام سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ان کے بارے عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتے جو کفار ان کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں بھی صلح کی ایک قسم کا بیان ہے، اور سد ذرائع کے حکم کے واجب ہونے پر دلیل ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے سورۃ البقرہ میں۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ کبھی حق دار اپنے حق سے رک جاتا ہے جب وہ اسے ایسے ضرر اور نقصان تک پہنچا دے جو دین میں ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں وہ روایت ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم قطع تعلقی کے ڈر سے قرابت داروں کے درمیان فیصلہ نافذ نہ کرو۔ ابن عربی نے کہا ہے: اگر حق واجب ہو تو وہ اسے ہر حال میں لے گا اور اگر وہ جائز ہو تو اس میں یہ قول ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: عَدْوًۢا یعنی جہالت کے سبب اور زیادتی کرتے ہوئے۔ اور اہل مکہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے عُدُوًّا عین اور دال کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حسن، ابو رجا اور حضرت قتادہ کی قرأت ہے اور یہ پہلی قرأت کی طرف ہی راجع ہے، اور مجموعی طور پر یہ دونوں بمعنی ظلم ہیں۔ اور اہل مکہ نے عَدُوًّا عین کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ بمعنی عدو (عداوت دشمنی) کے پڑھا ہے اور یہ واحد ہے لیکن جمع کی طرف سے ذکر ہو رہا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء) (پس وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمُ الْعَدُوُّ (المنافقون: 4) یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ جس طرح ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل کو آراستہ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ ہم نے اہل طاعت کے لیے طاعت کو، اور اہل کفر کے لیے کفر کو آراستہ کر دیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (فاطر: 8) اس میں قدریہ کا رد ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۗ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹

"اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی پوری کوشش سے کہ اگر آ گئی ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور ایمان لائیں گے اس کے ساتھ۔ آپ فرمائیے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ جب یہ نشانی آ جائے گی تو (تب بھی) یہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں۔ اور جھد الیمین کا معنی ہے قسم کو مضبوط اور پختہ کرنا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا ہے۔ اور قولہ: جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ یعنی ان کی قسموں کی وہ انتہائی کوشش جس تک ان کا علم پہنچا ہے، اور جہاں تک ان کی قدرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی الٰہ اعظم ہے اور یہ الٰہ جن کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کا گمان ہے کہ یہ انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ان کے بارے خبر دی گئی ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:3) (ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں)

وہ اپنے آبا کی، بتوں کی اور علاوہ ازیں دوسری چیزوں کی قسمیں کھاتے رہتے تھے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم بھی کھاتے تھے اور وہ اسے جھد الیمین کا نام دیتے تھے جب قسم اللہ کی کھاتے۔ اور جھد کا لفظ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل اَقْسَمُوْا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے معنی میں ہے(1) اور الجھد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے مشقت اٹھانا (انتہائی کوشش کرنا)۔ کہا جاتا ہے: فعلتُ ذالِكَ بجَهْدٍ (میں نے وہ کام مشقت اور کوشش کے ساتھ کیا) اور الجُهد (جیم کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے: ھذا جُهْدٌ (یہ میری طاقت ہے) اور بعض ان دونوں کو ایک ہی معنی میں رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں: وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (توبہ:79) (اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے) اور اسے جھدھم بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ ابن قتیبہ سے منقول ہے۔ اور آیت کا سبب نزول جو کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے، ان میں قرظی اور کلبی وغیرہ ہیں، وہ یہ ہے کہ قریش نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہمیں خبر دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر اپنا عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور یہ کہ قوم ثمود کے لیے ایک اونٹنی تھی، پس آپ بھی ہمارے سامنے ایسے معجزات میں سے کوئی لائیں تاکہ ہم آپ کی تصدیق کر سکیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کون سی شی تم پسند کرتے ہو؟''۔ انہوں نے عرض کی: آپ ہمارے لیے صفا (پہاڑ) کو سونا بنا دیجئے۔ تو قسم بخدا! اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ہم تمام کے تمام یقیناً آپ کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگنے کے لیے اٹھے، تو حضرت جبریل امین علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ''اگر آپ چاہیں تو صفا (پہاڑ) سونا ہو جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ ظاہر فرما دیا اور انہوں نے اسے دیکھ کر تصدیق نہ کی تو وہ یقیناً انہیں عذاب دے گا اس لیے آپ انہیں چھوڑ دیں یہاں تک کہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے''۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بل یتوبُ تائبھم(2) (بلکہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے) تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اللہ رب العزت نے واضح فرما دیا کہ جس کے بارے وہ اپنے علم ازلی کے ساتھ جانتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، وہ ایمان نہیں لائے گا اگرچہ وہ قسم بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 333 2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 485۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 218

کھائے کہ وہ یقیناً ایمان لائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے (کہ وہ ایسی قسم کھاتے ہیں) جو ان کے نزدیک انتہائی شدید اور اغلظ ہے۔ یہاں احکام میں سے بہت بڑا مسئلہ پیش آتا ہے اور وہ آدمی کا یہ قول ہے: الأيمان تلزمه إن كان كذا و كذا (اس پر قسم لازم ہوگی اگر اس طرح ہوا)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ قسم ابتداء اسلام میں اس صورت کے بغیر معروف و مشہور تھی، وہ کہتے تھے: علی أشد ما أخذه أحدٌ على أحدٍ (مجھ پر اسے لینا انتہائی لازم اور ضروری ہے جو ایک کا دوسرے پر ہے)

تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی عورتیں آزاد (مطلقہ) ہو جائیں گی پھر صورتیں بہت زیادہ ہوگئیں یہاں تک کہ وہ لوگوں کے درمیان اس صورت کی طرف لوٹ آئیں جو ان کی اصل ہے۔ ہمارے شیخ الفہری طرسوسی کہا کرتے تھے: جب وہ اس میں حانث ہوگا تو اس پر تیس مسکینوں کو کھانا کھلانا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا قول الأيمان، یمین کی جمع ہے، اور اگر اس نے علی یمین کہا اور حانث ہوگیا تو ہم اس پر ایک کفارہ لازم کریں گے۔ اور اگر اس نے کہا: علی یمینان تو حانث ہونے کی صورت میں اس پر دو کفارے لازم ہوں گے اور أیمان یمین کی جمع ہے لہٰذا اس میں اس پر تین کفارے لازم ہوں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احمد بن محمد بن مغیث نے اپنے وثائق میں ذکر کیا ہے کہ قیروان کے شیوخ نے اس میں اختلاف کیا ہے اور ابو محمد بن ابی زید نے کہا ہے: اس پر اپنی بیوی کے بارے میں تین طلاقیں لازم ہو سکتی ہیں، مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چلنا، اپنے مال کا تہائی حصہ صدقہ کرنے، قسم کا کفارہ اور غلام کو آزاد کرنا لازم ہو سکتا ہے۔

ابن مغیث نے کہا ہے: اور اسی طرح ان کے سردار ابن ارقع اور فقہاء طُلَيْطُلَه میں سے ابن بدر نے کہا ہے۔ اور شیخ ابو عمران فاسی، ابو الحسن قابسی، اور ابو بکر بن عبد الرحمن قروی نے کہا ہے: اس پر ایک طلاق لازم ہو جائے گی جب اس کی نیت نہ ہوئی۔ اور اس بارے میں ان کی حجت ابن حسن کی روایت ہے جو انہوں نے اس قول کے بارے میں ابن وہب سے سنی ہے: أشدّ ما أخذه أحد على أحد أن عليه في ذالك كفارة يمين۔

ابن مغیث نے کہا ہے: جن کا ہم نے نام لیا ہے انہوں نے الأيمان تلزمه کہنے والے پر ایک طلاق لازم کی ہے، کیونکہ اس کے اس قول سے بڑھ کر برا حال کوئی نہیں ہوتا: أشدّ ما أخذه أحد على أحد أن عليه كفارة يمين۔ (انہوں نے کہا) اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ فرمایا: پہلے گروہ نے ابن القاسم کے قول سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے اس کے بارے کہا جس نے یہ کہا: علی عهد الله وغليظ ميثاقه و كفالته و أشد ما أخذه أحدٌ على أحد على أمر ألا يفعله ثم فعله یعنی وہ کسی کام کے بارے مذکور لفظ کہہ کر قسم کھاتا ہے کہ وہ اسے نہیں کرے گا پھر وہ اسے کر گزرتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس نے طلاق اور عتاق کا ارادہ نہیں کیا اور اس نے ان دونوں کو اس سے جدا اور علیحدہ رکھا تو چاہیے کہ اس پر تین کفارے لازم ہوں۔ اور اگر قسم کھاتے وقت اس کی کوئی نیت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اس قول میں دو کفارے ادا کرے: علی عهد الله وغليظ ميثاقه اور وہ غلام آزاد کرے گا اور اس کی عورتیں چھوٹ جائیں گی، اور مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چل کر جائے گا اور

اپنے مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرے گا جب اس نے یہ کہا: أشد ما أخذہ أحد علی أحد۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا طریقہ استدلال تو وہ یہ ہے کہ الأیمان میں الف لام جنسی ہوگا یا عہدی ہوگا پس اگر الف لام عہدی ہو تو پھر معہود تیرا قول باللہ ہوگا تو اس صورت میں وہ لازم ہوگا جو فہری نے کہا ہے اور اگر الف لام جنسی ہو تو پھر طلاق جنس ہے اور اس پر یہ داخل ہو رہا ہے اور پھر اس کا عدد پورا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں ہر جنس میں ایک معنی داخل ہونا کافی ہوتا ہے، کیونکہ اگر جنس میں کل معنی داخل ہو تو پھر اس کے لیے تمام مال صدقہ کرنا لازم ہو، کیونکہ کبھی مال کا صدقہ کرنا قسم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم (1)

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمایئے: ان نشانیوں اور معجزات کے لانے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اور وہ جب چاہے گا انہیں لے آئے گا۔

وَ مَا یُشْعِرُكُمْ، ای و ما یدریکم أیمانکم اور تمہیں اپنی قسموں کے بارے میں کیا خبر مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اس میں ان مکسور ہے، اور یہ قرأت حضرت مجاہد، ابو عمرو اور ابن کثیر کی ہے، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اسی کی شہادت دیتی ہے۔ وَ مَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اور حضرت مجاہد اور ابن زید نے کہا ہے: اس کا مخاطب مشرکین ہیں، اور کلام مکمل ہو گیا۔ ان پر حکم یہ لگایا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور تحقیق اس کے بعد آیت میں (اللہ تعالیٰ نے) ہمیں بتایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ تاویل اس کی قرأت سے مشابہت رکھتی ہے جس نے تُؤمِنون تا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور فراء وغیرہ نے کہا ہے: خطاب مومنین کے لیے ہے، کیونکہ مومنوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آیت نازل ہوئی تو شاید وہ ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا یُشْعِرُكُمْ یعنی تمہیں کیا خبر اور تمہیں کون بتائے اے مومنین! اَنَّهَا یعنی ہمزہ مفتوح ہے، اور یہ اہل مدینہ، اعمش اور حمزہ کی قرأت ہے یعنی لعلها إذا جاءت لا یُؤمنونَ (شاید جب وہ نشانی آ جائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے) خلیل نے کہا ہے: اَنَّهَا بمعنی لعلها ہے، اسے ان سے سیبویہ نے بیان کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ۝ (عبس) یعنی انہ یزکیٰ (اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جائے) اور عربوں سے حکایت ہے: ایت السوق أنك تشتری لنا شیئا، ای لعلك (تو بازار آ شاید تو ہمارے لیے کوئی شی خریدے)

اور ابو النجم نے کہا ہے:

قلت لشَیْبَان اُدْنُ من لقائه أنْ تُغَدِّی القومَ من شِوَائِه

اور عدی بن زید نے کہا ہے:

أعاذِلَ ما یُدرِیك أنَّ منیّتی إلی ساعةٍ فی الیوم أو فی ضُحَی الغَدِ

1۔ احکام القرآن لابن عربی، جلد 2، صفحہ 737

توان میں أنَّ بمعنی لعلّ مذکور ہے۔

اور درید بن صمہ نے کہا ہے:

أريني جوادًا مات هَزْلًا لأنّني    أرى ما ترين أو بخيلا مُخَلَّدَا

تو اس میں بھی لأنني، لعلني کے معنی میں ہے۔ اور کلام عرب میں أنّ بمعنی لعلّ کا استعمال کثیر ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ مصحف حضرت ابی بن کعب میں اسی طرح ہے: وما أدراکم لعلها اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: کہ لا زائدہ ہے، اور معنی ہے: وما یشعرکم أنها یعنی الآیات تمہیں کیا خبر کہ نشانیاں جب مشرکین کے پاس آجائیں تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس اس میں لا زائد کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں لا زائد کیا گیا ہے: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ (الانبیاء) کیونکہ اس کا معنی ہے: وحرام علی قرية مهلكة رجوعهم (ہلاک شدہ گاؤں پر ان کا رجوع حرام ہے)

اور اس قول باری تعالیٰ میں مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (الاعراف:12) اس کا معنی ہے: مَا منعكَ أن تسجُدَ (تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا ہے) اور زجاج اور نحاس وغیرہما نے لا کے زائدہ ہونے کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ غلط اور خطا ہے، کیونکہ اسے ایسی عبارت میں زائد کیا جاتا ہے جس میں یہ اشکال پیدا نہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: وما یُشعرُكم أنها إذا جاءتْ لا یُؤمنونَ أو یُؤمنونَ (تمہیں کیا خبر ہے کہ جب وہ نشانی آجائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے یا ایمان لائیں گے) پھر سامع کو اس کا علم ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ نحاس وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

## وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

یہ آیت مشکل ہے، اور بالخصوص وہ (اشکال) اس میں ہے وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو قیامت کے دن آگ کے شعلوں اور انگاروں کی حرارت کی طرف پھیر دیں گے، جس طرح کہ وہ دنیا میں ایمان نہیں لائے۔

وَنَذَرُهُمْ اور ہم انہیں دنیا میں چھوڑ دیں گے یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے اور ہم انہیں سزا نہیں دیں گے، پس آیت کا کچھ حصہ آخرت کے بارے میں ہے اور کچھ دنیا کے بارے میں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿۲﴾ (الغاشیہ) یہ آخرت میں ہوگا اور عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ (الغاشیہ) یہ دنیا میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم دنیا میں پھیر دیں گے، یعنی ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان حائل ہو جائیں گے اگر وہ نشانی ان کے پاس آ بھی جائے، جیسا کہ ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان پہلی بار حائل ہوئے، جب آپ نے انہیں دعوت دی اور ان پر اپنا معجزہ ظاہر فرمایا۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (الانفال:24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم)

حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان) اور معنی یہ ہے: چاہیے یہ تھا کہ وہ ایمان لاتے جب ان کے پاس نشانی آ گئی اور انہوں نے اسے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا اور اسے اپنے دلوں کے ساتھ پہچان لیا، پس جب وہ ایمان نہیں لائے تو ایسا اللہ تعالیٰ کے ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھرنے کے سبب ہوا۔

كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور کاف محذوف پر داخل کیا گیا ہے، ای فلا یؤمنون کما لم یؤمنوا به اوّل مرّة (پس وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے) یعنی پہلی مرتبہ ان کے پاس ایسی نشانیاں اور معجزات آئے جن کا معارض (اور مقابل) لانے سے وہ عاجز آ گئے مثلاً قرآن کریم وغیرہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم ان کے دلوں کو پھیر دیں گے تاکہ وہ ایمان نہ لائیں جس طرح کہ گزشتہ امتوں کے کفار ایمان نہیں لائے جب انہوں نے ان نشانیوں کو دیکھا جن کی انہوں نے خواہش کی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے: یعنی أنها اذا جاءت لا يؤمنون كما لم يؤمنوا أوّل مرّة ونقلّب أفئدتهم و أبصارهم (یہ کہ جب وہ نشانی آ جائے وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے) وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں ہی چکر کاٹتے رہیں۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ، لیکن اکثر ان میں سے (بالکل) جاہل ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور وہ انہیں عیاں دیکھ لیتے۔ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى اور مردے ان سے باتیں کرنے لگتے ہمارے انہیں زندہ کرنے کے ساتھ۔ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ نشانیوں میں سے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا (وہ ہر شی ہم ان کے لیے جمع کر دیتے) قُبُلًا ان کے سامنے۔ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ نافع اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے معاینۃ ان کے روبرو، تو وہ ایمان نہ لاتے۔

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: قِبَلًا بمعنی ناحیة (طرف) ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: لی قِبَل فلان مالٌ (میرا فلاں کی طرف مال ہے) پس قِبَلًا، طرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور باقیوں نے قُبُلًا پڑھا ہے یعنی قاف اور با کے ضمہ کے ساتھ، اور اس کا معنی ہے ضمناء پس یہ قبیل کی جمع ہو گی بمعنی کفیل، جیسا کہ رغیف اور رغف ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ (الاسراء) یعنی وہ اس کے ضامن ہوں گے۔ یہ فراء سے منقول ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ معنی قَبِيل قَبِيل ہے۔ یعنی جماعت در جماعت۔

اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ دونوں قولوں کے مطابق حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے قبلا بمعنی مقابلہ ہے (یعنی سامنے) اور اسی معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (یوسف:26) (اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے) اور اسی سے قُبُل الرجلِ و دُبُرہ ہے اور یہ اس چیز کے لیے ہے جو آدمی کے سامنے ہو اور اس کے پیچھے ہو۔ اور اس سے قُبُل الحیض بھی ہے۔

ابو زید نے بیان کیا ہے: لقیت فلانا قُبُلا و مقابلة و قَبَلا و قُبُلا ان تمام کا معنی ہے میں آدمی کو بالمشافہ (روبرو) ملا۔ پس معنی میں ضمہ، کسرہ کی طرح ہی ہے اور دونوں قرأتیں مساوی اور برابر ہیں۔ مکی نے یہ کہا ہے اور حسن نے قُبْلا پڑھا ہے اس میں با سے ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور فراء کے قول کے مطابق اس میں ایسی شے کا بولنا مراد ہے جو بولتی نہیں اور اس چیز کی کفالت میں جو عقل و فہم نہیں رکھتی ان کے لیے بہت بڑی علامت اور نشانی ہے۔ اور اخفش کے قول کے مطابق اس میں ان اجناس کا جمع ہونا ہے جو معبود نہیں۔ اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں اَنْ استثنا کے محل میں ہے پہلے کلام سے نہیں ہے۔ یعنی لکن ان شاء الله لھم (لیکن اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے چاہتا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ استثنا ان اہل سعادت کے لیے ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اور اس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ لیکن ان میں سے اکثر حق سے جاہل ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اس چیز سے غافل اور جاہل ہیں کہ ایک نشانی اور معجزہ دیکھ لینے کے بعد مزید نشانیوں اور معجزات کی خواہش کرنا جائز نہیں ہوتا۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لیے، اور اگر چاہتا آپ کا رب تو وہ یہ نہ کرتے سو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حوصلہ اور تسلی دے رہا ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ کو اس قوم کے ساتھ آزمائش میں ڈالا ہے اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے بھی ہر نبی کے لیے دشمن بنائے تھے۔ عَدُوًّا یعنی دشمن۔ پھر ان کی صفت بیان کی اور فرمایا: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ۔ (1) سیبویہ نے بیان کیا ہے کہ جعل بمعنی وصف ہے۔ عَدُوًّا مفعول اول ہے۔ لِكُلِّ نَبِيٍّ یہ مفعول ثانی کے محل میں ہے۔ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یہ عدو سے بدل ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ شیاطین مفعول اول ہو اور عدو مفعول ثانی ہو۔ گویا کہ اس طرح کہا گیا: جعلنا شیاطین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 124

الْإِنْسِ وَالْجِنِّ عَدُوًّا اور اعمش نے شیاطین الجن والانس پڑھا ہے یعنی الجن کو مقدم کیا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے۔(1)

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا یہ اس شے سے عبارت ہے جو جنوں میں سے شیطان انسانوں کے شیطانوں کی طرف وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ اور اسے وحی کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ یہ خفیہ ہوتی ہے، اور ان کی ملع سازی کو زخرف کہا ہے، کیونکہ وہ اسے خوب آراستہ کر کے بیان کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سونے کو زخرف کا نام دیا گیا ہے۔ اور ہر وہ شے جو حسین ہو اور اس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو تو وہ زخرف ہے۔ اور المزخرف کا معنی ہے المزین (وہ شے جس کو آراستہ کیا جائے، خوشنما بنایا جائے) اور زخارف الماء کا معنی پانی کے راستے ہیں۔ اور غُرُوْرًا کو مصدر کی بنا پر نصب دی گئی ہے، کیونکہ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کا معنی ہے وہ انہیں اس کے ساتھ بہت دھوکہ دیتے ہیں۔ یغرونهم بذالك غرورا تو اس صورت میں غُرُوْرًا مفعول مطلق ہوگا)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ حال کے محل میں ہو۔

اور غُرُوْرًا کا معنی باطل ہونا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف اسناد کے ساتھ یہ مروی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ: يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کے بارے میں کہا ہے کہ ہر جن کے ساتھ ایک شیطان ہے اور ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے، پس ان میں سے ایک دوسرے کو ملتا ہے اور یہ کہتا ہے: میں نے اپنے صاحب کو اس طرح گمراہ کیا ہے پس تو بھی اپنے صاحب کو اسی طرح گمراہ کر دے۔ اور دوسرا بھی اسے اسی طرح کہتا ہے۔ پس یہی ان میں سے بعض کی بعض کی طرف وحی ہے اور حضرت عکرمہ اور ضحاک، سدی اور کلبی نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: پہلا قول اسی پر دلالت کرتا ہے وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام: 121) پس یہ اسی معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر صحیح سنت بھی دلالت کرتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر جنوں میں سے ایک ساتھی اس پر مسلط کیا گیا ہے''۔ عرض کی گئی: کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے اور اس نے اسلام قبول کر لیا ہے (یعنی وہ مطیع ہو چکا ہے) اور وہ مجھے خیر اور نیکی کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا''۔ اس میں فاسلم کا لفظ میم کے رفع اور نصب دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ پس رفع اس معنی پر ہے کہ میں اس کے شر سے محفوظ ہوں۔ اور نصب اس معنی کی بنا پر ہے کہ وہ اسلام لا چکا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما منکم من احد اور یہ نہیں کہا ولا من الشیاطین (اور نہ شیطانوں میں سے) مگر یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس میں دو جنسوں میں سے ایک کو دوسری کے بارے متنبہ اور آگاہ کرنا ہو۔ پس یہ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) کے باب سے ہوگا۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 476

اباذر! کیا تو نے انسانوں اور جنات کے شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے؟'' ۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا انسانوں کے شیاطین بھی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ جنوں کے شیاطین سے زیادہ شریر ہیں'' (1)۔ اور مالک بن دینار نے کہا ہے: بلاشبہ انسانوں کا شیطان مجھ پر جنوں کے شیطان سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اس لیے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کروں تو جنوں کا شیطان مجھ سے دور ہو جاتا ہے اور انسانوں کا شیطان میرے پاس آجاتا ہے اور وہ مجھے واضح طور پر معاصی اور گناہوں کی طرف کھینچتا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

إن النساء رَياحين خُلقِن لكم ... وكُلُكم يشتهِي شمّ الرياحين

''بے شک عورتیں خوشبودار پودے ہیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں اور تم تمام ریاحین کی خوشبو پسند کرتے ہو''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس طرح جواب دیا:

إن النسآء شياطين خُلقِن لنا ... نعوذ بالله من شر الشياطين

''بلاشبہ عورتیں شیاطین ہیں جو ہمارے لیے پیدا کی گئی ہیں ہم شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ دھوکہ دہی کے قول کی وسوسہ اندازی نہ کرتے۔ فَذَرْهُمْ یہ امر ہے اور اس میں تہدید (ڈرانے) کا معنی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: نہیں کہا جائے گا: وذَرَ اور نہ ہی ودَعَ، ترک کے سبب وہ ان دونوں سے مستغنی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے اکثر استعمال کی بنا پر ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اور ذَرْهُمْ اور مَا وَدَّعَكَ اور حدیث طیبہ میں ہے: لینتهين أقوام عن وَدْعِهم الجُمُعات (2) (قومیں اپنے جمعوں کو چھوڑنے سے باز آ جائیں گی) اور اس کا قول اذا فعلوا سے مراد معاصی اور گناہ ہیں۔ فقد تُوُدِّعَ منهم تحقیق وہ ان سے چھڑا دیا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: واوُ ثقیل ہے، پس جب ترك ہے اس میں واؤ نہیں ہے اور یہ اس کے معنی میں ہے جس میں واؤ ہے تو پھر اسے چھوڑ دیا گیا جس میں واؤ ہے اور یہ اس کے قول کا معنی ہے یہ نص نہیں ہے۔

**وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۝**

''اور (چھوڑیئے) تاکہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان کے دل جو نہیں ایمان لائے آخرت پر اور تاکہ پسند کریں اسے اور کرتے رہیں جو گناہ وہ اب کر رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ، تصغی بمعنی تمیل (مائل ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: صغوت أَصغُو صَغْوًا و صُغُوًّا، وصَغَيت أصغى، وصَغِيت یہ غین کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے: صغِي يَصْغَى صغًى وصُغِيًا، واصغیت

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 499

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2132

إليه إصغاء تمام ہم معنی ہیں۔
شاعر نے کہا ہے:

تَرَى السَّفِيهَ به عن كلّ مُحْكَمَة　زَيْغٌ و فيه الى التشبيه إصغاء

اور کہا جاتا ہے: أصغيت الإناء (اور یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو برتن کو جھکا دے تاکہ جو کچھ اس میں ہے وہ جمع اور اکٹھا ہو جائے۔ اور اس کی اصل الميل الى الشئ لغرض من الاغراض ہے یعنی کسی غرض اور مقصد کے لیے کسی چیز کی طرف مائل ہونا (جھکنا) اور اسی سے ہے صَغَت النجوم ستارے غروب ہونے کی طرف مائل ہوئے۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) (اور تمہارے دل بھی توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں) ابوزید نے کہا ہے: (کہا جاتا ہے) صَغْوه معك و صِغْوه معك، صَغاه معك، ای ميله (اس کا میلان تیرے ساتھ ہے) اور حدیث میں ہے: فأصْغَى لها الإناء (1) یعنی اس نے بلی کے لیے برتن جھکا دیا۔ اور اکرموا فلانا فى صاغيته یعنی تم فلان کی تکریم کرو اس کی اس قرابت کے سبب جس کی طرف وہ مائل ہوتے ہیں اور جو اس کے پاس ہے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور أصغت الناقة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب ناقہ اپنا سر آدمی کی طرف جھکائے گویا کہ وہ اس سے کچھ سن رہی ہے جب وہ اس پر کجاوہ باندھتا ہے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تُصْغِي إذا شدّها بالكُورِ جانحةً　حتى إذا ما استوى فى غَرْزِها تَثِبُ

اور وَ لِتَصْغَى میں لام لام کی ہے، اور اس میں عامل يُوْحِيْ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ لِيَغُرُّوهم ولِتَصْغَى (ان میں سے بعض بعض کی طرف القاء کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں دھوکہ دیں تاکہ (دل ان کی طرف) مائل ہوں)۔ اور بعض نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ لام امر ہے، اور یہ غلط ہے، کیونکہ اس میں ولتصغَ إليه الف کو حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ لام کی ہی ہے۔

اور اسی طرح ولِيَرْضَوْهُ ولِيَقْتَرِفُوا میں بھی ہے۔ مگر حسن نے وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے لام امر قرار دیا ہے اور اس میں تہدید کا معنی موجود ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے: إفعل ماشئتَ (جو تیری مرضی وہ کر، تو اس میں امر تہدید کے لیے ہے) اور وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ کا معنی ہے وليكتسبوا (چاہیے کہ وہ کرتے رہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے یہی مروی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرج يقترفُ أهله ای يكتسب لهم (وہ نکل گیا جو اپنے اہل کے لیے کرتا ہے) اور قارَفَ فلانٌ هذا الأمر جب وہ اس کام میں خود واقع ہو اور اسے عملاً کرے۔ اور قَرَفَتني بما إدّعيت علىّ ای رميتني بالرِّيبة (تو نے مجھے شک میں ڈال دیا) اور قَرَفَ القَرْحة (تب کہا جاتا ہے) جب وہ زخم کو چھیل دے اور اقترف كَذِبًا (اس نے جھوٹ گھڑ لیا)۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاستبراء، باب سور الھرۃ، حدیث 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارت، باب الوضوء بسور الھرۃ، حدیث 380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رؤبہ نے کہا ہے:

أعيا اقتراف الكذب المقروفِ　　تقوى التّقي وعفّةُ العفيفِ

اور اس کا اصل معنی ہے کسی شی سے کوئی ٹکڑا کاٹنا۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"(آپ ان سے پوچھیے) کیا الله کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور منصف حالانکہ وہی ہے جس نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب مفصل۔ اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ (اچھی طرح) جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) اتارا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ، تو (اے سننے والے!) ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا اس میں غیر کو اَبْتَغِيْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔ اور حَكَمًا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر چاہے تو حال بنا لے۔ اور معنی یہ ہے: کیا میں تمہارے لیے الله تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم تلاش کروں حالانکہ وہ وہ ہے جو تمہیں آیات کے بارے سوال کی مشقت اور بوجھ کے وقت کافی ہوا (کہ) اس نے تمہاری طرف کتاب مفصل نازل فرما دی، اس میں مفصل بمعنی مبین (وضاحت کرنے والی) ہے۔ پھر کہا گیا ہے: حکم، حاکم سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ حکم نام رکھنے کا کوئی مستحق نہیں ہے مگر وہی جو حق کے ساتھ فیصلے کرتا ہے، کیونکہ یہ مدح میں بہت عظیم صفت ہے اور حاکم ایسی صفت ہے جو فعل پر جاری ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ اس کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے جو بغیر حق کے فیصلے کرتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اس میں مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: (وہ مراد ہیں) جو ان میں سے اسلام لے آئے مثلاً حضرت سلمان، حضرت صہیب اور حضرت عبدالله بن سلام رضی اللہ عنہم۔ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ یعنی وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ یعنی وہ سب جو قرآن کریم میں وعدہ وعید میں سے ہے وہ سب برحق ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ یعنی آپ اس بارے میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں کہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ قرآن الله تعالیٰ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے رؤساء (سردار) ہیں اور وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

"اور مکمل ہو گئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اہل کوفہ کی قرأت کلمہ واحد کے ساتھ ہے اور باقیوں کی جمع کے ساتھ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مواعیدُ ربك (تیرے رب کے وعدے) پس انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور کلمات، عبارات یا متعلقات کی طرف راجع ہے اور متعلقات سے مراد وعدہ اور وعید وغیرہ ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا: الکلمات سے مراد

قرآن کریم ہے اسے کوئی بدلنے والا نہیں، جھوٹ گھڑنے والے نہ اس میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کمی کر سکتے ہیں۔
صِدْقًا وَّ عَدْلًا یعنی اس میں جو وعدہ اور حکم ہے (اس کی سچائی اور عدل سے) اس کے فیصلے کو کوئی رد کرنے والا نہیں اور نہ کوئی اس کے وعدہ کے خلاف ہونا ممکن ہے اور رمانی نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: جس بارے میں وہ اس کے ساتھ فیصلہ فرمائے اسے کوئی تبدیل کرنے والا نہیں، یعنی بلاشبہ اگر وہ اس کے لیے الفاظ میں تغیر و تبدل ممکن بنا دے جیسا کہ اہل کتاب نے تورات وانجیل میں تبدیلی کر لی تو پھر یہ قابل اعتماد اور قابل اعتبار نہیں رہتا۔ اور یہ آیت قرآن کریم کی دلالات کے واجب الاتباع ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ایسا حق ہے جسے ایسی شی کے ساتھ تبدیل کرنا ممکن نہیں جو اس کی مناقض ہو، کیونکہ یہ ایسے حکیم کی جانب سے ہے جس پر تمام امور میں سے کوئی شی مخفی نہیں ہے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۱۷﴾

''اور (اے سننے والے!) اگر تو اطاعت کرے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے، وہ نہیں پیروی کرتے سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ مگر محض تخمینے لگاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی اگر تو اطاعت کرے کفار کی۔ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو وہ تجھے بہکا دیں گے اس راستے سے جو اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کی طرف پہنچا دیتا ہے۔
اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ اس میں اِنْ بمعنی ما ہے، اور اسی طرح وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ہے یعنی نہیں ہیں وہ مگر تخمینے لگاتے ہیں اور اندازے لگاتے ہیں، اور اسی سے الخرص ہے، اور اس کا اصل معنی کاٹنا ہے۔
شاعر نے کہا ہے:

تری قِصَد المُرّان فینا کأنه　　تَذَرُّعِ خِرصان بأیدِی الشّواطِبِ

یعنی وہ ٹہنی جو طولاً کاٹی جاتی ہے اور اس سے (سہارا کے لیے) کھونڈی بنائی جاتی ہے۔ اور یہ خرصان خرص کی جمع ہے۔ اور اس سے خَرَص یَخْرُص النخل خَرْصاً ہے جب وہ اس کا اندازہ لگائے تاکہ وہ اس سے خراج وصول کرے۔ اور خارص وہ ہوتا ہے جو ایسی شی کے ساتھ کاٹتا ہے جس کے ساتھ کاٹنا جائز نہیں ہوتا، جب کہ اس کے ساتھ اسے یقین نہ ہو۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ ذاریات میں آئے گا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بعض لوگوں نے کہا ہے: یہاں اَعْلَمُ بمعنی یعلم ہے۔ اور اس کی تائید میں حاتم طائی کا قول بیان کرتے ہیں۔

تحالفتْ طیئٌ من دوننا حلفاً　　والله أعلم ما کنا لهم خُذُلا

اور خنساء کا قول ہے:

الله أعلم أن جفنته تغدو غداة الريح أو تسري

(ان دونوں میں أعلم بمعنی یعلم ہے)

اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ کے مطابق نہیں ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے اصل پر مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ اس میں من بمعنی أی ہے۔ اور یہ محل رفع میں ہے اور اسے رفع دینے والا عامل یَضِلُّ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أعلم کے سبب محل نصب میں ہے، یعنی إن ربك أعلم أي الناس یَضِل عن سبیله (بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے لوگوں میں سے کون ہے جو اس کی راہ سے بہک رہا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حرف جر کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے یعنی بمن یَضِل بعض بصریوں نے یہ کہا ہے۔ یہ اچھا اور حسین ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور سورہ نحل کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور یضل بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مفعول کو حذف کرنے کی بنا پر ہے، اور پہلا قول احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور اگر یہ اضلال سے ہوتا تو وہ فرماتا: وهو أعلم بالهادین۔

**فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾**

"تو کھاؤ اس میں سے لیا گیا ہے نام خدا جس پر اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ یہ آیت کچھ لوگوں کے سبب نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ ہم اسے تو کھاتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ مار دے؟ تب یہ آیات نازل ہوئی: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآىِٕهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓىِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ اسے ترمذی وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت اس بات کا حکم ہے کہ کوئی مشروب پیتے وقت، ذبح کے وقت اور ہر قسم کی کھائی جانے والی شی کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی (یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) پڑھنا چاہیے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ یعنی اگر تم اس کے احکام اور اوامر کو لینے والے (پکڑنے والے) ہو، کیونکہ ایمان انہیں متضمن ہوتا ہے اور انہیں پکڑنے اور ان کی پیروی کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

**وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآىِٕهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ**

1۔ سنن ابی داود، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اہل الکتاب، حدیث 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور کیا ہوا تمہیں کہ نہیں کھاتے ہو تم اس جانور کو لیا گیا ہے الله کا نام جس پر حالانکہ الله تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لیے جو اس نے حرام کیا تم پر مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف، اور بے شک بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشوں سے بے علمی کے باعث، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اس کا معنی ہے تمہارے لیے کون سی شی مانع ہے اس کو کھانے سے جس پر تم نے اپنے رب کا نام لیا ہے اگرچہ تم نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔

وَقَدْ فَصَّلَ یعنی الله تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال اور حرام کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور تم سے التباس اور شک کو زائل کر دیا گیا ہے اور ما استفہامیہ تقریر کو متضمن ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: وأی شیٔ لکم فی اَلَّا تَاْكُلُوْا (اور اس میں تمہارے لیے کون سی شی ہے کہ تم اسے نہیں کھاتے) اور أن بتقدیر حرف جر محل جر میں ہے۔ اور اس بنا پر محل نصب میں ہونا بھی صحیح ہے کہ حرف جر مقدر نہ ہو اور نصب دینے والا عامل اس فعل کا معنی ہو جو مالکم میں ہے اور اس کی تقدیر ہے ما یمنعکم (کونسی شی تمہیں روکتی ہے) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ اس میں مراد وہ سب ہیں جو الله تعالیٰ نے حرام کیے ہیں مثلاً مردار وغیرہ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے۔ اور نافع اور یعقوب نے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ دونوں فعلوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، ابن عامر اور ابن کثیر نے دونوں میں ضمہ پڑھا ہے۔ (یعنی فصل اور حرم) اور کوفیوں نے فصل کو فتحہ کے ساتھ اور حرم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور عطیہ العوفی نے فصل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے جدا کرنا اور ظاہر کرنا، جیسا کہ اس آیت میں پڑھا گیا ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ہود:1) ای استبانت (یعنی ظاہر کر دیں)۔ ابو عبیدہ نے اہل مدینہ کی قرأت کو اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فصل کا معنی بین (بیان کرنا، واضح کرنا) ہے اور یہ وہی ہے جو سورۃ المائدہ میں اس ارشاد کے تحت مذکور ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ الآیہ (المائدہ:3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ سورۃ الانعام مکی ہے اور سورۃ المائدہ مدنی سورت ہے تو یہ کیسے اس کا بیان بن سکتی ہے جو ابھی تک نازل ہی نہیں ہوئی؟ سوائے اس صورت کے کہ فصل بمعنی یفصل ہو۔ والله اعلم

قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ اور قراء کوفہ نے اسے یضلون، أضل سے پڑھا ہے۔

بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی مشرکین نے جب کہا: جسے الله تعالیٰ نے اپنی چھری کے ساتھ ذبح کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جنہیں تم اپنی چھریوں کے ساتھ ذبح کرتے ہو۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی بغیر علم کے جو وہ ذبح کے معاملہ میں جانتے ہیں، کیونکہ اس میں حکمت اس خون کو نکالنا ہے جسے الله تعالیٰ نے ہم پر حرام قرار دیا ہے بخلاف اس جانور کے جو دم گھٹنے سے مر جائے۔ اسی لیے محل مخصوص سے ذبح کو مشروع کیا گیا ہے تاکہ اس میں ذبح جانور سے تمام خون کے نکلنے کا سبب بن جائے بخلاف کسی اور عضو

کے (کیونکہ وہاں سے سارے خون کا نکلنا ممکن نہیں ہوتا) واللہ اعلم۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ۝

''اور ترک کر دو ظاہر گناہ کو اور چھپے ہوئے کو، بے شک وہ لوگ جو کماتے ہیں گناہ (تو) جلدی ہی سزا دی جائے گی انہیں (اس گناہ کی) جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اس بارے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ اور ان کا نتیجہ اور حاصل جس کی طرف وہ راجع ہیں وہ یہ ہے کہ ظاہر وہ ہے جو بدن کا ایسا عمل ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو اور باطن وہ عمل ہے جس کا دل سے اعتقاد رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، چاہے حکم امر کی صورت میں ہو یا نہی کی صورت میں۔ اس مرتبہ پر وہی پہنچ سکتا ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور نیکی کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا (المائدہ:93) (پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور (جو اترا) اس پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں) اور یہ اس اعتبار سے تیسرا مرتبہ ہے جن کا بیان پہلے سورۃ المائدہ میں ہو چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں تھے کہ ظاہراً زنا کرتے اور باطناً انہیں بیویاں بناتے تھے۔ اور جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے وہ ہر گناہ کو جامع ہے (اور ہر امر کا موجب ہے)۔

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝

''اور مت کھاؤ اس جانور سے کہ نہیں لیا گیا اللہ کا نام اس پر اور اس کا کھانا نافرمانی ہے اور بے شک شیطان ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے دلوں میں (اعتراضات) تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم مشرک ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ابوداؤد نے روایت بیان کی ہے کہ یہودی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہم اسے تو کھا لیتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ مار دے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ، الی آخر الآیۃ(1)۔ اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ انہوں نے بیان فرمایا: مشرکین نے ان سے جھگڑا کر دیا اور انہوں نے کہا: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے تو اسے تم نہیں کھاتے اور جسے تم خود ذبح کرتے ہو اسے تم کھا لیتے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اہل الکتاب، حدیث نمبر 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہو۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے لیے ارشاد فرمایا: لَا تَأْكُلُوْا تم نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا ہے۔ اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور وہ یہ ہے کہ جو لفظ سبب کی بنا پر وارد ہو کیا اسے اسی پر محصور کیا جائے گا یا نہیں؟ تو ہمارے علماء نے بیان کیا ہے: اس میں دعویٰ عموم کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں جسے شارع نے ابتداءً ہی الفاظ عموم کے ساتھ ذکر کیا ہو، البتہ وہ جسے کسی سوال کے جواب میں ذکر کیا ہو تو اس میں تفصیل ہے، جو اصول فقہ میں معروف ہے۔ مگر یہ کہ اگر اسے بغیر سوال کے لفظ مستقل کے ساتھ ذکر کیا جائے تو پھر وہ تعمیم کے ارادہ کے صحیح ہونے کی صورت میں اوّل (کلام) کے ساتھ لاحق ہوگا، پس قول باری تعالیٰ: لَا تَأْكُلُوْا امردار کو شامل ہونے میں ظاہر ہے۔ اور اس میں وہ بھی داخل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا کیونکہ یہ الفاظ عام ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی اور کے ذکر کی زیادتی وہ ہے جس کی تحریم کا تقاضا بطور نص اس ارشاد سے ہوتا ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرہ: 173) (اور وہ جانور بلند کیا گیا جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام) کیا اس میں وہ جانور بھی داخل ہوگا جس پر ذبح کے وقت یا شکار پر چھوڑتے وقت کسی مسلمان نے تسمیہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں پانچ قول ہیں۔ اور یہی وہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ پہلا قول: اگر اس نے تسمیہ سہواً (بھول کر) چھوڑ دیا تو دونوں جانور کھائے جائیں گے یہی اسحاق کا قول ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور اگر اس نے عمداً (جان بوجھ کر) چھوڑ دیا تو دونوں نہ کھائے جائیں گے۔ امام مالک اور ابن القاسم نے اپنی کتاب میں یہی کہا ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے اصحاب، امام ثوری، حسن بن حی، عیسیٰ اور اصبغ نے کہا ہے اور سعید بن جبیر اور عطا نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے پسند کیا ہے اور کہا ہے: یہ احسن ہے، کیونکہ اسے فاسق کا نام نہیں دیا جا سکتا جب وہ بھول گیا۔

دوسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا سہواً چھوڑ دیا تو وہ دونوں کو کھالے گا۔ اور امام شافعی اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے اور حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عطا، حضرت سعید بن مسیب، حضرت جابر بن زید، حضرت عکرمہ، حضرت ابو عیاض، حضرت ابو رافع، حضرت طاؤس، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ اور زہراوی نے امام مالک بن انس سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ ذبیحہ کھایا جائے گا جس پر عمداً یا بھول کر تسمیہ چھوڑ دیا گیا۔ اور حضرت ربیعہ سے بھی یہی مروی ہے۔ عبدالوہاب نے کہا ہے: تسمیہ سنت ہے، پس جب ذبح کرنے والے نے اسے بھول کر چھوڑ دیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے قول کے مطابق وہ ذبیحہ کھایا جائے گا۔

تیسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا بھول کر چھوڑ دیا تو اس کا کھانا حرام ہے۔ محمد بن سیرین، عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن عمر، نافع، عبداللہ بن زید خطمی اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے: اور اسی طرح ابو ثور اور داؤد بن علی نے کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں یہی ہے۔

چوتھا قول: اگر اس نے عمداً تسمیہ چھوڑ دیا تو اسے کھانا مکروہ ہے۔ ہمارے علماء میں سے قاضی ابوالحسن اور شیخ ابو بکر نے

بھی کہا ہے۔

پانچواں قول: اشہب نے کہا ہے کہ عمداً تسمیہ چھوڑنے والے کا ذبیحہ کھایا جائے گا (1) مگر یہ کہ وہ حقیر اور ناپسند کرتا ہو اور اسی طرح علامہ طبری نے کہا ہے (دلائل یہ ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور دوسرا ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں صورتیں بیان فرما دیں اور دونوں کا حکم واضح فرما دیا۔ اس کا قول لَا تَاْكُلُوْا نہی ہے جو تحریم پر دلالت کرتی ہے اسے کراہت پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اپنے بعض ایسے مقتضیات کو شامل ہے جو حرام محض ہے اور اس میں تبعض جائز نہیں، یعنی اس سے تحریم اور کراہت ایک ساتھ مراد لیے جائیں۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس اصول ہے۔ اور رہا بھولنے والا تو اس کی طرف خطاب متوجہ ہی نہیں، کیونکہ اسے خطاب کرنا محال ہے، پس شرط اس پر واجب نہیں ہے۔

اور رہا وہ جو تسمیہ کو جان بوجھ کر ترک کرنے والا ہے تو وہ تین احوال سے خالی نہیں ہوگا یا تو وہ اس وقت تسمیہ ترک کرے گا جب ذبیحہ کو لٹائے گا اور کہے گا: میرا دل اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی توحید سے بھرا ہوا ہے لہٰذا میں اپنی زبان کے ساتھ ذکر کرنے کا محتاج نہیں ہوں۔

پس اسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا ذکر کیا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ یا وہ کہتا ہے: بلاشبہ یہ صریح تسمیہ کا محل نہیں ہے، کیونکہ یہ قربت نہیں ہے، تو اسے بھی وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ یا وہ کہتا ہے: میں تسمیہ نہیں پڑھوں گا، اور تسمیہ کی کون سی قدر و منزلت ہے، تو یہ حقیر جاننے والا فاسق ہے اس کا ذبیحہ نہیں کھائے جائے گا۔

علامہ ابن عربی (2) نے کہا ہے: مجھے رأس المحققین، امام الحرمین پر بڑا تعجب ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بلاشبہ قرب کی حالت میں مشروع ہے اور ذبح حالت قربت نہیں ہے۔ یہ نظریہ قرآن وسنت سے معارض آتا ہے۔ آپ ﷺ نے حدیث صحیح میں فرمایا ہے: "وہ جانور جس کا خون بہایا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا تو اسے کھاؤ"۔ پھر اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے سے مراد دل میں نام لینا ہے، کیونکہ ذکر نسیان کی ضد ہے اور نسیان کا محل دل ہے پس ذکر کا محل بھی دل ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت بیان فرمائی: "اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے وہ تسمیہ پڑھے یا نہ پڑھے" (3)۔ تو ہم کہیں گے: ذکر باللسان بھی ہے اور ذکر بالقلب بھی۔ اور وہ عمل جو عرب کرتے تھے وہ زبان سے بتوں کا نام لیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام زبان کے ساتھ لینے کے ذریعہ اسے ختم کیا اور شریعت میں یہی مشہور ہے یہاں تک کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے گا جب وضو کرے (4)، تو آپ نے فرمایا: کیا وہ ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور رہی وہ حدیث جس کے ساتھ انہوں نے تعلق قائم کیا ہے "کہ اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے" (5)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 749 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 750
4۔ ایضاً 5۔ صحیح بخاری، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 828

تحقیق اہل علم کی ایک جماعت نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ذبیحہ پر تسمیہ پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کو فرمایا جنہوں نے آپ سے سوال کیا اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم ہمارے پاس گوشت لے کر آتی ہے اور ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے یا نہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لے لو اور اسے کھا لو“ (1)۔

اسے دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے مرسل روایت کیا ہے اور اسے مرسل بیان کرنے میں آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اور اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ نے اس کے آخر میں کہا: وذالك فی اول الاسلام (کہ وہ ابتداء اسلام میں ہوا) مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ ضعیف ہے اور فی نفسہ حدیث میں وہ موجود ہے جو اس کا رد کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس میں کھانے پر تسمیہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ آیت آپ پر نازل ہو چکی تھی۔ اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کو صحیح ہونے پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث مدینہ طیبہ کی ہے اور علماء کا اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ سورۃ الانعام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔

اور وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کا معنی ہے کہ یہ معصیت اور گناہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور لَفِسْقٌ کا معنی الخروج (نکلنا) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ یعنی وہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے کی باتیں ڈالتے ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے (یعنی مار دے) تو اس کو تم نہ کھاؤ اور جسے تم خود ذبح کرو تو اسے کھا لو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: اس آیت میں شیاطین سے مراد فارس کے مجوسیوں میں سے سرکش انسان ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: بلکہ شیاطین سے مراد جن ہیں اور جنوں میں سے کافر قریش کے اولیاء (دوست) ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ مختار کہتا ہے: میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے، بلاشبہ شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے رہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول: لِيُجَادِلُوْكُمْ مراد ان کا یہ قول ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ مار دے تم اسے نہ کھاؤ اور جسے تم مارو تم اسے کھا لو۔ اور مجادلہ کا معنی ہے قوت کے ساتھ حجت کے طریقہ پر قول کا دفاع کرنا۔ یہ أجدل سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے طاقتور پرندہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدالہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد زمین ہے۔ تو گویا وہ اس پر غلبہ پاتا ہے دلیل کے ساتھ اور وہ

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2446۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3184، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 162 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340

اسے اس طرح مغلوب کر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ قبضہ کی ہوئی زمین کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدال سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے بٹائی کا مضبوط ہونا، گویا ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حجت اور دلیل کو بل دیتا ہے یہاں تک کہ اسے کاٹ دیتا ہے اور وہ حق کی نصرت اور معاونت میں حق ہوتی ہے اور باطل کی نصرت اور مدد میں باطل ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ یعنی مردار کو حلال قرار دینے میں اگر تم نے ان کی بات مانی۔ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (تو تم مشرک ہو جاؤ گے) پس آیت اس پر دلیل ہے کہ جس نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو حلال قرار دیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ اس کے سبب مشرک ہو جائے گا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام قرار دیا ہے اور یہ نص سے ثابت ہے۔ اور جب کسی نے کسی غیر کی حلال کردہ چیز کو قبول کر لیا تحقیق اس نے بھی شرک کیا۔ علامہ ابن عربی (2) نے کہا: بلاشبہ مومن مشرک کی اطاعت کرنے سے مشرک ہو جاتا ہے جب وہ اعتقاد میں اس کی اطاعت و پیروی کرے۔ اور جب وہ فعل اور عمل میں اس کی پیروی کرے اور اس کا عقیدہ صحیح سالم ہو اور توحید و تصدیق پر قائم اور جاری ہو تو گنہگار ہو گا۔ پس تم اسے سمجھ لو اور یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لیے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو، نہیں نکلنے والا ان سے، یونہی آراستہ کر دیئے گئے کافروں کے لیے وہ اعمال جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ جمہور نے واؤ کو مفتوح پڑھا ہے، اور اس پر ہمزہ استفہام داخل کیا گیا ہے۔ مسیبی نے نافع بن ابی نعیم سے اَوْ مَنْ كَانَ واؤ ساکن کے ساتھ روایت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کا معنی پر محمول ہونا بھی جائز ہے، یعنی تم دیکھو اور تدبر کرو کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی منصف تلاش کروں؟ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ مردہ تھا جس وقت وہ نطفہ تھا، پھر ہم نے اس میں روح پھونک کر اسے زندہ کیا، اسے ابن البحر نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: کیا وہ جو پہلے کافر تھا اور ہم نے اسے ہدایت عطا فرمائی؟

یہ آیت حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے بارے نازل ہوئی۔ اور زید بن اسلم اور سدی نے کہا ہے: فَاَحْيَيْنٰهُ سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں (یعنی ہم نے انہیں ہدایت عطا فرما کر زندگی بخش دی)۔ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ مراد ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ ہے (یعنی وہ کفر کے سبب اندھیروں میں پڑا رہا) اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ہر مومن اور کافر کے بارے میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جہالت کے سبب مردہ تھا تو ہم نے اسے علم کے ساتھ زندہ کر دیا۔ بعض اہل علم نے شعراء بصرہ میں سے کسی کے یہ اشعار بھی بیان کیے ہیں جو اس تاویل کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 752

وفی الجھل قبل الموت موتٌ لأھله فأجسامھم قبل القبور قبورُ

''جہالت میں موت سے قبل ہی جاہلوں کے لیے موت ہے اور ان کے اجسام قبروں میں جانے سے پہلے ہی قبریں ہیں''۔

وإنّ أمرا لم یَحْیَ بالعلم میّتٌ فلیس له حتی النشور نشورُ

''اور بلاشبہ آدمی جو علم کے ساتھ زندہ نہیں ہوا وہ مردہ ہے اور اس کے لیے نشور (مرنے کے بعد زندہ کیا جانا) بھی نشور نہیں ہے''۔

اور نور سے مراد ہدایت اور ایمان ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد حکمت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہی نور ہے جس کا ذکر ان ارشادات میں ہے: **یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ** (الحدید: 12) (کہ ضوفشانی کر رہا ہوگا ان کا نور ان کے آگے بھی اور ان کے دائیں جانب بھی) اور **انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ** (الحدید: 13) (ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کرلیں تمہارے نور سے) **یَمْشِیْ بِهٖ** اس نور کی روشنی میں وہ چلتا ہے۔ **فِی النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ** لوگوں کے درمیان وہ اس کی مثل ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو۔ ای کمن ھو تو اس میں مثل زائدہ ہے۔ آپ کہتے ہیں: أنا أکرم مثلك، ای أکرمك (میں تیری عزت و تکریم کرتا ہوں۔ اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے: **فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ** (المائدہ: 95) (تو اس کی جزا یہ ہے کہ اسی قسم کا جانور دے جو اس نے قتل کیا ہے)

**لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ** (الشوریٰ: 11) (نہیں اس کی مانند کوئی چیز) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **كَمَنْ مَّثَلُهٗ** کا معنی ہے مثل من ھو فی الظلمات (اس کی مثل جو تاریکیوں میں ہے) اور المثل اور المثل دونوں کا معنی ایک ہے۔ **كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلْكٰفِرِیْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** شیطان نے ان کے لیے بتوں کی عبادت کو آراستہ کر دیا اور انہیں یہ وہم دلایا کہ وہ مسلمانوں سے افضل ہیں۔

**وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا ؕ وَمَا یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۲۳**

''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر بستی میں اس کے بڑے لوگوں کو وہاں کے مجرم تاکہ وہ مکر و فریب کیا کریں اس میں اور نہیں فریب دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا** اس کا معنی ہے: جس طرح ہم نے کافروں کے لیے ان اعمال کو آراستہ کیا جو وہ کیا کرتے تھے اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بنایا۔ **مُجْرِمِیْهَا** یہ جعل کا مفعول اول ہے۔ **اَكٰبِرَ** یہ مفعول ثانی ہے اور ان میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور جعل بمعنی صیّر ہے۔ اور الاکابر، الاکبر کی جمع ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد عظماء (بڑے لوگ) ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکابر سے مراد رؤساء اور عظماء ہیں۔ اور انہیں خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ فساد برپا کرنے پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور مکر کا معنی استقامت کی مخالفت میں حیلہ کرنا ہے۔ اور اس کا اصل معنی الفتل (بٹنا) ہے۔ پس مکر و فریب کرنے والا استقامت سے پھر جاتا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ہر گھاٹی پر چار چار بیٹھتے تھے اور لوگوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی سے نفرت دلاتے تھے جیسا کہ ان سے پہلے امم ماضیہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا۔

وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی ان کے مکر وفریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دردناک عذاب کے ساتھ مکر کی جزا اور بدلہ ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ اپنی فرط جہالت کی وجہ سے فی الحال اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ان کے فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹے گا۔

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا كَانُوْا یَمْكُرُوْنَ ۝۱۲۴

''اور جب آئے ان کے پاس کوئی نشانی کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے جیسے دیا گیا اللہ کے رسولوں کو، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو، عنقریب پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت، بوجہ ان مکروں کے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ اس میں ان کی جہالت کی ایک دوسری چیز بیان فرمائی اور وہ یہ کہ وہ کہنے لگے: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ہم انبیاء ہو جائیں اور ہمیں انہیں نشانیوں کی طرح عطا کی جائیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ اور اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلْ یُرِیْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝۵۲ (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں)۔

اور جَآءَتْهُمْ میں ضمیر ان اکابر کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ ولید بن مغیرہ (1) نے کہا: اگر نبوت حق ہے تو پھر میں اس کے لیے تم سے زیادہ اہل اور بہتر ہوں، یا کیونکہ میں عمر کے اعتبار سے تم سے بڑا ہوں اور میرا مال تم سے زیادہ ہے۔ اور ابوجہل نے کہا: قسم بخدا! ہم اس کے ساتھ راضی ہوں گے اور نہ کبھی اس کی اتباع کریں گے، مگر اس صورت میں کہ ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی آئے جیسے ان کے پاس آتی ہے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے نبوت کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے کہا: ہم تمہاری تصدیق نہ کریں گے یہاں تک کہ ہمارے پاس حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اور دیگر ملائکہ آئیں اور وہ ہمیں آپ کی صداقت کے بارے خبر دیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ یعنی اس کے بارے جسے اس پر امین بنایا گیا ہے اور جو اس کا محل ہے۔

اور حَیْثُ یہاں ظرف نہیں ہے، بلکہ یہ اسم ہے اس میں وسعت ہونے کی بنا پر مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے اسے نصب دی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ رسالت کے اہل کو خوب جانتا ہے اور یہ اصل عبارت اس طرح ہے اللہ أعلم بمواضع رسالته اللہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 414　　2۔ ایضاً

تعالیٰ اپنی رسالت کی جگہوں کو خوب جانتا ہے، پھر حرف کو حذف کر دیا گیا اور یہ جائز نہیں ہے کہ أعلم، حیث میں عمل کرے اور وہ ظرف ہو، کیونکہ اس پر معنی یہ ہوگا اللہ أعلم فی ھذا الموضع (اللہ تعالیٰ اس محل میں خوب جانتا ہے) اور یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ متصف کیا جائے، بلاشبہ اس کا محل اس فعل مضمر کے ساتھ نصب ہے جس پر "أعلم" دلالت کرتا ہے اور یہ اسم ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

اور الصغار کا معنی ظلم، ذلت اور حقارت ہے، اور اسی طرح الصُغر (بالضم) بھی ہے۔ اور مصدر الصغر ہے۔ اور اس کی اصل الصغر ہے جو کبر کا مقابل ہے۔ گویا ذلت آدمی کی ذات کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الصغر ہے اور اس کا معنی ہے ذلت کے ساتھ راضی ہونا۔

اسی سے کہا جاتا ہے: صَغَرَ یَصْغُرُ ماضی میں غین مفتوح ہے اور مضارع میں مضموم ہے۔ اور صَغِرَ، یَصْغَرُ ماضی میں غین مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں، صِغرًا و صِغارًا اور اسم فاعل صَاغِرٌ اور صغیر ہوگا۔ اور صاغر کا معنی ہے ظلم کے ساتھ راضی ہونے والا۔ اور المصغوراء کا معنی الصغار (حقیر) ہے اور ارض مصغرۃ کا معنی ہے ایسی زمین جس کی فصل نہ بڑھے۔ یہ ابن السکیت سے منقول ہے۔

عِنْدَ اللّٰهِ، ای من عند اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اور پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، (اصل عبارت ہے) سیصیب الذین أجرموا عند اللہ صغار اور فراء نے کہا ہے: سَیُصِیبُ الَّذِیْنَ أجرمُوا صغار مِنَ اللہ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے سَیُصِیبُ الذین أجرموا صغارٌ ثابتٌ عند اللہ عنقریب انہیں پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثابت ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے احسن ہے، کیونکہ اس میں عندا اپنے محل میں واقع ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور جس (خوش نصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کشادہ کر دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس (بدنصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے تو بنا دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ، بہت تنگ، گویا وہ زبردستی چڑھ رہا ہے آسمان کی طرف، اسی طرح ڈال دیتا ہے اللہ تعالیٰ ناپاکی ان پر جو ایمان نہیں لاتے"۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ یعنی وہ اسلام کے لیے اس کا سینہ وسیع کر دیتا ہے اور اسے توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اس کے نزدیک اس کا اجر و ثواب مزین اور آراستہ کر دیتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: شرح کا معنی شق کرنا ہے، اور اس کی اصل التوسعۃ (وسعت کرنا) ہے۔ اور شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ (زمر:22) کا معنی ہے اس نے اس کا

سینہ اس کی وضاحت و بیان کے ساتھ وسیع کر دیا اور شرحتُ الأمر کا معنی ہے میں نے اس کو بیان کر دیا اور اسے خوب واضح کر دیا۔ اور قریش عورتوں کے لیے خوب وسعت رکھتے تھے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کانت قریش تشرح النساء شرحا یہ توسعۃ اور البسط سے ماخوذ ہے اور یہ عورت کو گدی کے بل چت لٹا کر اس سے وطی کرنا ہے۔ اور الشرح کا معنی الکشف (ظاہر کرنا اور ننگا کرنا) ہے۔ آپ کہتے ہیں: شرحتُ الغامِضَ میں نے ڈھانپی ہوئی چیز کو ظاہر کر دیا، ننگا کر دیا۔ اور اسی سے تشریح اللحم (گوشت کو لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹنا) بھی ہے۔ راجز نے کہا ہے:

كَمْ قَدْ أَكَلْتُ كَبِدًا وَ إِنْفَحَهْ ثُمَّ ادَّخَرْتُ أَلْيَةً مُشَرَّحَهْ

"اور گوشت کا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے۔ اور گوشت کا ہر موٹا اور لمبا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے"۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ اور جس کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے۔ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (تو اس کے سینہ کو بہت تنگ بنا دیتا ہے) یہ قدریہ کا رد ہے۔ اس آیت کی نظیر سنت میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من يُرِدِ اللهُ به خيرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّين (1) (جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی فقاہت اور سمجھ عطا فرما دیتا ہے)۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جب سینہ وسیع اور نور سے منور ہو۔ اور دین سے مراد عبادات ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) (بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) اور اس کے خطاب کی دلیل یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ نہیں فرماتا اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے، اس کی فہم کو (معانی سے) دور کر دیتا ہے اور اسے فقاہت عطا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم

اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا سینہ کھل جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم يدخل القلب نورٌ (ہاں دل میں نور داخل ہو جاتا ہے) تو انہوں نے عرض کی: کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التَّجافِي عن دار الغُرورِ والإنابةُ إلى دار الخلود والإستعدادُ للموت قبل نزول الموت (2) (دار الغرور (دنیا) سے دوری اختیار کرنا اور دار الخلود (آخرت) کی طرف میلان رکھنا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا)۔

اور ابن کثیر نے ضَيْقًا تخفیف کے ساتھ قرأت کی ہے، مثلاً هين اور لين یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور نافع اور ابو بکر نے حَرِجًا کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے: (تنگی) معنی کو مکرر لایا گیا ہے اور یہ لفظ مختلف ہونے کے سبب اچھا اور خوبصورت ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ حَرَجًا قرأت کی ہے، یہ حرجۃ کی جمع ہے۔ اور اس کا معنی بھی بہت زیادہ تنگی کا ہونا ہے اور الحرجۃ اس کا معنی الغیضۃ (گھنے درختوں والی جگہ، جنگل) ہے اور اس کی جمع حرج اور حرجات ہے۔ اور اسی سے ہے فلان یتحرج یعنی وہ اپنے نفس پر گناہوں کے لیے اپنی خواہش کو ترک کرنے پر تنگی محسوس کرتا ہے۔ یہ ہروی نے کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: الحرج کا معنی گھنے درختوں والی جگہ (جنگل) ہے۔ تو گویا کافر کے دل تک حکمت نہیں پہنچ سکتی جیسا کہ کوئی چرنے والا جانور اس جگہ تک نہیں پہنچ سکتا جہاں درخت گھنے ہوں (آپس میں جڑے ہوئے ہوں)

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 1087

2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 542-543

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ معنی مروی ہے اسے مکی اور ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ہر تنگی کو حَرِجٌ اور حَرَجٌ کہلاتا ہے۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: مکان حرج و حرج یعنی وہ تنگ جگہ جہاں درخت کثیر ہوں اور اس تک چرنے والا جانور نہ پہنچ سکتا ہو۔ اور اس طرح بھی قرأت کی گئی ہے: یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا و حَرِجًا اور یہ قائم مقام ہے الوَحَد اور الوَحِد اور الفَرَد اور الفَرِد اور الدنَف اور الدنِف کے (یعنی) دونوں قرأتوں کے مطابق ایک معنی ہے اور اسے کسی اور نے فراء سے بیان کیا ہے اور قد حرِج صدرہ یحرَج حرجا (اس کا سینہ تنگ ہو گیا)۔

اور الحَرَج کا معنی اثم (گناہ) ہے اور الحرج کا معنی الناقة الضامرة (کمزور اور نحیف اونٹنی) بھی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الطویلة علی وجه الأرض (سطح زمین پر پھیلنے اور لمبا ہونے والی) یہ ابوزید سے مروی ہے، اور یہ لفظ مشترک ہے اور الحرج کا معنی وہ لکڑیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں اور ان میں مردے کو اٹھایا جاتا ہے، یہ اصمعی سے منقول ہے۔ اور یہی امرء القیس کا قول بھی ہے:

فإمّا ترَيْنِي لي رِحالة جابر على حَرَجٍ كالقَرِّ تَخْفِق أكفاني

''اور بسا اوقات انہیں عورتوں کی میت پر رکھا جاتا ہے۔

ظلیم کا وصف بیان کرتے ہوئے عنترہ نے کہا ہے۔

يَتْبَعْنَ قُلَّةَ رأسِه وكأنّه حَرَجٌ على نَعْشٍ لهنّ مُخَيَّمِ

اور زجاج نے کہا ہے: الحرج کا معنی ہے بہت زیادہ تنگ ہونا۔ پس جب کہا جائے: فلان حرج الصدر، تو اس کا معنی ہوگا اپنے سینے میں بہت زیادہ تنگی محسوس کرنے والا (یعنی ذو حرج فی صدرہ) اور جب کہا جائے: حِرج تو یہ اسم فاعل ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: حرِج اسم فاعل ہے اور حرج مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل عَدْلٌ و رِضًا۔

قولہ تعالیٰ: كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ اسے ابن کثیر نے صاد کے سکون کے ساتھ مخفف پڑھا ہے، یہ الصعود سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے اوپر چڑھنا۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ایمان سے بھاگنے اور اسے اپنے اوپر ثقیل سمجھنے کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جسے ایسے کام کا مکلف بنایا جائے جسے کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، جیسا کہ آسمان پر چڑھنے کی طاقت نہیں رکھی جا سکتی۔ اور اسی طرح یُصَاعِدُ کا لفظ بھی ہے اور اس کی اصل یَتَصَاعَدُ ہے، تا کو صاد میں ادغام کر دیا گیا ہے اور یہ ابوبکر اور نخعی کی قرأت ہے، مگر اس میں ایک کام کرنے کے بعد فوراً دوسرا کام کرنے کا معنی ہے اور ایسا فعل کام کرنے والے پر انتہائی ثقیل اور بھاری ہوتا ہے۔

اور باقیوں نے اسے الف کے بغیر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اسی کی طرح ہے جو اس سے پہلے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ یکے بعد دیگرے ایسا کام کرنے کا پابند اور مکلف ہوتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا، اسی طرح تیرا یہ قول ہے: يَتَجَرَّعُ اور يَتَفَوَّقُ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پڑھا كَاَنَّمَا يَتَصَعَّدُ نحاس نے کہا ہے: اس قرأت کا معنی اور

اس کی قرأت جس نے یَصَّعَّدُ اور یَصَّاعِدُ پڑھا ہے کا معنی ایک ہے۔ اور دونوں میں معنی یہ ہے کہ کافر وہ ہے جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے تنگ کر دیا ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے، حالانکہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا، تو گویا وہ اس کی استدعا کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے قریب ہے اس کا دل اسلام سے دور بھاگتے ہوئے آسمان کی طرف چڑھ جائے۔

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پر ناپاکی ڈال دیتا ہے، جیسا کہ اس نے ان کے جسموں میں سینہ تنگ کر دیا۔ اور رجس کا لغوی معنی بدبو (النتن) ہے۔ ابن زید (1) نے کہا ہے: یہ عذاب ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رجس سے مراد شیطان ہے (2)، یعنی اللہ تعالیٰ اسے ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رجس سے مراد وہ شی ہے جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور اسی طرح اہل لغت کے نزدیک الرجس سے مراد بدبو ہے، پس آیت کا معنی یہ ہے واللہ اعلم: وہ دنیا میں ان پر لعنت ڈالتا ہے اور آخرت میں عذاب (میں مبتلا کرے گا)۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

"اور یہ ہے راستہ آپ کے رب کا (بالکل) سیدھا، ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا یعنی یہ وہ ہے جس پر اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور مومنین ہیں۔ آپ کے رب کا دین ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ یعنی ہم نے دلائل کو بیان کر دیا ہے۔ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں)

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے ہاں اور وہی ان کا دوست ہے بسبب ان نیک اعمال کے جو وہ کیا کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ یعنی نصیحت قبول کرنے والے کے لیے۔ دَارُ السَّلٰمِ جنت ہے، پس جنت اللہ کا گھر ہے، جس طرح کہ کہا جاتا ہے: الکعبةُ بیتُ اللہ (کعبۃ معظمہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی دار السلامہ ہو، یعنی وہ گھر جس میں آدمی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور عِنْدَ رَبِّهِمْ کا معنی ہے اس کے ہاں ان کے لیے یہ ضمانت دی گئی ہے کہ وہ انہیں اپنے فضل سے اس تک پہنچائے گا۔ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ اور وہی ان کا مددگار اور معاون ہے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِيْۤ اَجَّلْتَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 144　2۔ ایضاً

لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

''اور جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ ان سب کو (اور فرمائے گا) اے جنوں کے گروہ! بہت گمراہ کیا تم نے انسانوں کو، کہیں گے ان کے دوست انسانوں میں سے اے ہمارے رب! فائدہ اٹھایا ہم نے ایک دوسرے سے اور پہنچ گئے ہم اپنی اس معیاد کو جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آگ تمہارا ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہو گے اس میں مگر جسے اللہ تعالیٰ (نجات دینا) چاہے بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے یعنی وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ يَقُوْلُ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مراد قیامت کے دن تمام مخلوق کو میدان حشر میں جمع کرنا ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ اس میں منادی مضاف ہے۔ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (انہیں بہت گمراہ کیا) اس میں وہ مصدر جو مفعول کی طرف مضاف ہے اسے حذف کر دیا گیا اور حرف جر با کو حذف کر دیا (یعنی من الاستمتاع بالانس) اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ اور یہ اس کے قول کو رد کرتا ہے جس نے کہا: بیشک جن وہ ہیں جنہوں نے انسانوں سے فائدہ اٹھایا، کیونکہ انسانوں نے انہیں قبول کیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے والا ہے۔ اور عربی میں تقدیر کلام یہ ہوگی: اِسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بَعْضًا (ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا) پس جنوں نے انسانوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ انہوں نے اس میں لذت محسوس کی کہ انسانوں نے ان کی اطاعت و پیروی کی ہے۔ اور انسان جنات کو قبول کر کے لطف اندوز ہوتے رہے یہاں تک کہ جنوں کے انہیں بہکانے کے سبب انہوں نے زنا کیا اور شراب پیتے رہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے سفر کے دوران جب کسی وادی سے گزرتا اور اسے اپنے اوپر خوف محسوس ہوتا تو وہ کہتا: أعوذ برب هذا الوادي من جميع ما أحذر (میں اس وادی کے سردار کی پناہ مانگتا ہوں ان تمام چیزوں سے جن سے میں ڈرتا ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾ (الجن) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے غرور کو) پس یہی انسانوں کا جنوں سے استمتاع اور فائدہ تھا۔ اور رہا جنوں کا انسانوں سے فائدہ تو وہ یہ کہ وہ انہیں جھوٹی خبریں، کہانت اور سحر القا کرتے رہتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنوں کا انسانوں سے استمتاع یہ تھا کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ جن اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ ان سے وہ تمام چیزیں دور کر دیں جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ اور آیت کا معنی گمراہ ہونے والوں اور گمراہ کرنے والوں کو آخرت میں عالمین کی آنکھوں کے سامنے ڈانٹنا اور جھڑکنا ہے۔

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا اس میں مقررہ مدت سے مراد موت اور قبر ہے اور ہم انتہائی نادم ہو کر آئے ہیں۔ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ یعنی آگ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 128

مثوی کا معنی ٹھکانا، ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ استثناء اوّل کلام میں سے نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ استثنا یوم قیامت کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی تم ہمیشہ آگ میں رہو گے مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے ان کے قبروں سے نکل کر ان کے جمع ہونے کی مقدار اور ان کی مدت حساب کی مقدار میں سے۔ تو اس صورت میں استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا آگ کی طرف راجع ہے، یعنی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تمہیں بعض اوقات میں بغیر آگ کے عذاب دے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: استثناء اہل ایمان کی ہے۔ تو اس بناء پر ما بمعنی من ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ آیت اس کے بارے وقف کو ثابت کر رہی ہے جو ابھی نہیں مرا، جب کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ کہ وہ دنیا میں بغیر عذاب کے رہیں۔ اس آیت کا معنی اس آیت کے معنی کی طرح ہے جو سورۂ ہود میں ہے۔

اور وہ یہ ارشاد ہے: فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ (ہود: 106) وہاں اس کا کامل بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ یعنی انہیں سزا دینے میں اور اپنے جمیع افعال میں (آپ کا رب بڑا دانا ہے)۔ عَلِيْمٌ اور انہیں سزا دینے کی مدار کے بارے سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''اور یونہی ہم مسلط کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو وہ کرتے رہتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا اس کا معنی ہے جس طرح ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے ان کاموں کے متعلق جو میں نے تمہارے لیے بیان کیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے فائدہ اور حظ اٹھاتے ہیں (اسی طرح) میں بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتا ہوں، پھر کل وہ ایک دوسرے سے برأت اختیار کر لیں گے۔ اس تفسیر پر نُوَلِّيْ کا معنی ہے نجعل ولیا (ہم دوست بنا دیتے ہیں)

ابن زید نے کہا ہے: ہم ظالم جنوں کو ظالم انسانوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور وہ انہیں ہلاک اور ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔ یہ ظالموں کے لیے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دے گا۔ اور اس آیت میں وہ تمام داخل ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یا رعیت پر ظلم کرتے ہیں یا ایسا تاجر جو اپنی تجارت میں لوگوں پر ظلم کرتا ہے یا چور وغیرہ۔

اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب تو کسی ظالم کو دیکھے کہ وہ دوسرے ظالم سے انتقام لے رہا ہے تو ٹھہر جا اور اس میں تعجب کرتے ہوئے غور و فکر کر۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے راضی ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات کا والی ان کے نیک لوگوں کو بناتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات پر ان کے شریر لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس نے ظالم کی معاونت کی اللہ تعالیٰ اسے اس پر مسلط کر دے گا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے بعض کو بعض کے سپرد کر دیتے ہیں ان اعمال میں جنہیں وہ کفر میں سے ناپسند کرتے ہیں، جیسا کہ ہم انہیں کل رؤساء کے حوالے کر دیں گے جو انہیں عذاب سے نجات دلانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ یعنی ہم اسی طرح ان کے ساتھ آخرت میں کریں گے جس طرح ہم ان کے ساتھ دنیا میں کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (النساء:115) کے تحت کہا گیا ہے: کہ ہم اسے اس کے حوالے کر دیں گے جس کے حوالے اس نے اپنے آپ کو کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے بارے شر کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ ان کے معاملات ان کے شریر لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ:30) (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے)

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَ یُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

”اے گروہ جنوں اور انسانوں کے! کیا نہیں آئے تمہارے پاس رسول تم ہی میں سے سناتے تھے تمہیں ہماری آیتیں اور ڈراتے تھے تمہیں تمہاری اس دن کی ملاقات سے، کہیں گے: ہم گواہی دیتے ہیں اپنے خلاف اور دھوکہ میں مبتلا کیا تھا انہیں دنیوی زندگی نے اور گواہی دیں گے اپنے خلاف کہ وہ کفر کرتے رہے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ یعنی جس دن ہم انہیں جمع کریں گے تو ہم ان کو کہیں گے۔ لھم کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے؟ پھر اسے کلام سے حذف کر دیا گیا، تو وہ اس بارے میں اعتراف کریں گے جس میں ان کی رسوائی ہوگی اور مِّنْكُمْ کا معنی ہے فی الخلق والتکلیف والمخاطبۃ (یعنی تخلیق میں، احکام کا مکلف ہونے میں اور مخاطب ہونے میں وہ تم میں سے تھے) اور جب جن ان میں سے ہیں جنہیں خطاب کیا جا رہا ہے اور وہ عقل اور سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں تو فرمایا: مِّنْكُمْ اگرچہ رسول انسانوں میں سے تھے اور خطاب میں انسانوں کو اسی طرح غلبہ دیا گیا ہے جس طرح مذکر مونث پر (یعنی مردوں کو عورتوں پر) غلبہ دیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے فرمایا: جنوں کے رسول وہ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے پاس وہ آیات پہنچائیں جو انہوں نے وحی سے سنی تھیں، جیسا کہ فرمایا: وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾ (الاحقاف) (تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے)

حضرت مقاتل اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما (2) نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے اسی طرح رسول بنائے جس طرح اس نے انسانوں میں سے رسول بنائے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: رسول انسانوں میں سے ہیں اور ڈرانے والے جنوں میں سے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾ (الاحقاف) اور یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ احقاف میں آئے گا۔ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: حضور نبی رحمت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 170 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 44

محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے انسانوں اور جنوں تمام کی طرف رسول بھیجے جاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أعطیت خمسًا لم یعطهن نبیٌّ قبلی کان کلّ نبیٍّ یُبعث إلی قومه خاصّة و بعثتُ إلی کلّ أحمرَ و أسودَ، الحدیث (1) مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا رہا اور مجھے ہر سرخ و سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کانتِ الرُّسلُ تُبعَثُ إلی الإنس وأنّ محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم بُعِثَ إلی الجنّ والإنسِ (2) (پہلے انبیاء ورسل علیہم السلام انسانوں کی طرف مبعوث کیے جاتے رہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس کی طرف (نبی بنا کر) بھیجے گئے)

اسے ابو اللیث سمرقندی نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنوں میں سے ایک قوم نے انبیاء علیہم السلام کا کلام سنا پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر گئے اور انہیں اس کے بارے آگاہ کیا، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ تو انہیں کو رسل اللہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ انہیں رسول بنائے جانے پر نص موجود نہیں۔

اور قرآن کریم میں ہے: یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿ (الرحمٰن) ای من احدهما (یعنی ان میں سے ایک سے نکلتے ہیں) اور بلاشبہ وہ ملح (نمکین) سے نکلتے ہیں نہ کہ عذب (میٹھے) سے، پس اسی طرح انسانوں میں سے رسول ہیں نہ کہ جنوں میں سے، پس منکم کا معنی ہے من أحدکم (تم میں سے ایک سے)

اور یہ جائز ہے، کیونکہ دونوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ کے محل میں رسل کو تمام میں سے قرار دیا ہے، کیونکہ قیامت کا عرصہ جن وانس دونوں کو شامل ہوگا اور ان پر حساب ہوگا نہ کہ اور مخلوق پر، تو جب اس عرصہ میں ثواب وعقاب کے اعتبار سے ایک حساب میں ہو گئے تو اس دن انہیں ایک خطاب کے ساتھ خطاب کیا جائے گا، گویا کہ وہ ایک جماعت ہیں، کیونکہ ان کی خلقت کی ابتدا عبودیت کے لیے ہے اور ثواب وعقاب عبودیت (بندگی) پر ہوگا، اور اس لیے بھی کہ جنوں کی اصل آگ کے شعلوں سے ہے اور ہماری اصل مٹی سے ہے اور ان کی تخلیق کا انداز ہماری خلقت کے سوا ہے، پس ان میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر۔ اور ہمارا دشمن ابلیس ان کا بھی دشمن ہے۔ وہ ان کے مومنوں سے عداوت رکھتا ہے اور ان کے کافروں سے دوستی رکھتا ہے۔ اور ان میں خواہش پرست بھی ہیں، مثلاً شیعہ، قدریہ اور مرجئہ جو ہماری کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجن میں ان کے بارے بیان کیا ہے فرمان خداوندی ہے: وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ (الجن: 14) (اور بے شک ہم سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم)

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿ (الجن) (اور ہم میں سے بعض نیک بھی ہیں اور بعض اور طرح کے ہم بھی تو کئی راستوں پر گامزن ہیں) اس کا بیان وہاں آئے گا۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199　2۔ زاد المسیر لابن الجوزی، جلد 3، صفحہ 125

یَقُصُّوْنَ یہ محل رفع میں ہے اور رسل کی صفت ہے۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا یعنی ہم ان کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے پیغام پہنچایا۔ وَ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو خطاب ہے، یعنی وہ ہیں جنہیں دنیوی زندگی نے دھوکہ دیا ہے یعنی اس نے انہیں دھوکہ دیا اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ہمیشہ رہے گی اور انہیں یہ خوف ہوا کہ اگر وہ ایمان لائے تو وہ ان سے ختم ہو جائے گی (چھن جائے گی)۔ وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی انہوں نے اپنے کفر کا اعتراف کر لیا۔ حضرت مقاتل (1) نے کہا ہے: یہ اس وقت ہوگا جب اعضاء بدن ان کے خلاف شرک کی گواہی دیں گے۔ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور ان کرتوتوں کے بارے جو وہ کرتے تھے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝

''یہ اس لیے کہ نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو ظلم سے اس حال میں کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ یہ سیبویہ کے نزدیک محل رفع میں ہے: یعنی الامرُ ذالك اور ان مخففہ من الثقیلہ ہے۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ یہ کیا کیونکہ میں بستیوں کو ان کے ظلم کے سبب ہلاک کرنے والا نہیں ہوں، یعنی ان کے شرک کے سبب اس سے پہلے کہ ان کی طرف رسل علیہم السلام بھیجے جائیں کہ وہ یہ کہیں: ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا آیا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ڈرانے والا آیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں نہیں ہوں کہ بستی کے رہنے والوں میں سے کسی ایک کے شرک کرنے کے سبب پوری بستی کو ہلاک کر دوں، تو یہ اس ارشاد کی مثل ہے وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ)

اور اگر وہ رسل علیہم السلام کی بعثت سے پہلے انہیں ہلاک کر دے تو اس کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ: 118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ذٰلِكَ محل نصب میں ہو اور معنی یہ ہو: فَعَلَ ذَالِكَ بِهِمْ (اس نے یہ ان کے ساتھ کیا) کیونکہ وہ بستیوں کو ظلم کے سبب ہلاک نہیں کرتا۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝

''اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے مطابق، اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا یعنی جن وانس میں سے ہر ایک کے لیے درجے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 94

كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ (الاحقاف) (یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے)

پھر فرمایا: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ (الاحقاف) (اور ہر ایک کے لیے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ جنوں میں سے مطیع وفرمانبردار جنت میں ہوں گے اور گنہگار جہنم میں ہوں گے۔ اسی طرح انسان بھی ہیں اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہی زیادہ صحیح ہے پس اسے جان لو۔

اور وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ کا معنی یہ ہے کہ طاعت اور نیکی کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے ثواب وجزا میں درجے ہیں۔ اور معصیت وگناہ کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے عقاب اور سزا میں درجے ہیں۔

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ یعنی نہ وہ غافل ہے اور نہ وہ بھولنے والا ہے۔ اور غفلت کا معنی یہ ہے أن یذھبَ الشیٔ عنك لاشتغالِكَ بغیرہ کہ کسی غیر میں پڑے مشغول ہونے کی وجہ سے کوئی شی تجھ سے چلی جائے (ضائع ہو جائے) عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ابن عامر نے اسے تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یا کے ساتھ۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور آپ کا پروردگار غنی ہے رحمت والا ہے اگر چاہے تو لے جائے (تباہ کر دے) تمہیں اور تمہاری جگہ لے آئے تمہارے بعد جسے چاہے جیسے پیدا کیا تمہیں دوسری قوم کی اولاد سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ یعنی آپ کا پروردگار اپنی مخلوق سے اور ان کے اعمال سے غنی ہے (اسے ان کی کوئی حاجت اور پرواہ نہیں ہے) ذُو الرَّحْمَةِ وہ اپنے دوستوں اور اہل طاعت کے ساتھ رحمت کا سلوک کرنے والا ہے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر وہ چاہے تو تمہیں موت دے کر اور عذاب کے ساتھ تباہ کر کے ختم کر دے۔

وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ یعنی وہ تمہاری جگہ ایک دوسری مخلوق لے آئے جو تم سے زیادہ فضیلت والی اور زیادہ اطاعت شعار ہو۔ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے، یعنی يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ استخلافا مثل ما انشاءکم (تمہارے بعد تمہاری جگہ لے آئے جسے لانا چاہے اسی کی مثل جیسے اس نے تمہیں پیدا کیا دوسری قوم کی اولاد سے) اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہیں: اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (النساء: 133) (اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو)

اور وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (محمد: 38) (اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گا) پس معنی یہ ہے کہ تمہاری جگہ دوسروں کو بدل دے، جیسا کہ تو کہتا ہے: أعطیتُك من دینارِكَ ثوبًا (میں نے تجھے تیرے دینار کے بدلے کپڑا دیا)

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۱۳۴

"بے شک جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور آنے والا ہے اور نہیں ہو تم (اللہ کو) عاجز کرنے والے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ أوعدت فی الشر سے ہو (تجھے شر کے بارے میں وعید سنائی گئی) اور اس کا مصدر الإیعاد ہو اور مراد آخرت کا عذاب ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وعدت سے ہو یعنی وہ ساعت جس کے آنے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کے آنے میں خیر اور شر دونوں ہیں پس خیر کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس کا یہ معنی حسن سے مروی ہے۔ وَّمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ کہا جاتا ہے: أعجزنی فلانٌ (فلاں نے مجھے عاجز کر دیا ہے) یعنی فاتنی وغلبنی (فلاں میری طرف آگے بڑھا اور مجھ پر غالب آ گیا)

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۳۵

"آپ فرمایئے: اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرنے والا ہوں، تو تم جان لو گے کہ کس لیے ہوتا ہے اچھا انجام اس دنیا کے گھر کا بے شک فلاح نہیں پاتے ظلم کرنے والے"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ابوبکر نے جمع کے ساتھ مکاناتکم پڑھا ہے۔ اور مکانۃ کا معنی طریقہ ہے اور آیت کا معنی یہ ہے: تم اس طریقہ پر ثابت (قائم) رہو جس پر تم ہو اور میں اس پر ثابت ہوں جس پر میں ہوں۔ اور اگر کہا جائے: کیسے یہ جائز ہے کہ انہیں اس پر ثابت رہنے کا حکم دیا جائے جس پر وہ ہیں، حالانکہ وہ کفار ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (التوبہ: 82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ) اور اس پر دلیل فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ہے، یعنی اچھا انجام وہ ہے جس پر اس کے صاحب کی تعریف کی جاتی ہے، یعنی جس کے لیے دار الاسلام میں مدد و نصرت ہو اور جس کے لیے زمین کی وراثت ہو اور جس کے لیے دار آخرت یعنی جنت ہو۔

زجاج (1) نے کہا ہے: مَكَانَتِكُمْ کا مفہوم ہے دنیا میں تمہارا مضبوط اور جمے ہوئے قدموں والا ہونا۔ (تمکنکم فی الدنیا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت نخعی نے کہا ہے اس کا معنی ہے: علی ناحیتکم (اپنی جہت پر) اور قتبی نے کہا ہے: علی موضعکم (اپنی جگہ پر) اِنِّيْ عَامِلٌ میں کام کرنے والا ہوں اپنی جگہ پر علی مکانتی پھر دلالت حال کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ اور من، مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ میں محل نصب میں ہے اور یہ بمعنی الذی ہے، کیونکہ علم کا واقع ہونا اسی پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، کیونکہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا پس فعل معلق ہو جائے گا، یعنی تعلمون أینا تکون لہ عاقبۃ الدار (تم جانتے ہو ہم میں سے کون ہے جس کے لیے دنیا کے گھر کا انجام اچھا ہو گا) یہ اس قول کی طرح ہے: لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى (الکہف: 12) (تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 173

سکتا ہے) حمزہ اور کسائی نے مَن یکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآىِٕنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىِٕهِمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اور انہوں نے بنا رکھا ہے الله کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ اور کہتے ہیں یہ الله تعالیٰ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے۔ تو وہ (حصہ) جو ہو ان کے شریکوں کے لیے تو وہ نہیں پہنچتا الله تعالیٰ کو اور جو (حصہ) ہو الله تعالیٰ کے لیے تو وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا اس میں ایک مسئلہ ہے:

اور کہا جاتا ہے: ذَرَاَ یَذْرَاُ ذَرْاً، ای خَلَقَ (اس نے پیدا کیا) اور کلام میں حذف اور اختصار ہے اور وہ یہ ہے وجعلوا لأصنامھم نصیبا (اور انہوں نے اپنے بتوں کے لیے حصہ مقرر کیا) اور اس پر دلیل مابعد کلام ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جسے شیطان نے ان کے لیے آراستہ کیا اور انہیں گمراہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مال کا ایک مقررہ حصہ اپنے گمان کے مطابق الله تعالیٰ کی طرف پھیر دیا اور ایک حصہ اپنے بتوں کی طرف۔ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے اور معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ وہ ایک جز الله کے لیے اور ایک جز اپنے شرکاء کے لیے مقرر کر دیتے اور جب ان کے شریکوں کا حصہ ان پر خرچ کرنے کی وجہ سے اور انہیں غلاف وغیرہ پہنانے کی وجہ سے ختم ہو جاتا تو وہ اس کا عوض ادا کرنے کے لیے اس حصے سے لے لیتے جو الله تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا اور جب وہ حصہ جو الله تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا وہ مہمانوں اور مساکین پر خرچ کرنے کے سبب ختم ہو جاتا تو وہ اس سے بطور عوض اور بدلہ کوئی شے نہ لیتے اور کہتے: الله تعالیٰ اس سے مستغنی ہے اور ہمارے شریک فقراء اور محتاج ہیں۔ اور یہ ان کی جہالت اور ان کے کذب میں سے تھا۔ اور زعم کا معنی کذب ہے۔

قاضی شریح نے کہا ہے: بلاشبہ ہر شے کے لیے کنیت ہے اور جھوٹ کی کنیت زعموا ہے اور وہ ان چیزوں میں جھوٹ بولتے تھے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی شرعی حکم نازل نہیں ہوا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو عرب کی جہالت کو جاننا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ سورۃ الانعام کی ایک سو تیس سے اوپر والی آیات پڑھے اس قول تک قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام:140)

ابن عربی (2) نے کہا ہے: یہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے صحیح کلام ہے، کیونکہ انہوں نے معرفت اور عدل کے بغیر اپنی عاجز عقلوں کے ساتھ حلال و حرام کی تقسیم میں بیوقوفانہ تصرف کیا، اور جہالت کے سبب انہوں نے جو تصرف کیا اس میں بتوں کو الله

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 500 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 252

بنانا سب سے بڑی جہالت اور سب سے بڑا جرم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر زیادتی کرنا مخلوق پر زیادتی کرنے کی نسبت بہت بڑا جرم ہے۔ اور اس بارے میں دلیل کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے، اپنی صفات میں یکتا ہے اور اپنی مخلوقات میں واحد ہے اس دلیل سے زیادہ بین اور واضح ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (1) سے کہا: بلاشبہ تمہاری عقلیں کامل تھیں اور تم وافر ذہانت اور دانائی رکھتے تھے، پھر تم پتھروں کی پوجا کرتے رہے تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ عقلیں ہیں قریب ہے کہ انہیں کوئی پیدا کرنے والا ہو۔ پس عربوں کی عقلی کمزوری اور ان کی جہالت میں سے یہ وہ امر ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی اور اسلام نے آکر اسے مٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اسے باطل کر دیا۔ پس ہمارے لیے ظاہر یہ ہے کہ ہم اسے مار دیں یہاں تک کہ وہ ظاہر نہ ہو، اور ہم اسے بھول جائیں یہاں تک کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے، مگر ہمارے رب کریم نے تو اس کا ذکر اپنی نص کے ساتھ کیا ہے اور اسے اپنی شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جس طرح کہ اس نے اپنے ساتھ کفر کرنے والوں کے کفر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس میں حکمت ہے۔ واللہ اعلم

اس کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا ہے، اور اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے کہ کفر اور باہم میل جول (آمیزش) دونوں قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ اور یحییٰ بن وثاب، سلمی، اعمش اور کسائی نے بزعمہم زا کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ، ای إلی المساکین یعنی وہ حصہ جو ان کے شریکوں کے لیے ہے وہ مساکین تک نہیں پہنچ سکتا۔ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ یعنی ان کا فیصلہ کتنا برا فیصلہ ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: جب وہ ایسے جانور کو ذبح کرتے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہوتا تو وہ اس پر بتوں کا نام لیتے، اور جب اسے ذبح کرتے جو ان کے بتوں کے لیے مختص ہوتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتے، تو ارشاد: فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ کا یہی معنی ہے، پس ان کا ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنا مذموم تھا اور یہ ان جانوروں میں داخل ہے جنہیں اس بنا پر کھانے سے منع کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور یونہی خوشنما بنا دیا ہے، بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو ان کے شریکوں نے تاکہ ہلاک کر دیں انہیں اور مشتبہ کر دیں ان پر ان کا دین اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ایسا نہ کرتے، تو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 255

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اس کا معنی ہے جس طرح انہوں نے ان کے لیے اسے خوشنما بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک حصہ مقرر کردیں اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لیے مقرر کردیں اسی طرح ان کے شریکوں نے بہت سے مشرکین کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو خوشنما بنا دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے لیے فقر و فاقہ کے خوف سے بیٹیوں کے قتل کو خوشنما بنا دیا گیا۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے: یہاں ان کے شریکوں سے مراد وہ ہیں جو بتوں کی خدمت میں رہا کرتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے (2) کہ مراد لوگوں میں گمراہ اور خواہش پرست لوگ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد شیاطین ہیں۔

اور اس سے اشارہ الوأد کی طرف ہے اور وہ فقر و فاقہ کے خوف سے اور اس مدد و نصرت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس سے انہیں محروم رکھا گیا بیٹی کو زندہ درگور کرنا ہے۔ اور شیاطین کو شرکاء کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ان کی اطاعت و پیروی کی ہے تو انہوں نے انہیں طاقت و فرمانبرداری کے وجوب میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا تھا کہ اگر اس کے اتنے بچے پیدا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک قربانی دے گا، جیسا کہ حضرت عبدالمطلب (3) نے ایسا کیا جب انہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو ذبح کرنے کی نذر مانی۔ پھر کہا گیا ہے: آیت میں چار قراءتیں ہیں، ان میں سے اصح جمہور کی قراءت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اور یہ اہل حرمین، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ شُرَكَآؤُهُمْ، زَيَّنَ کی وجہ سے مرفوع ہے، کیونکہ انہوں نے خوشنما بنایا اور انہوں نے قتل نہ کیا اور قَتْلَ، زَيَّنَ کے سبب منصوب ہے۔ اور اَوْلَادِهِمْ مفعول کی طرف مضاف ہے (☆)۔

اور مصدر میں اصل یہ ہے کہ اسے فاعل کی طرف مضاف کیا جائے، کیونکہ اسی نے اسے بنایا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے مستغنی نہیں اور وہ مفعول سے مستغنی ہوتا ہے۔ اور وہ یہاں لفظاً مفعول کی طرف مضاف ہے لیکن معناً فاعل کی طرف مضاف ہے، کیونکہ تقدیر کلام ہے: زین لکثیر من المشرکین قتلهم اولادهم شرکاءهم (بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکاء نے یہ خوشنما بنا دیا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ پھر مضاف کو حذف کردیا گیا اور وہ فاعل ہے جس طرح اس قول باری تعالیٰ سے حذف کیا گیا ہے۔ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ (فصلت: 49) یعنی یہ من دعائه الخیر ہے۔ اس میں ہا ضمیر دعا کا فاعل ہے، یعنی انسان خیر اور بھلائی کی دعا مانگنے سے نہیں اکتاتا۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ مکی نے کہا ہے: یہ قراءت ہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اس میں اعراب صحیح ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر جمہور کا عمل ہے۔

اور دوسری قراءت زُيِّنَ فعل مجہول کے ساتھ ہے۔ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلُ یہ رفع کے ساتھ ہے۔ اَوْلَادِهِمْ جر

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 754

☆ متن میں عبارت اسی طرح ہے جب کہ مراد یہ ہے لفظ قتل اپنے مفعول "اولادھم" کی طرف مضاف ہے۔

کے ساتھ ہے۔ اور شُرَكَآؤُهُمْ رفع کے ساتھ ہے۔ یہ حسن کی قرأت ہے اور ابن عامر اور اہل شام نے زُین زا مضموم کے ساتھ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ، قَتْلَ کو رفع کے ساتھ اور اَوْلَادِهِمْ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ شُرَكَآؤُهُمْ اس میں مجرور ہے جو ابو عبید نے بیان کیا ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور نے اہل شام سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (یعنی اس میں زا مضموم، قتل مضموم اور اولادھم اور شرکائھم دونوں مکسور ہیں) پس دوسری قراءت (یعنی) حسن کی قراءت جائز ہے اس میں قتل نائب الفاعل ہوگا، اور شرکاؤھم اس فعل مضمر کے سبب مرفوع ہوگا جس پر زین دلالت کرتا ہے یعنی زینہ شرکاؤھم اور اسی وجہ سے ضرب زید عمرو پڑھنا جائز ہوتا ہے، بمعنی ضربہ عمرو اور سیبویہ نے بیان کیا ہے۔

لِيُبْكَ يَزِيْدُ ضَارِعٌ لِخُصُوْمَةٍ یعنی یبکیہ ضارع (1)

ابن عامر اور عامر نے ابو بکر کی روایت سے اس طرح قراءت کی ہے: يُسَبَّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ (النور) تقدیر کلام ہے یسبحہ رجال اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے پڑھا ہے: قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ (البروج) بمعنی قتلھم النار۔ نحاس نے کہا ہے: اور وہ جو ابو عبید نے ابن عامر اور اہل شام سے بیان کیا ہے وہ نہ کلام میں جائز ہے اور نہ ہی شعر میں، البتہ نحویوں نے ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے ساتھ تفریق کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح فاصلہ نہیں ہوتا، اور رہے ظروف کے علاوہ دوسرے اسماء تو ان کے ساتھ فرق کرنا غلطی ہے۔ مکی نے کہا ہے: اس قراءت میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق کی وجہ سے ضعف اور کمزوری ہے، کیونکہ شعر میں اس قسم کی تفریق ظرفوں کے ساتھ جائز ہوتی ہے کیونکہ ان میں اتنی وسعت پائی جاتی ہے اور وہ مفعول بہ میں شعر میں بھی بعید ہے۔ لہٰذا قراءت میں اس کو جائز قرار دینا اس سے بھی بعید تیر ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: ابن عامر کی یہ قراءت مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق ہونے کی بنا پر ہے، اور اس کی مثل شاعر کا قول ہے:

فَزَجَجْتُهَا　بِمَزَجَّةٍ　زَجَّ الْقَلُوْصَ أَبِي مَزَادَةَ (2)

اس میں مراد زجّ أبي مزادة القلوص ہے۔

اور دوسرا شعر ہے:

تَمُرُّ عَلٰى مَا تَسْتَمِرُّ وَ قَدْ شَفَتْ　غَلَائِلَ عَبْدُ الْقَيْسِ مِنْهَا صُدُوْرِهَا

اس میں مراد شفت عبدُ القیس غلائل صدورھا ہے۔

(پہلے شعر میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان مفعول بہ کا اور دوسرے میں فاعل کا فاصلہ ہے)

ابو غانم احمد بن حمدان نحوی نے کہا ہے: ابن عامر کی قراءت عربی لغت میں جائز نہیں ہے اور یہ ایک عالم کی پھسلاہٹ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 349　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 350

ہے، اور جب ایک عالم (راہ راست سے) پھسل جائے تو اس کی اتباع اور پیروی جائز نہیں ہوتی، اور اس کے قول کو اجماع کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور اسی طرح واجب ہوتا ہے کہ اسے بھی اجماع کی طرف لوٹا دیا جائے جو ان میں پھسل جائے یا بھول جائے اور یہ غیر صحیح پر اصرار کرنے سے اولیٰ اور بہتر ہوتا ہے، البتہ انہوں نے شاعر کو ضرورت۔ کے تحت اجازت دی ہے کہ وہ ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کرے کیونکہ یہ فاصلہ شمار نہیں ہوتا۔ جیسے کسی نے کہا:

كماخُطَّ الكتاب بكفِ يوما يهودِيٍ يُقارِبُ أو يُزيلُ(1)

اور دوسرے نے کہا:

كأنّ أصواتَ مِن إيغالهن بنا أواخِرِ المَيْسِ أصواتُ الفَرارِيجِ

اور ایک اور شاعر نے کہا:

لمّا رأت ساتِيدَما استعبَرَتْ لِلّهِ دَرُّ اليومَ مَنْ لَامَها

(مذکورہ تینوں اشعار میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے)

اور علامہ قشیری نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے یہ قبیح ہے اور یہ محال ہے، کیونکہ جب ایک قراءت تواتر کے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ فصیح ہوتی ہے نہ کہ قبیح۔ اور کلام عرب میں یہ موجود ہے اور مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں شرکائهم یاء کے ساتھ موجود ہے(2) اور یہ ابن عامر کی قراءت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قراءت میں قتل کی اضافت شرکاء کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ شرکاء وہی ہیں جنہوں نے اسے خوشنما بنایا اور اس کی دعوت دی، پس فعل اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے اور اصل میں یہی واجب ہوتا ہے لیکن انہوں نے مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کر دیا ہے اور مفعول کو مقدم کیا ہے اور اسے اپنے حال پر منصوب چھوڑ دیا ہے، جب کہ معنی میں وہ متاخر ہے، اور مضاف الیہ کو موخر کیا ہے اور اسے اپنے حال پر مجرور چھوڑ دیا ہے، جب کہ وہ متقدم اور قتل کے بعد تھا اور تقدیر عبارت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ یعنی ان قتل شرکاؤهم اولادهم (یعنی ان کے شریکوں نے ان کی اولاد کو قتل کیا)

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ ابو عبید کے سوا نے بیان کیا ہے وہ چوتھی قراءت ہے اور وہ جائز ہے اس بنا پر کہ ان کے شرکاء ان کی اولاد کا بدل ہو گئے، کیونکہ وہ نسب اور میراث میں ان کے شریک تھے۔ لِيُرْدُوْهُمْ اس میں لام کی ہے اور ارداء کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ اور وہ ان پر مشتبہ کریں ان کا وہ دین جو ان کے لیے پسندیدہ ہے، یعنی وہ انہیں باطل کا حکم دیتے ہیں اور انہیں اپنے دین کے بارے میں شک میں ڈالتے ہیں۔

اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اور اس میں اولاد کا قتل نہیں تھا، پس حق پر پردہ ڈال دیا جائے گا تو اس کے سبب وہ شک اور التباس میں واقع ہو جائیں گے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے۔ اور یہ قدریہ کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 350
2۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 357۔ تفسیر الرازی، جلد 13، صفحہ 206

رد ہے۔ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ اس افترا اور بہتان سے مراد ان کا یہ قول ہے اِنَّ لِلّٰهِ شُرَكَاءَ (کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں)

وَ قَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور بولے یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کوئی نہیں کھا سکتا انہیں سوائے اس کے جسے ہم چاہیں (یہ بات) اپنے گمان سے (کہتے ہیں) اور بعض مویشی ہیں حرام ہیں جن کی پشتیں (سواری کے لیے) اور بعض مویشی ہیں کہ نہیں ذکر کرتے نام خدا ان (کی ذبح) پر (یہ سب محض) افترا ہے اللہ پر عنقریب سزا دے گا انہیں جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت کی ایک دوسری قسم بیان کی ہے۔ ابان بن عثمان نے حُجُرٌ حا اور جیم کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور حسن اور قتادہ نے حا کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ حَجْرٌ پڑھا ہے۔ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور حسن سے حا کے ضمہ کے ساتھ حُجْرٌ بھی منقول ہے۔

ابو عبید نے ہارون سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سارے قرآن کریم میں حِجْرٌ کے لفظ کو حسن حا کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں سوائے اس قول کے: بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ (الفرقان) اس مقام پر وہ کسرہ پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے وَحَرْثٌ حِرْجٌ اس میں را جیم سے پہلے ہے۔ اسی طرح مصحف ابی میں ہے اور اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ جبذ اور جذب کی مثل ہے۔ اور دوسرا قول، اور وہی اصح ہے۔ کہ یہ الحرج سے ہے، کیونکہ حرج (بکسر حاء) لغت حرج (بفتح الحاء) ہی ہے اور اس کا معنی تنگی اور گناہ ہے۔ پس اس کا معنی ہوگا حرام۔ اور اسی سے ہے فلاں یتحرج یعنی فلاں ایسے کام میں داخل ہونے سے اپنے اوپر تنگی محسوس کرتا ہے جو حرام میں سے اس پر مشتبہ ہو۔

اور الحجر لفظ مشترک ہے اور یہاں اس کا معنی حرام ہے، اور اس کا اصل معنی روکنا ہے اور عقل کو حجر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ فلان فی حجر القاضی یعنی وہ قاضی کی حفاظت (نگہداشت) میں ہے۔ حجرت علی الصبی حجرا میں نے بچے پر پابندی عائد کر دی) اور الحجر کا معنی عقل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ (الفجر) (یقیناً اس میں قسم ہے عقل مند کے لیے) حجر کا معنی مونث گھوڑا بھی ہے اور حجر کا معنی قرابت بھی ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُقْصُوْهُ عَنِّيْ وَإِنَّهُ لَذُوْ حَسَبٍ دَانٍ إِلَيَّ وَذُوْ حِجْرٍ

اور حجر الإنسان وحجرہ (آدمی کے قرابت دار) اس میں دونوں لغتیں ہیں اور فتحہ اکثر ہے، یعنی انہوں نے جانور اور کھیتی حرام قرار دی اور اسے بتوں کے لیے خاص کر دیا اور انہوں نے کہا: لَا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ اور ان سے مراد بتوں کے خدام ہیں، پھر بیان فرمایا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کے بارے شریعت نے کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ اسی لیے فرمایا: بِزَعْمِهِمْ۔

وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا ان سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں وہ اپنے الہوں کے لیے روک کر رکھتے تھے جیسا کہ حصہ والی بات پہلے گزر چکی ہے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان سے مراد بحیرہ، وصیلہ، اور حام ہیں۔ وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا یعنی وہ جانور جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے۔ اور ابو وائل (1) نے کہا ہے: ان پر وہ حج نہیں کرتے تھے۔

افْتِرَآءً یعنی (اللہ تعالیٰ پر) افترا اور بہتان لگانے کے لیے علی اللہ کیونکہ وہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اور یہ (افتراء) مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی یفترون افتراء، تو اس صورت مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔

وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۳۹﴾

"اور بولے جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ نرا ہمارے مردوں کے لیے ہے اور حرام ہے ہماری بیویوں پر اور اگر وہ مرا ہوا (پیدا) ہو تو پھر وہ سب (مرد و زن) اس میں حصہ دار ہیں۔ اللہ جلدی بدلہ دے گا انہیں ان کے اس بیان کا بے شک وہ حکمت والا علم والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا یہ ان کی جہالت کی ایک اور نوع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ دودھ ہے۔ اسے انہوں نے مردوں کے لیے حلال قرار دیا اور عورتوں پر حرام قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ان کے پیٹوں میں موجود بچے ہیں۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ ہم مردوں کے لیے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی مر گیا تو اسے مرد اور عورتیں سبھی کھا سکیں گے۔ اور خَالِصَةٌ میں ھا خلوص میں اظہار مبالغہ کے لیے (یعنی وہ خالصۃ مردوں کے لیے ہیں)۔ اور اسی کی مثل رجل علامۃ و نسابۃ ہے (2) (یعنی ان کے آخر میں تا مبالغہ کے لیے ہے) یہ کسائی اور اخفش سے مروی ہے۔ اور خَالِصَةٌ مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور وہ ما ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اس خَالِصَةٌ کی تانیث الانعام کے مونث ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور ایک قوم کے نزدیک یہ قول غلط ہے، کیونکہ جو کچھ ان کے شکموں میں ہے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ اور یہ اس قول سے مشابہت نہیں رکھتا: یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ (یوسف: 10) کیونکہ اس میں سیارہ کا بعض بھی سیارہ ہی ہے اور یہ لازم نہیں آتا۔

فراء نے کہا ہے: چونکہ جو جانوروں کے شکموں میں ہیں وہ بھی انہیں کی مثل جانور ہیں، لہٰذا ان جانوروں (لفظ الانعام) کے مونث ہونے کی وجہ سے انہیں بھی مونث قرار دیا گیا ہے، یعنی الأنعام التی فی بطون الأنعام خالصۃ لذکورنا (وہ چوپائے جو ان چوپاؤں کے شکموں میں ہیں نرے ہمارے مردوں کے لیے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ جماعت جو شکموں میں ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: بلاشبہ ما سے مراد دودھ اور جنین دونوں ہو سکتے ہیں، لہٰذا تانیث معنی کے اعتبار سے اور تذکیر (مذکر لانا) لفظ کی بنا پر ہے۔ اور اسی لیے کہا ہے: مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا یعنی لفظ کی بنا پر اسے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اگر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174

2۔ ایضاً

معنی کی رعایت کرتے تو کہتے ومحرمۃ اور اعمش کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے اور وہ خالص بغیر ہا کے ہے۔ کسائی نے کہا ہے: خالص اور خالصۃ دونوں کا معنی ایک ہے، مگر ہا مبالغہ کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رجل داهية وعلامة جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے خَالِصَةٌ منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اس ظرف کی ضمیر سے حال ہے جو ما کا صلہ ہے اور مبتدا کی خبر محذوف ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: الذی فی الدار قائما زیدٌ یہ بصریوں کا مذہب ہے اور فراء کے نزدیک بالیقین منصوب ہے۔ اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر کی قراءت میں خالصا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خالصه علی الاضافت پڑھا ہے پس یہ مبتدا ثانی ہوگا اور خبر لذکورنا ہوگی اور پھر جملہ ما کی خبر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خالصه، ما سے بدل ہو۔ پس اس میں یہ پانچ قرائتیں ہیں۔

وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا یعنی ہماری بیٹیوں پر وہ حرام ہیں۔ یہ ابن زید سے منقول ہے اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے: مراد ان کی عورتیں ہیں۔ وَ اِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، یعنی اور اگر وہ مردہ ہوا جوان چوپاؤں کے شکموں میں ہے۔

فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ تو مرد اور عورتیں سبھی اس میں شریک ہوں گے اور فرمایا فیہ اس لیے کہ میتۃ سے مراد حیوان ہے اور یا کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے، (اسی وجہ سے) فیہا نہیں کہا۔ میتۃ رفع کے ساتھ بمعنی تقع یا تحدث ہے (اگر مردہ پیدا ہوگا) میتۃ نصب کے ساتھ ہو (عبارت ہوگی) وان تکن النسمة میتة (اور اگر پیدا ہونے والا جانور مردہ ہوا)

سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جلدی ہی ان کے کذب اور بہتان کا بدلہ دے گا، یعنی انہیں اس پر عذاب دے گا۔ اور وَصْفَهُمْ حرف جار محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ای بوصفهم اور آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عالم کے لیے چاہیے کہ وہ اپنے مخالف کے قول کو پڑھے اور سمجھے اگرچہ اس پر عمل نہ کرے تاکہ وہ اس کے قول کے فاسد ہونے کو جان لے اور یہ جان لے کہ اس پر کیسے رد کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ان کے اقوال کا علم دیا اہل زمانہ میں سے جنہوں نے ان کی مخالفت کی، تاکہ وہ ان کے قول کے فساد کو جان لیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۠﴿۱۴۰﴾

''یقیناً نقصان اٹھایا جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر جانے اور حرام کر دیا جو رزق دیا تھا انہیں اللہ نے بہتان باندھ کر اللہ تعالیٰ پر بے شک وہ گمراہ ہو گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور اپنی عقلوں کے ساتھ بحیرہ وغیرہ کو حرام قرار دینے کے سبب ان کے نقصان اور خسارہ اٹھانے کی خبر دی ہے، پس انہوں نے اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے حماقت سے قتل کیا۔ اور اپنے مالوں میں اپنے اوپر پابندیاں لگائیں اور وہ فقر و افلاس سے نہ ڈرے، تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے

تناقض اور تضاد کو ظاہر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بے شک عربوں میں سے کچھ تھے جو اپنی اولاد کو فقر و افلاس کے ڈر سے قتل کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر اسے بیان کیا ہے اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جو محض حماقت سے بغیر کسی حجت اور دلیل کے انہیں قتل کر دیتے تھے۔ اور وہ ربیعہ اور مضر کے قبائل تھے، یہ حمیت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اور ان میں سے بعض کہتے تھے: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور انہوں نے اپنی بیٹیوں کو اللہ کی بیٹیوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہمیشہ غمزدہ رہا کرتا تھا، تو (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ”تجھے کیا ہے تو مغموم رہتا ہے“؟ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنے عہد جاہلیت میں ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اللہ تعالیٰ میرے لیے اسے معاف نہیں فرمائے گا اگرچہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ”مجھے اپنے گناہ کے بارے بتاؤ“۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے، پس میرے ہاں بچی پیدا ہوئی تو میری بیوی نے مجھ سے سفارش کی کہ میں اسے چھوڑ دوں چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بڑی ہوگئی اور احکام سمجھنے کی عمر کو پہنچ گئی (یعنی بالغ ہوگئی) اور حسین و جمیل عورتوں میں سے ہوگئی اور لوگ اس کے لیے پیغام نکاح دینے لگے، تو میرے اندر حمیت داخل ہوگئی اور میرا دل برداشت نہ کر سکا کہ میں اس کی شادی کروں یا اسے گھر میں بغیر شادی کے چھوڑ دوں، تو میں نے بیوی کو کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنے رشتہ داروں کی ملاقات کے لیے فلاں فلاں قبیلہ میں جاؤں پس تو اسے میرے ساتھ بھیج دے، وہ اس پر بہت خوش ہوئی اور اس نے اسے کپڑوں اور زیور کے ساتھ خوب آراستہ کیا (یعنی اس کا بناؤ سنگھار کیا) اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس سے خیانت نہ کروں گا، چنانچہ میں اسے ایک کنوئیں کے کنارے لے گیا اور میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو بچی سمجھ گئی کہ میں اسے کنوئیں میں پھینکنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تو وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور رونے لگی: اے ابا جان! کیوں تم میرے ساتھ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تو مجھے اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں نے کنوئیں میں دیکھا اور مجھ میں حمیت بھڑک اٹھی پھر وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور کہنے لگی: اے ابا! میری ای کی امانت ضائع نہ کر۔ تو میں ایک بار کنوئیں میں دیکھتا اور ایک بار اس کی طرف اور میں اس پر رحم کرتا رہا، یہاں تک کہ شیطان مجھ پر غالب آ گیا اور میں نے اسے پکڑا اور اسے اوندھا کر کے کنوئیں میں پھینک دیا، اور وہ کنوئیں میں بھی پکارتی رہی۔ اے ابا! تو نے مجھے قتل کیا ہے، اور میں وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز ختم ہوگئی تو میں واپس آ گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی رونے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو أمرتُ أن أعاقب أحد أبما فعل فی الجاهلية لعَاقبتُكَ (اگر مجھے حکم دیا جاتا کہ میں کسی کو اس فعل پر سزا دوں جو اس نے عہد جاہلیت میں کیا تو میں تجھے ضرور سزا دیتا) (1)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 1، صفحہ 517

وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۡ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کیے باغات کچھ چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور کچھ بغیر اس کے اور کھجور اور کھیتی الگ الگ ہیں کھانے کی چیزیں ان کی اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک جیسے اور (ذائقہ میں) مختلف، کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل دار ہو اور ادا کرو اس کا حق جس دن وہ کٹے۔ اور فضول خرچی نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو''۔

اس میں تئیس مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: اَنْشَاَ یعنی اس نے پیدا کیا۔ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ ایسے باغات کو جو زمین پر بچھے اور چھپروں پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ اور ایسے جو چھپروں پر نہیں چڑھائے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو زمین پر پھیل جائیں ان میں سے جو بچھ جاتے ہیں مثلاً انگور کی بیلیں، کھیتیاں اور تربوز کی بیل وغیرہ۔ اور غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو اپنے تنے پر کھڑے ہوں مثلاً کھجور کے درخت اور دیگر تمام درخت۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معروشات وہ زمین جن کے درخت بلند ہو جائیں اور تعریش کا اصل معنی الرفع (بلند ہونا) ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ معروشات وہ ہیں جنہیں لوگ لگاتے ہیں اور انہیں اوپر چڑھاتے ہیں اور غیر معروشات وہ ہیں جو پھلوں سے جنگلوں اور پہاڑوں میں خود نکلتے ہیں(1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غین اور سین کے ساتھ قراءت اس پر دلالت کرتی ہے۔ مغروسات وغیر مغروسات۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ ان دونوں کا علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ یہ دونوں جنات، باغات میں داخل ہیں اس لیے کہ ان دونوں میں فضیلت ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ الآیہ (البقرہ: 98) کے تحت اس کا بیان گزر چکا ہے۔

مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ یعنی اس کا ذائقہ مختلف ہے ان میں سے کچھ جید (عمدہ) ہیں اور کچھ ردی اور گھٹیا۔ اور اس کا نام اکل رکھا کیونکہ وہ کھائے جاتے ہیں۔ اور اُكُلُهٗ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور مُخْتَلِفًا اس کی نعت اور صفت ہے۔ لیکن جب یہ اس پر مقدم ہوا اور منصوب کے قریب ہوا تو اسے نصب دی گئی، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: عندی طباخا غلام اور شاعر نے کہا ہے:

الشَّرُّ منتشر یلقاك عن عرض والصالحات علیها مغلقا باب

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُخْتَلِفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یہ مسئلہ علم نحو کے مشکل مسائل میں سے ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: قد انشأها ولم یختلف اکلها وهو ثمرها (تحقیق اس نے اسے پیدا کیا اور اس کے پھل مختلف نہیں) تو جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے پیدا کیا اپنے اس قول کے ساتھ: خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178

(الانعام:102) تو جان لیجئے کہ اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس کے پھل مختلف ہیں، یعنی انه أنشأها مقدرًا فيه الإختلافُ (اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس میں اختلاف مقدر ہے) اسے سیبویہ نے اپنے اس قول کے ساتھ بیان کیا ہے: مررتُ برجل معه صقرٌ صائدا به غدا یہ حال کی بنا پر ہے۔ (یعنی میں ایک آدمی کے پاس سے گزرا اس کے ساتھ باز تھا درآنحالیکہ وہ اس سے کل شکار کرے گا) اسی طرح آپ کہتے ہیں: لتدخلنَّ الدار آكلينَ شاربينَ، ای مقدرينَ ذالك (تم گھر میں داخل ہوتے ہو کھاتے پیتے ہوئے (یعنی حال یہ ہے کہ تم کھا، پی رہے ہو) تیسرا جواب یہ ہے: یعنی لما أنشاءه كان مختلفا أكلهُ (جب الله تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تو اس کے پھل مختلف تھے۔ یہ اس معنی کی بنا پر ہے لو كان له أكلٌ لكانَ مختلفا أكلهُ (یعنی اگر اس کے پھل ہوتے تو اس کا ذائقہ مختلف ہوتا)

اور اکلھما نہیں کہا، کیونکہ اس نے اعادہ کے ذکر کے وقت ان دو میں سے ایک پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا (الجمعہ: 11)، ای الیھما اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ (ان کا ایک دوسرے پر) عطف کیا گیا ہے۔

مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ اور اس میں تین دلیلیں ہیں (۱) جس پر سب سے پہلے دلیل قائم ہوتی ہے وہ یہ کہ متغیرات یعنی تبدیلیوں کے لیے مغیر یعنی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضروری ہے (۲) دوسری دلیل اس پر کہ یہ الله سبحانہ وتعالیٰ کا ہم پر احسان ہے، پس اگر وہ چاہتا تو جب اس نے ہمیں پیدا کیا تو وہ ہمارے لیے غذا پیدا نہ کرتا اور جب اس نے اسے پیدا کر دیا تو وہ دیکھنے میں حسین اور ذائقے میں عمدہ اور طیب نہ ہوتی، اور جب اس نے اسے اس طرح پیدا فرما دیا تو اسے چننا آسان نہ ہوتا۔ پس اس پر ابتداء ایسا کرنا لازم نہیں تھا، کیونکہ اس پر کوئی شی واجب نہیں۔ (۳) اور تیسری دلیل قدرت پر ہے کہ وہ پانی جس کی شان یہ ہے کہ وہ زمین میں نیچے اتر جاتا ہے وہ الله تعالیٰ وحدہ لاشریک علام الغیوب کی قدرت سے درخت کی جڑوں سے اس کی شاخوں کی جانب اوپر چڑھ آتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے آخر تک پہنچتا ہے تو اس میں پتے اگتے ہیں جو اس کی جنس سے نہیں۔ اور پھل اپنے خاص وصف کے ساتھ وافر مقدار میں نکلتا ہے اور اس کا رنگ صاف اور حسین ہوتا ہے، اسے چننا آسان ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ لذیذ ہوتا ہے، تو طبائع اور ان کی اجناس کہاں گئیں؟ فلاسفہ اور ان کے لوگ کہاں گئے؟ کیا یہ طبیعت کی قدرت میں ہے کہ وہ اس طرح کی پختگی لا سکے، یا یہ عجیب وغریب ترتیب مرتب کر سکے؟ ہرگز نہیں۔ عقلی اعتبار سے اسے کوئی مکمل نہیں کر سکتا مگر وہی جو حی (زندہ) ہو، عالم (جاننے والا) ہو، قدیر (قدرت والا) ہو اور مرید (ارادہ کرنے والا) ہو، پس پاک ہے وہ ذات جس کے لیے ہر شی میں کوئی نشانی اور دلیل ہے۔

اور اس آیت کو ماقبل کے ساتھ متصل لانے کی وجہ یہ ہے کہ جب کفار نے الله تعالیٰ پر جھوٹے بہتان باندھے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور کئی چیزوں کو حلال وحرام قرار دیا تو الله تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر انہیں دلیل دی کہ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے، اور یہ کہ اس نے ان چیزوں کو ان کے لیے رزق بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ یہ دو بنائیں اور اصلیں ہیں اور دونوں اِفعل (امر) کے صیغہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک مباح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ (الجمعہ:10) اور دوسری واجب ہے۔ اور شریعت میں مباح اور واجب کا ملنا ممتنع نہیں ہے۔ اور حق ادا کرنے کے امر سے پہلے کھانے کی نعمت کے ذکر سے آغاز کیا تاکہ وہ واضح کردے کہ نعمت کے ساتھ ابتدا، حکم کی پابندی سے پہلے یہ اس کا فضل (اور احسان) ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ حق کی تفسیر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ تو حضرت انس بن مالک، حضرت ابن عباس، حضرت طاؤس، حضرت حسن، حضرت ابن زید، حضرت ابن الحنفیہ، حضرت ضحاک اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے کہ حق سے مراد وہ زکوٰۃ ہے(1) جو فرض کی گئی ہے، عشر اور نصف عشر ہے۔ اور اسے ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔

اور حضرت علی بن حسین، حضرت عطا، حضرت حکم، حضرت حماد، حضرت سعید بن جبیر(2) اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد وہ حق ہے جو زکوٰۃ کے سوا مال میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے ندباً حکم فرمایا ہے۔ اور حضرت ابن عمر اور محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا گیا ہے، اور اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب تو فصل کی کٹائی کرے اور تیرے پاس مساکین حاضر ہوں تو ان کے لیے کچھ بالیں (سٹے) چھوڑ دے، اور جب تو (انگور یا کھجوریں وغیرہ) توڑے تو ان کے لیے کچھ خوشے پھینک دے، اور جب تو اپنی کھیتی کو صاف کرے اور اس سے دانے نکال لے تو اس سے ان کے لیے کچھ حصہ چھوڑ دے، اور جب تو اس کا کیل (مقدار) معلوم کر لے تو اس کی زکوٰۃ (عشر) ادا کر۔ اور تیسرا قول زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے، کیونکہ یہ سورت مکیہ ہے اور آیت زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ:103) (اے حبیب! وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ) اور وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ:43) (اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ)

یہ حضرت ابن عباس، ابن الحنفیہ، حسن، عطیہ العوفی، نخعی اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے سدی سے اس آیت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: عشر اور نصف عشر کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے، تو میں نے کہا: یہ کس سے منقول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: علماء سے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے سبب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی عمومیت کے سبب کہ ”وہ زمین جسے بارش سیراب کرے(3) اس کی پیداوار میں عشر ہے اور جسے بڑے یا چھوٹے ڈولوں کے ساتھ سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے“۔ ہر اس پیداوار میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے جسے زمین اگاتی ہے چاہے وہ اناج ہو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 757 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178 3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

یا کوئی اور۔ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے بیان کیا ہے: سوائے ایندھن کی لکڑی، گھاس، وہ درخت جس کی شاخوں سے کمانیں بنائی جاتی ہیں۔

القصب، انجیر (☆)، غاف کے درخت کا چھلکا (غاف ایک انتہائی میٹھے پھل والا درخت ہے) قصب الذریرہ (خاص قسم کی خوشبو کے پودے) اور قصب السکر (گنا) کے۔ اور جمہور نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور وہ تاویل یہ کرتے ہیں کہ حدیث طیبہ کا مقصود اس زمین کو بیان کرنا ہے جس سے عشر لیا جائے گا اور جس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس بارے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے جسے تو جانتا ہے کہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے سوا میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسے حضرت حسن، ابن سیرین اور شعبی رحمہم اللہ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور کوفیوں میں سے ابن ابی لیلیٰ، ثوری، حسن ابن صالح، ابن مبارک اور یحییٰ بن آدم رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔

اور اسی طرف ابو عبید بھی گئے ہیں۔ اور اسے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور یہی حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے، کیونکہ وہ زکوٰۃ نہیں لیتے تھے مگر گندم، جو، کھجور اور کشمش سے۔ اور اسے وکیع نے طلحہ بن یحییٰ عن ابی بردہ عن ابیہ کی سند سے بیان کیا ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر وہ خوراک جو ذخیرہ کی جاسکتی ہو اس میں زکوٰۃ (عشر) واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: زکوٰۃ ان چیزوں میں واجب ہوتی ہے جو خشک ہو جائے اور اسے ذخیرہ کیا جاسکتا ہو اور اسے بطور خوراک کھایا جاسکتا ہو۔ اور زیتون میں کوئی شی نہیں ہے کیونکہ وہ ادام (سالن) ہے۔ اور اسی کی مثل ابو ثور نے بھی کہا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کئی اقوال کہے ہیں ان میں سے اظہر قول یہ ہے کہ زکوٰۃ ان تمام چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے جب کہ ان کے وسق بنائے جا سکتے ہوں۔ اور انہوں نے اسے بادام میں واجب کیا ہے کیونکہ یہ کیلی چیز ہے لیکن اخروٹ میں نہیں کیونکہ ان کا شمار عددی چیزوں میں ہے (یعنی یہ گن کر بیچے جاتے ہیں نہ کہ وزن و کیل کے ساتھ) اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لیس فیما دون خمسۃ أوسق من تمرٍ أوحبٍّ صدقۃ (1) (پانچ سے کم وسق کھجوروں یا دانوں میں کوئی صدقہ (زکوٰۃ و عشر) نہیں ہے) انہوں نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرما دی ہے کہ واجب کا محل وسق ہے، اور آپ نے اس مقدار کو بیان کر دیا ہے جس سے حق (زکوٰۃ) نکالنا واجب ہوتا ہے۔ اور امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ زکوٰۃ ہر اس پیداوار میں واجب ہے جسے زمین اگائے، یہاں تک کہ سبزی کی دس گانٹھوں میں سے ایک گانٹھ (بطور زکوٰۃ) واجب ہوگی اور ان سے اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے، اور یہی حضرت عمر بن العزیز کا قول ہے کیونکہ انہوں نے لکھا کہ عشر ہر اس پیداوار سے لیا جائے جسے زمین اگاتی ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔

اسے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے سماک بن فضل سے ذکر کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر نے لکھا . پھر آگے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 314

☆ بعض نسخوں میں تمن ہے۔

اسے ذکر کیا۔ اور یہی قول حماد بن ابی سلیمان اور آپ کے شاگرد رشید حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور ابن عربی کا میلان بھی احکام میں اسی طرف ہے (1) پس فرمایا ہے: اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا آئینہ بنایا اور حق کو دیکھ لیا، اور اسے پکڑا جو مذہب حنفی کو قوت اور طاقت دیتا ہے۔ اور انہوں نے کتاب القبس بما علیہ الإمام مالك بن انس میں کہا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اور لوگوں نے ان تمام میں یا بعض میں زکوٰۃ واجب ہونے میں اختلاف کیا ہے جنہیں آیت متضمن ہے، تحقیق ہم نے اس کا خلاصہ ''الاحکام'' میں بیان کردیا ہے کہ زکوٰۃ ان چیزوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جنہیں غذا بنایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کردیا ہے نہ کہ سبزیوں وغیرہ کے ساتھ۔ اور انار، فرسك (اخروٹ یا اس قسم کی کوئی اور شئی) اور اترج (لیموں کا درخت) طائف میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس پر کوئی اعتراض کیا اور نہ اس کا ذکر کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اگرچہ احکام میں اس کا ذکر نہیں اور یہی صحیح مسئلہ ہے کہ سبزیوں میں کوئی شئی نہیں ہے۔ اور رہی آیت تو اس میں اختلاف ہے، کیا یہ محکم ہے یا منسوخ ہے یا ندب پر محمول ہے؟ اور ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے جو اس کے محتملات میں سے ایک کو بیان کرے، بلکہ جو قاطع معلوم ہے وہ وہ ہے جسے ابن بکیر نے اپنی ''احکام'' میں ذکر کیا ہے کہ کوفہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مدینہ طیبہ میں احکام مضبوط اور پختہ ہونے کے بعد فتح ہوا، تو کیا یہ جائز ہے کہ کوئی وہم میں پڑنے والا وہم میں پڑ جائے یا جسے ادنیٰ سی بصیرت ہو کہ شریعت اس کی مثل ہو تو وہ معطل کردی گئی ہے اور اس کے مطابق دار الہجرۃ اور محبط وحی میں عمل نہیں کیا گیا اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں، یہاں تک کہ اس کے مطابق کوفہ کے باسیوں نے عمل کیا؟ بلاشبہ یہ اس کے بارے میں درست ہے جس نے یہ گمان کیا اور اس طرح کہا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم کے معنی میں سے اس پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) (اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام) کیا آپ یہ گمان کرسکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز چھپا کر رکھی ہوگی جس کی تبلیغ اور بیان کا آپ کو حکم دیا گیا؟ حاشا وکلا (ایسا ہرگز ممکن نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے مکمل کردیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کردی ہے تم پر اپنی نعمت)

اور دین کے کامل ہونے میں سے یہ ہے کہ آپ نے سبزیوں میں سے کوئی شئی نہیں لی۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ (2) رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں کہا ہے جسے دار قطنی نے بیان کیا ہے: بے شک ہمارے پاس کھیرے، ککڑیاں، پیدا ہونے کی جگہوں میں سے وہ دس ہزار تک نکالے جاتے تھے اور ان میں کوئی شے (زکوٰۃ) نہ ہوتی تھی۔ اور زہری اور حسن نے کہا ہے: سبزی جب بیچ دی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کی زکوٰۃ دی جائے گی جب اس کے ثمن (قیمت) دو سو درہم تک پہنچ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 759
2۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100

جائیں۔ اور پھلوں کے ثمن کے بارے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ ان دونوں کے قول میں اس کے لیے کوئی حجت نہیں ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور ترمذی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لکھا اور سبزیوں کے بارے (زکوٰۃ) کا حکم دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس فیھاشی (1) ان میں کوئی شی نہیں ہے اور اسی معنی کی روایت حضرت جابر، حضرت انس، حضرت علی، حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ان کی احادیث دارقطنی نے ذکر کی ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اصحاب نے صالح بن موسیٰ عن منصور عن ابراہیم عن الاسود عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سبزیوں میں سے جو زمین اگائے اس میں زکوٰۃ ہے''۔ فیما أنبتتِ الأرضُ من الخضرِ زکاۃ (2) ابوعمر نے کہا ہے: اس حدیث کو منصور کے ثقہ اصحاب میں سے کسی نے اس طرح روایت نہیں کیا، بلکہ یہ ابراہیم کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب سنت کی جہت سے اسانید ضعیف ہونے کے سبب استدلال ساقط ہو گیا تو پھر کچھ باقی نہ رہا مگر وہی جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آیت کے عموم میں تخصیص مراد ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فیما سقت السماءُ العشرُ (3) کے عموم کے بارے میں جو ہم نے ذکر کیا ہے (وہ ثابت ہو گیا)

امام ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: سبزیوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے سوائے ان کے جن کا پھل باقی رہنے والا ہے اور سوائے زعفران وغیرہ کے کہ اس کا شمار وزنی چیزوں میں ہوتا ہے اور اس میں زکوٰۃ ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ عصفر (زرد رنگ) اور کتان (السی) میں بیج کا اعتبار کرتے ہیں، پس جب ان دونوں کا بیج قرطم (کڑ کے بیج) اور کتان (السی) میں سے پانچ وسق تک پہنچ جائے تو عصفر اور کتان بیج کے تابع ہوں گے، اور اس سے عشر یا نصف عشر لیا جائے گا۔ اور رہی روئی تو اس میں ان کے نزدیک پانچ سے کم گانٹھوں میں کوئی شی نہیں ہے اور ایک گانٹھ تین سو سیر عراقی کی ہوگی۔ اور ورس (ایک قسم کی گھاس جو رنگائی کے کام آتی ہے) اور زعفران جب پانچ سیر سے کم ہوں تو ان میں کوئی شی (زکوٰۃ) نہ ہوگی۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک پانچ سیر تک پہنچ جائے تو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) ہوگا، چاہے وہ عشر ہو یا نصف عشر۔

اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اسی طرح (حکم) اس گنے کا ہے جس سے شکر (اور چینی) بنتی ہے، اور وہ عشری زمین میں ہو نہ کہ خراجی زمین میں، تو اس میں وہی حکم ہے جو زعفران میں ہے۔

عبدالملک بن ماجشون نے پھلوں کی جڑوں میں زکوٰۃ واجب کی ہے نہ کہ سبزیوں میں۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو موقف امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے، ان کے نزدیک کوئی زکوٰۃ نہیں نہ بادام میں، نہ اخروٹ میں اور نہ ہی

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 81　　2۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 195
3۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

بندق میں اور جو بھی ان کی مثل ہے، اگرچہ انہیں ذخیرہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ان کے نزدیک ناشپاتی، سیب اور امرود میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ ہی ان چیزوں میں جو ان کی مثل ہیں نہ خشک ہوتی ہے اور نہ ذخیرہ کی جاسکتی ہے، البتہ انجیر میں اختلاف ہے۔ اور اہل مغرب میں سے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے ہیں ان کے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ انجیر میں زکوٰۃ نہیں ہے، مگر عبدالملک بن حبیب یہ رائے رکھتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس میں زکوٰۃ ہے۔ وہ اسے کھجور اور کشمش پر قیاس کرتے ہیں اور بغداد کے مالکی مذہب رکھنے والے اہل علم کی ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے، ان میں اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے: وہ سنت جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں، اور وہ جو میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ ہر قسم کے پھلوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، انار، خرسک اور انجیر اور جو ان کے مشابہ ہیں۔ اور جو ان کے مشابہ نہیں بشرطیکہ وہ فواکہ (پھلوں) میں سے ہوں۔

ابو عمر نے کہا ہے: پس آپ نے انجیر کو اس باب میں داخل کیا ہے اور میرا گمان ہے (واللہ اعلم) آپ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ اسے خشک کیا جاتا ہے اور ذخیرہ کیا جاتا ہے اور اسے خوراک بنایا جاتا ہے، اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ اسے اس باب میں داخل نہ کرتے، کیونکہ یہ انار سے بڑھ کر کھجور اور کشمش کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور مجھے علامہ ابہری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت سے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ اس میں زکوٰۃ کے وجوب کا فتویٰ دیتے ہیں، اور وہ اپنے نزدیک اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے اصول پر دیکھتے ہیں۔

اور انجیر کیلی شی ہے اس میں پانچ وسقوں کی رعایت کی جائے گی اور وہ شے جو وزن کے اعتبار سے ان کی مثل ہو اور ان کے نزدیک انجیر میں کھجور اور کشمش کا حکم لگایا جائے گا جن پر تمام کا اجماع ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: کھجور اور انگور کے سوا پھلوں میں سے کسی شی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے زکوٰۃ وصول کی ہے اور یہ دونوں اہل حجاز کی خوراک تھی جسے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے فرمایا: کبھی اخروٹ اور بادام کو بھی ذخیرہ کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں میں زکوٰۃ نہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں حجاز میں خوراک نہیں بنیں، جتنا مجھے علم ہے، بلاشبہ یہ دونوں پھل ہیں۔ اور زیتون میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ پس اسے رمان (انار) کے ساتھ ملایا ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ انجیر غذا اور خوراک میں اس سے زیادہ نفع بخش ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ ہے انہوں نے یہ عراق میں کہا اور پہلا قول مصر میں کہا: پس زیتون کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مضطرب ہو گیا، اور اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف نہیں، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ ان دونوں کے نزدیک آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور دونوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ انار میں زکوٰۃ نہیں ہے اور اس میں زکوٰۃ کو واجب کرنا دونوں کو الزام دینا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اگر انار اس اتفاق سے نکل چکا ہے تو اس سے یہ معنی ظاہر ہوا کہ آیت اپنے عموم پر نہیں ہے اور ضمیر عائد مذکور چیزوں میں سے بعض کی

طرف راجع ہے اور بعض کی طرف نہیں۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے سبزیوں میں عشر واجب کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ اور اس سے پہلے زیتون اور انار کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کا ذکر جملہ کے بعد ہو وہ بلا اختلاف اخیر کی طرف پھر جاتا ہے۔ الکیا طبری نے یہ کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے کبھی بھی انار کو پیوند نہیں لگایا مگر باغ کے پانی میں سے ایک قطرہ کے ساتھ۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب تم انار کو کھاؤ تو تم اسے دانوں کے باریک چھلکے سمیت کھاؤ، کیونکہ وہ معدے کو صاف کرتا ہے۔ اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم انار کو اس کے سرے سے نہ توڑو کیونکہ اس میں ایک کیڑا ہوتا ہے جس سے جذام کی بیماری لگ جاتی ہے۔ زیتون کے تیل کے فوائد عنقریب سورۃ المومنون میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ واجب ہے ان میں سے زہری، اوزاعی، لیث، ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ زہری، اوزاعی اور لیث نے کہا ہے: زیتون کا تخمینہ لگایا جائے گا اور اس سے صاف تیل لے لیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اندازہ نہیں لگایا جائے گا، البتہ اس کا تیل نکالے جانے کے بعد اس سے عشر لیا جائے گا، جب کہ اس کا ماپ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما علیہ نے کہا ہے: اس کے دانوں سے عشر لیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: یَوْمَ حَصَادِهٖ ابوعمرو، ابن عمر اور عاصم نے حصادہ حا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے، اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ، اور یہ دونوں لغتیں مشہور ہیں۔ اور اسی کی مثل الصَرام اور الصِرام، الجَذاذ اور الجِذاذ، القَطاب اور القِطاب ہیں۔ زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت کے بارے میں علماء کے تین مختلف قول ہیں:

(۱) زکوٰۃ واجب ہونے کا وقت فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ محمد بن مسلمہ نے یہی کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ حَصَادِهٖ۔(1)

(۲) اس کا وقت پکنے کے ایام ہیں، کیونکہ (کھیتی) پکنے سے پہلے پہلے نہ چارہ ہوتی ہے، نہ غذا اور نہ ہی طعام اور جب وہ پک جائے اور وہ اس کھانے کے وقت کو پہنچ جائے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے تو پھر وہ حق واجب ہو جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کیونکہ نعمت مکمل ہو جانے کے ساتھ اس نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اس کی ادائیگی کٹائی کے وقت ہوگی جب کہ وہ واجب پکنے کے وقت ہو جاتا ہے(2)۔

(۳) حق کا وجوب اندازہ مکمل کرنے کے بعد ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت اس میں واجب زکوٰۃ ثابت ہو جاتی ہے اور یہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شرط ہے۔ اس کی اصل زکوٰۃ وصول کرنے والے کا ریوڑ میں آنا ہے(3)، یعنی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 762 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 763

کہا ہے۔ نص قرآنی کے مطابق پہلا قول صحیح ہے۔ اور مذہب ثانی مشہور ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی فصل پکنے کے بعد فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کی ملکیت سے ادا کی جائے گی یا وہ اندازہ لگانے سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کے وارثوں پر ہوگی۔ اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: پھل کے مالکوں کو وسعت دینے کے لیے اندازہ لگانے کو مقدم کیا گیا ہے اور اگر کسی آدمی نے اندازہ لگانے کے بعد اپنی زکوٰۃ کو مقدم کیا اور کاٹنے سے پہلے پہلے ادا کر دی تو وہ اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی، کیونکہ اس نے اسے واجب ہونے سے پہلے نکال دیا ہے۔ اور اندازہ لگانے کے بارے علماء کے مختلف قول ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ثوری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دی ہے، اور انہوں نے فرمایا: اندازہ لگانا مستعمل نہیں۔ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ باغ کے مالک پر لازم ہے کہ وہ اس کا عشر مساکین کو ادا کرے جو اس کے قبضے میں ہو جب وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: موجودہ دور میں اندازہ لگانا بدعت ہے۔ اور جمہور اس کے خلاف ہیں، پھر ان کا اختلاف ہوا ہے اور اس کے جواز پر سب سے بڑی دلیل کھجور اور انگور کے بارے میں ہے کہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ (1) کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھیجا اور حکم فرمایا کہ وہ اسی طرح انگوروں کا اندازہ لگالیں جس طرح کھجوروں کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش لے لی جائے جس طرح کھجوروں کی زکوٰۃ میں تمر (پکی کھجوریں) لے لی جاتی ہیں۔ اسے ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔ اور داؤد بن علی نے کہا ہے: زکوٰۃ کے لیے کھجوروں میں اندازہ لگانا جائز ہے اور انگور میں جائز نہیں ہے اور حضرت عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے اور صحیح سند سے متصل نہیں ہے ابو محمد عبدالحق نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اندازہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو کھجور کے درخت پر تر کھجوریں ہیں اور ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو ان میں ناقص ہوں اگر وہ پک کر تیار ہوتیں پھر نقصان کے بعد جو باقی ہیں انہیں شمار کیا جائے اور ان بعض کو بعض کے ساتھ ملایا جائے گا یہاں تک کہ باغ مکمل ہو جائے، اور اسی طرح انگور کا بھی اندازہ لگایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اندازہ لگانے کے لیے ایک آدمی ہی کافی ہوتا ہے جیسا کہ حاکم۔ اور جب پکی ہوئی کھجوریں اس کے اندازہ سے بڑھ جائیں تو پھر باغ کے مالک پر ان میں سے (مزید زکوٰۃ) نکالنا لازم نہیں، کیونکہ اب فیصلہ نافذ ہو چکا ہے، عبدالوہاب نے یہی کہا ہے اور اسی طرح جب مقدار کم ہو جائے تو پھر زکوٰۃ کم نہیں ہوگی۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں پر اندازہ لگایا جاتا تھا اور پھر اسی اندازہ کے مطابق ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اگر باغ کا مالک اندازے میں کثرت اور زیادتی کا مطالبہ کرے تو اندازہ لگانے والا اسے اس بارے میں اختیار دے دے کہ وہ اسے اس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے جتنا اس نے اندازہ لگایا ہے اور وہ اس کے اندازہ کے مطابق لے لے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ ہمیں ابن جریج نے حضرت ابوالزبیر رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار وسق کا اندازہ لگایا اور یہ گمان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کو جب آپ نے اختیار دے دیا تو انہوں نے کھجوریں لے لیں اور انہیں بیس ہزار وسق دے دیئے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو میں نے حضرت عطا کو کہا: تو (کیا) اندازہ لگانے والے پر لازم ہے کہ جب مال کا مالک اندازے میں زیادتی اور کثرت کا مطالبہ کرے تو وہ اسے اختیار دے دے جیسا کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کو اختیار دیا؟ تو انہوں نے فرمایا: مجھے میری عمر کی قسم! کون سی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بہتر اور افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اور اندازہ نہیں ہوتا مگر پکنے کے بعد، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی طرف بھیجتے تھے (1) اور وہ ان پر کھجوروں کا تخمینہ لگاتے تھے جس وقت پہلی کھجوریں پک جاتیں اس سے پہلے کہ ان میں سے کچھ کھائی جائیں۔ پھر آپ یہودیوں کو اختیار دیتے تھے کہ چاہے تو وہ انہیں اس اندازے کے مطابق لے لیں یا وہ انہیں آپ کو دے دیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگانے کا حکم دیا تا کہ زکوٰۃ شمار کرلی جائے اس سے پہلے کہ پھل کھایا جائے اور اسے تقسیم کیا جائے۔ اسے دارقطنی نے ابن جریج عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ فرمایا: اور صالح بن ابی الاخضر نے اسے زہری عن ابن مسیب کی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور مالک، معمر اور عقیل نے اسے زہری عن سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب تخمینہ لگانے والا تخمینہ لگائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے اندازہ میں سے کچھ مقدار ساقط کردی جائے، کیونکہ ابوداؤد، ترمذی اور بستی نے اپنی صحیح میں حضرت سہل بن ابی حثمہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو لے لو اور تیسرا حصہ چھوڑ دو اور اگر تم تیسرا حصہ نہ چھوڑو تو چوتھا حصہ چھوڑ دو'' (2)۔ یہ ترمذی کے الفاظ ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے: اندازہ لگانے والا تیسرا حصہ خرفہ (چنا ہوا میوہ) کے لیے چھوڑ دے گا۔ اور اسی طرح یحییٰ القطان نے کہا ہے۔ اور ابو حاتم البستی نے کہا ہے: اس خبر کی دو صفتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عشر میں سے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دے اور دوسری یہ ہے کہ وہ عشر لگانے سے پہلے کل کھجوروں میں سے اتنی مقدار چھوڑ دے، جب کہ وہ بہت بڑا باغ ہو اس کا احتمال رکھتا ہو۔

الخرفة خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی کھجوروں میں سے وہ جو چنی جاتی ہیں جس وقت وہ اپنے پھل کو پاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: التمر خرفة الصائم (کھجور روزے دار کا چنا ہوا پھل ہے) یہ جوہری اور ہروی سے منقول ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اندازہ لگانے والا اپنا اندازہ لگانے کے وقت کھجوروں اور انگوروں میں سے کوئی شی نہیں چھوڑے گا مگر وہی جو اس نے اندازہ لگایا۔ اور مدینہ طیبہ کے بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ اندازے میں تخفیف کرے گا اور وہ محتاجوں کے لیے صلہ رحمی وغیرہ کے لیے کچھ چھوڑ دے گا (یعنی غرباء و مساکین کو دینے کے لیے اور رشتہ داروں اور دوست احباب کو

1۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 134
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

دینے کے لیے)

**مسئلہ نمبر 14**۔ اگر اندازہ لگائے جانے کے بعد اور انہیں توڑنے سے پہلے پھل پر کوئی آفت آجائے (اور وہ خراب ہوجائے) تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی اس پر اہل علم کا اجماع ہے، مگر اس صورت میں کہ اس میں سے پانچ وسق یا اس سے زیادہ مقدار باقی رہ جائے (تو اس کے مطابق اس پر زکوٰۃ ہوگی)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اور پانچ وسقوں سے کم مقدار میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح حضور نبی مکرم ﷺ سے واضح طور پر مروی ہے۔ اور یہ کتاب اللہ میں مجمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ: 267) (اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لیے زمین سے)

اور مزید ارشاد فرمایا: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ پھر عشر اور نصف عشر کے ساتھ اس اجمال کا بیان واقع ہوا، پھر جب وہ مقدار کہ جب مال اس تک پہنچ جائے تو اس سے حق (زکوٰۃ) لیا جائے گا، وہ مجمل تھی تو اس کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور فرمایا: لیس فیما دون خمسة أوسق من تمر او حب صدقة (1) (کہ کھجور یا دانوں (اناج) کی وہ مقدار جو پانچ اوسق سے کم ہو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے)۔ اور یہ ارشاد سبزیوں میں زکوٰۃ کی نفی کرتا ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جن کے وسق بنائے جاتے ہیں۔ پس جسے اپنے حصہ میں کھجوروں یا اناج میں سے پانچ وسق حاصل ہوجائیں اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی طرح حکم کشمش کا ہے۔ اور یہی علماء کے نزدیک نصاب کے نام کے ساتھ موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے: وَسق و وِسق (یعنی واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی) اس کی مقدار ساٹھ صاع ہے، اور ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اور ایک مد میں ایک رطل بغدادی اور اس کا تہائی حصہ۔ اور مجموعی طور پر پانچ اوسق کی مقدار مد کے اعتبار سے ایک ہزار دوسو مد ہے اور یہ وزن کے اعتبار سے ایک ہزار چھ سو رطل ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اور جسے کھجور اور کشمش کے مجموعی طور پر پانچ وسق حاصل ہوں اس پر بالاجماع زکوٰۃ لازم نہیں، کیونکہ یہ دو مختلف جنسیں ہیں اور اسی طرح علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کو گندم کے ساتھ اور گندم کو کشمش کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا اور نہ ہی اونٹ کو گائے کے ساتھ اور نہ گائے کو بکری کے ساتھ ملایا جائے گا، البتہ بکریوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا اس پر اجماع ہے اور گندم کو جو اور بغیر چھلکے والے جو کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 17**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ان تین میں اس کی اجازت دی ہے، کیونکہ یہ ایک قسم (جنس) کے معنی میں ہیں اس لیے کہ ان کی منفعت اور فوائد ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں اور یہ اگنے اور کٹائی میں بھی آپس میں جمع ہیں۔ اور ان میں افتراق نام کے اعتبار سے ہے اور یہ حکم میں ان کے الگ الگ ہونے کو ثابت نہیں کرتا جیسا بھینسیں اور گائیں، بھیڑیں اور بکریاں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: انہیں جمع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ مختلف اقسام ہیں، ان کی صفات جدا جدا ہیں،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 316

ان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ اور یہی ان کے افتراق کو ثابت کرتا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دالیں تمام کی تمام ایک نوع ہیں، ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایسے دانے جن کے نام کی دوسرے سے الگ پہچان ہو اسے نہیں ملایا جائے گا، کیونکہ وہ خلقت (بناوٹ) اور ذائقے وغیرہ میں دوسرے سے جدا اور مختلف ہوتا ہے اور ہر قسم کو آپس میں ملا دیا جائے گا، یعنی اس کی ردی قسم کو جید کے ساتھ، جیسا کہ کھجور اور اس کی انواع، کشمش سیاہ رنگ کی اور سرخ رنگ کی، گندم اور اس کی اقسام گندمی وغیرہ۔

اور یہی ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ، آپ کے صاحبین امام یوسف اور امام محمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ کا قول ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: تمام دانوں کو آپس میں ملا دیا جائے گا یعنی دالیں وغیرہ انہیں زکوٰۃ میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے گا۔ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملانے سے اور دانوں میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملانے سے ہچکچاتے تھے، پھر اپنے حکم کے آخر میں کہا کرتے تھے، وہ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کہہ رہے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: (کھیتی کی) وہ مقدار جسے اس کے مالک نے اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے کے بعد یا اس کے بعد کہ اسے ہاتھ میں مل کر دانے نکال کر کھایا جا سکے، ضائع کر دیا تو اس کا حساب اس پر ڈالا جائے گا اور اس کی وہ مقدار جو اس کے مالک نے اسے کاٹنے اور اسے توڑنے کے دوران کسی کو دی اور زیتون میں سے اسے چننے کی حالت میں کسی کو دی، اسے تلاش کر کے اس پر حساب ڈالا جائے گا۔ اور اکثر فقہاء اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ زکوٰۃ واجب نہیں کرتے مگر صرف اسی مقدار پر جو گاہنے کے بعد اس کے قبضے میں موجود ہو۔

حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے دانوں کی زکوٰۃ کے بارے کہا ہے: نفقہ (خرچہ) سے پہلے اس (زکوٰۃ) سے آغاز کیا جائے گا اور چھلکوں سے نکلے ہوئے دانے اس نے اور اس کے گھر والوں نے کھا لیے تو (ان کا) اس پر حساب نہیں لگایا جائے گا، یہ ان تازہ پکی کھجوروں کے قائم مقام ہیں جو باغ کے مالک کے اہل کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں وہ اسے کھاتے ہیں اور ان پر ان کا تخمینہ نہیں لگایا جاتا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تخمینہ لگانے والا باغ کے مالک کے لیے اتنی کھجوروں کی مقدار چھوڑ دے گا جسے وہ خود اور اس کے گھر والے کھائیں گے اور وہ اس کا تخمینہ ان پر نہیں لگائے گا۔ اور تازہ پکی کھجوروں کی جو مقدار اس نے خود کھا لی اس کا حساب اس پر نہیں ڈالا جائے گا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی موافقت کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ** اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ اس آیت کے مطابق کٹائی سے پہلے کھائی جانے والی مقدار کا حساب نہیں لگایا جائے گا۔ اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو تہائی چھوڑ دو اور اگر تم تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی چھوڑ دو'' (1)۔ اور جتنی مقدار چوپاؤں اور بیلوں نے گاہنے

1۔ سنن ابی داود، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 226

کے وقت کھالی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک اس میں سے کسی شی کا حساب اس کے مالک پر نہیں ڈالا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ لوبیا، چنے اور مٹر میں سے سبز حالت میں جو بیچ دیئے گئے، خشک حالت میں اس کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے اور دانوں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اسی طرح پھل میں سے جو سبز حالت میں بیچ دیا گیا تو اس کی چھان بین کی جائے اور اس کی (تلاش کا) قصد کیا جائے اور خشک حالت میں اس کا اندازہ لگایا جائے اور پھر اس اندازے کے مطابق کشمش اور پکی کھجوروں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے ثمن (قیمت) سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اور کھجور کے پھل میں سے جو پکی کھجور نہ بنے اور انگور میں سے جو کشمش نہ بنے جیسا کہ مصر کا انگور اور وہاں کے ڈوکے (کچی کھجور) اور اسی طرح وہاں کا زیتون جس سے تیل نہیں نکالا جاتا، تو اس کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے ثمن سے نکالی جائے گی اور اس کے سوا اس کے مالک کو کسی شی کا مکلف اور پابند نہیں بنایا جائے گا، اور نہ ہی اس میں اس کے ثمن کے بیس مثقال یا دو سو درہم تک پہنچنے کی رعایت کی جائے گی، بلکہ اس میں صرف اتنا دیکھا جائے گا کہ اس کی مقدار پانچ اوسق اور اس سے زیادہ تک پہنچ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان سے پکی کھجوروں کی صورت میں اس کا عشر یا نصف عشر نکالا جائے گا، جب اس کے گھر والوں نے انہیں تازہ حالت میں کھایا یا وہ کسی کو کھلائیں۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ زمین جسے بارش، دریاؤں اور چشموں کے پانی سے سیراب کیا جائے یا وہ بارانی زمین ہو تو اس کی پیداوار میں عشر ہوگا اور جسے اونٹنیوں یا اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا جائے تو اس میں نصف عشر ہوگا اور اسی طرح اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو تو اس میں عشر ہوگا'' (1)۔ اور سیح سے مراد وہ پانی ہے جو سطح زمین پر جاری ہو۔ ابن السکیت نے یہی کہا ہے۔ اور سیح کا لفظ حدیث میں مذکور ہے، اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو لیکن زمین کا مالک پانی کا مالک نہ ہو بلکہ وہ اس کے لیے اس کا کرایہ دیتا ہو تو وہ آسمان کے پانی (بارش) کی طرح ہے۔

مشہور مذہب یہی ہے۔ اور ابو الحسن لخمی نے کہا ہے کہ وہ نضح (اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے) کے حکم میں ہے، پس اگر ایک بار اسے آسمان کے پانی کے ساتھ سیراب کیا گیا اور ایک بار ڈول (راہٹ) کے ساتھ۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس کی طرف دیکھا جائے گا جس کے ساتھ کھیتی مکمل ہوئی ہے اور وہ بڑھتی اور نشوونما پاتی رہی ہے اور حکم اسی پر معلق ہوگا۔ یہ ابن القاسم کی ان سے روایت ہے۔ اور ابن وہب نے ان سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب نصف سال چشموں کے ساتھ سیراب کیا گیا پھر وہ پانی منقطع ہو گیا اور بقیہ سال اسے اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا گیا تو بلاشبہ اس پر اس کی نصف زکوٰۃ عشر ہوگی اور نصف آخر نصف عشر ہوگی۔ اور ایک بار کہا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے مطابق ہوگی جس کے ساتھ اس کی حیات مکمل ہوئی۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی اس کے حساب سے زکوٰۃ دے گا۔ اس کی مثال یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 225

ہے کہ وہ دو مہینے اونٹ کے ساتھ پانی پلائے اور چار مہینے آسمان کا پانی، تو اس میں آسمان کے پانی کی وجہ سے عشر کے دو ثلث ہوں گے اور اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے کی وجہ سے عشر کا چھٹا حصہ ہوگا۔ اور اسی کے مطابق بکار بن قتیبہ فتویٰ دیتے تھے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اغلب کی طرف دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق زکوٰۃ دی جائے گی اور ماسویٰ کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر اس نے اسے ایک دن یا دو دن بارش کے پانی کے ساتھ سیراب کیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی حصہ نہیں رکھا جائے گا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اعتبار اغلب کا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام کے تمام اس آیت کے احکام میں سے ہیں، شاید ہمارے سوا کوئی اور اس سے زیدہ بھی بیان کرے گا جتنا اللہ تعالیٰ اس کے لیے منکشف فرمائے گا۔ اس آیت کے تمام معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 22۔** اور رہا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: لیس فی حب ولا تمر صدقۃ (1) (دانوں اور کھجوروں میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے) اور اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔ تو حمزہ کنانی نے کہا ہے: اس حدیث میں فی حب کے الفاظ اسماعیل بن امیہ کے بغیر کسی نے ذکر نہیں کیے اور وہ ثقہ اور قریشی ہے اور سعید بن العاص کی اولاد میں سے ہے۔ فرمایا: اس حدیث کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اصحاب میں سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ایسے ہی ہے جیسے حمزہ نے کہا ہے اور یہ بہت بڑی اور عظیم سنت ہے جس کو تمام نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے، اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے ثابت اور محفوظ سند کے ساتھ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کیا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل روایت بیان کی ہے، لیکن وہ غریب ہے اور ہم نے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسناد حسن کے ساتھ پایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا اسراف کا لغوی معنی خطا (غلطی) کرنا ہے۔ ایک اعرابی نے ایک قوم کے ارادہ سے کہا: طلبتکم فسرفتکم یعنی میں نے تمہاری جگہ (پانے میں) غلطی کھائی۔ اور شاعر نے کہا:

وقال قائلهم والخيل تخبطهم ... أسرفتم فأجبنا أننا سَرَف

اور نفقہ اور خرچہ میں اسراف کرنے کا معنی ہوتا ہے فضول خرچی کرنا۔ اور مسرف لقب ہے مسلم بن عقبہ مری کا جو کہ واقعہ حرہ میں قائد تھا، کیونکہ اس نے اس میں انتہائی اسراف (فضول خرچی) کی۔ علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے:

هُمُ منعوا ذِمارِي يوم جاءت ... كتائبُ مُسْرِفٍ و بني اللَّكيعهْ

اور آیت میں معنی مقصود یہ ہے کہ تم کسی شی کو بغیر حق کے نہ لو کہ پھر تم اسے ایسی جگہ رکھو جو اس کا حق نہیں۔ اصبغ بن فرج نے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح ایاس بن معاویہ کا قول ہے: جس شی کے ساتھ بھی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرے تو وہی سرف اور اسراف ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: یہ والیوں کے لیے خطاب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم اپنے حق سے زیادہ کوئی شی نہ لو

1۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 5، صفحہ 39

اور نہ وہ شے جو لوگوں پر واجب اور لازم نہیں ہوتی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے: المعتدِی فی الصدقۃِ کمانِعھا(1) (صدقہ میں زیادتی کرنے والا اسے روکنے والے کی طرح ہے)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر ابو قبیس (پہاڑ) کسی آدمی کے لیے سونا ہو جائے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں خرچ کر ڈالے تو وہ اسراف (فضول خرچی) کرنے والا نہیں ہوگا اور اگر اس نے ایک درہم یا ایک مد اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کیا تو وہ مسرف ہو گیا۔ اور اسی معنی میں حاتم کو کہا گیا: لَا خَیْرَ فِی السرفِ فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہے تو اس نے جواب دیا: لَا سرف فی الخیرِ (خیر اور نیکی میں کوئی فضول خرچی نہیں ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول ضعیف ہے اور اسے وہ حدیث رد کرتی ہے جسے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ نے پانچ سو کھجور کے درختوں کا قصد کیا اور انہیں توڑا پھر انہیں ایک دن میں تقسیم کر دیا اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی شی نہ چھوڑی، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی تم سارے کا سارا مال نہ دو۔

اور عبدالرزاق نے ابن جریج سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کھجور کا ایک درخت توڑا اور اسے صدقہ کرتے رہے یہاں تک کہ اس سے کوئی شی باقی نہ رہی، تو یہ حکم نازل ہوا: وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم اسراف نہ کرو)۔ حضرت سدی نے کہا ہے: وَلَا تُسْرِفُوْا کا معنی ہے: تم اپنے مال اس طرح (دوسروں کو) نہ دو کہ تم خود فقیر ہو کر بیٹھ رہو۔ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: الإسراف ما قصرت عن حق اللہ تعالیٰ (کہ اسراف وہ ہے جو تو نے اللہ تعالیٰ کے حق سے کوتاہی اور غفلت کی)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو تمام مال صدقہ کرنا اور مسکینوں کا حق نکالنے سے روکنا دونوں سرف کے حکم میں داخل ہیں اور عدل اس کے خلاف ہے کہ وہ صدقہ بھی کرے اور باقی بھی رکھے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: خیر الصدقۃ ما کان عن ظَھرِ غِنیً(2) (بہترین صدقہ وہ ہے جو حاجات سے فالتو مال سے ہو) مگر یہ کہ اس کا نفس قوی ہو، غنی ہو، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا ہو اور منفرد ہو اس کے اہل و عیال نہ ہوں، تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے۔ اور اسی طرح وہ مال میں سے وہ حق نکالے جو اس پر واجب ہو مثلاً زکوٰۃ وغیرہ اور بعض احوال میں جو اسے مال میں متعینہ حقوق میں سے پیش آتے رہتے ہیں (انہیں وہ ادا کرے)۔ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: اسراف وہ ہے جسے وہ صلاح اور درستگی کی طرف لوٹانے پر قادر نہ ہو۔ اور سرف وہ ہے جسے وہ صلاح کی طرف لوٹانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: اسراف کا معنی فضول خرچی کرنا اور زیادتی کرنا ہے اور سرف کا معنی غفلت اور جہالت ہے (آدمی اس کام سے غافل اور جاہل ہوتا ہے اس لیے وہ اس پر خرچ کر ڈالتا ہے) جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

أعطوا ھنیدۃً یحدوھا ثمانیۃٌ ما فی عطائھم مَنٌّ ولا سَرَفٌ

ای إغفال (یعنی ان کی عطا میں نہ احسان جتلانا ہے اور نہ اس سے غافل رہنا ہے)

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 192

اور و رجل سرِفُ الفواد، یعنی اس کا دل خطا کرنے والا اور غافل ہے۔ طرفہ نے کہا ہے:

إنّ امرأ سَرِفَ الفؤاد یری عَسَلاً بماء سحابة شَتْمِی

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''اور (پیدا فرمائے) بعض مویشی بوجھ اٹھانے والے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے۔ کھاؤ اس میں سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا اس کا ماقبل پر عطف ہے، یعنی وأنشاء حمولة و فرشا من الأنعام (یعنی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے مویشیوں میں سے بعض بوجھ اٹھانے کے لیے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے) اور الانعام کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) انعام سے مراد صرف اونٹ ہیں، عنقریب اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

(۲) کہ انعام کا اطلاق اکیلے اونٹ پر ہے اور جب اس کے ساتھ گائیں اور بکریاں ہوں تو بھی وہ انعام ہی ہیں۔

(۳) اور یہی زیادہ صحیح ہے اور یہ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انعام حیوانوں میں سے ہر وہ حیوان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس قول کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (المائدہ:1) (حلال کیے گئے ہیں تمہارے لیے بے زبان جانور سوائے ان کے جن کا حکم پڑھ کر سنایا جائے گا تمہیں) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حمولۃ وہ جانور ہے جو بوجھ اٹھانے اور کلام کرنے کی طاقت رکھتا ہو، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یہ لفظ اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر وہ جانور جو اپنے اوپر زندہ کو اٹھالے چاہے وہ جانور گدھا ہو یا خچر ہو یا اونٹ ہو۔ یہ ابوزید سے منقول ہے، چاہے اس پر کوئی بوجھ ہو یا نہ ہو، جیسا کہ عنترہ نے کہا ہے:

ما رَاعَنِي إلا حمولةُ أهلِها وسط الدِّيارِ تَسُفُّ حَبَّ الخِمْخِمِ

اور فعولۃ فا کے فتحہ کے ساتھ جب فاعل کے معنی میں ہو تو اس میں مذکر اور مونث دونوں برابر ہوتے ہیں، جیسے تیرا یہ قول: رجل فروقۃ و امرأۃ فروقۃ یہ بزدل اور خوفزدہ آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

اور رجل صرورۃ و امرأۃ صرورۃ جب وہ حج نہ کریں۔ اور اس کی جمع نہیں آتی اور جب یہ مفعول کے معنی میں ہو تو پھر ہا کے ساتھ مذکر و مؤنث کے درمیان فرق کیا جائے گا، جیسے الحلوبۃ و الرکوبۃ اور الحمولۃ (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بوجھ ہیں۔ اور رہا الحمول (ضمہ کے ساتھ بغیر ہا کے) تو اس سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر ہودج رکھے ہوئے ہوں، چاہے ان میں عورتیں ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ابوزید سے مروی ہے۔ وَّ فَرْشًا حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حمولۃ اونٹوں، گائیوں میں سے ہوتا ہے۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول کرنے والے نے اس ارشاد سے استشہاد کیا

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ فرمایا: ثمانیة، حمولة و فرشا سے بدل ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: حمولة سے مراد اونٹ ہیں اور الفرش سے مراد بکریاں ہیں۔

اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حمولة سے مراد ہر وہ جانور جو بوجھ اٹھائے چاہے وہ اونٹ ہو یا گائے ہو یا گھوڑا یا خچر ہو یا گدھے ہوں۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: حمولہ وہ جانور جس پر سوار ہوا جاتا ہے اور فرش وہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور دودھ پیا جاتا ہے، جیسا کہ بکریاں، اونٹوں کے بچے اور گائیوں کے بچھڑے وغیرہ۔ ان کے اجسام کی لطافت اور ان کے فرش کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کا نام فرش رکھا گیا ہے اور فرش سے مراد ایسی ہموار زمین ہے جس پر لوگ آسانی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ راجز نے کہا ہے:

أورثني حَمولة و فَرْشا أَمُشُّها فی کل یومٍ مَشّا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَحَوَيْنَا الفَرْشَ من أنعامكم والحَمُولات ورَبَّاتِ الحَجَل(2)

اصمعی نے کہا ہے: میں نے اس کی جمع نہیں سنی ہے۔ مزید کہا: اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر ہو اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہو۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فرشها الله فرشا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے بچھا دیا (پھیلا دیا)۔ اور الفرش سے مراد گھر کا وہ ساز و سامان ہے جو بکھیر دیا گیا ہو۔ اور فرش سے مراد وہ کھیتی بھی ہے جب وہ پھیل جائے اور فرش کا معنی وسیع فضا بھی ہے۔ اور الفرش فی رجل البعیر اس کا معنی ہے، اونٹ کے پاؤں میں تھوڑی سی وسعت، اور یہ محمود اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اور افترش الشیٔ کا معنی ہے شی کا پھیل جانا، بچھ جانا۔ اور یہ لفظ مشترک ہے اور کبھی قول باری تعالیٰ: وَّفَرْشًا اس معنی کی طرف بھی راجع ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ان دونوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن یہ ہے کہ حمولہ سے مراد وہ جانور ہے جسے بوجھ اٹھانے کے لیے مسخر کر لیا گیا ہو اور فرش وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی جلد (کھال) اور اون کے ساتھ پیدا فرمایا ہے جس پر بیٹھا جا سکتا ہے اور اسے بچھایا جا سکتا ہے۔ اور باقی آیت پہلے گزر چکی ہے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ۙ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 179 2۔ ایضاً

”(پیدا فرمائے) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں یا جسے لیے ہوتے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم بتاؤ مجھے علم کے ساتھ اگر ہو تم سچے؟ اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا جسے لیے ہوئے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم کیا تم تھے موجود جب وصیت کی تمہیں اللہ نے اس بات کی؟ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو بہتان باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا تا کہ گمراہ کرے لوگوں کو اپنی جہالت سے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو ظالم ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ اس میں ثَمٰنِيَةَ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے اور وہ فعل انشأ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے آٹھ جوڑے پیدا فرمائے) یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور اخفش سعید نے کہا ہے: یہ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور اخفش علی بن سلیمان نے بیان کیا ہے: اس کی نصب (فعل) کلوا کے سبب ہے، یعنی کلوا لحم ثمانیة أزواج (تم آٹھ جوڑوں کا گوشت کھاؤ)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما سے محل کے اعتبار سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس معنی میں منصوب ہو۔ معنی ہو کلوا المباح ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ (تم مباح کھاؤ (یعنی) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو) یہ آیت مالک بن عوف اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے کہا: وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو اس آیت کے سبب ان (جانوروں) پر آگاہ فرمایا جنہیں اس نے ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، تا کہ یہ ان کی طرح نہ ہو جائیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

زوج فرد کے خلاف ہے: کہا جاتا ہے: زوج (جوڑا) اور فرد (ایک) جیسا کہ کہا جاتا ہے: خسا (رذیل، گھٹیا) اور زکا (پاکیزہ، اعلیٰ) شفع (جفت) اور وتر (طاق)۔ اور ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ سے مراد آٹھ افراد ہیں۔

اور اہل عرب کے نزدیک ہر فرد دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اسے زوج کا نام دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے للذکر زوج (مذکر کے لیے زوج ہے یعنی دوسرا ہے) اور للأنثی زوج (اور مونث کے لیے زوج یعنی دوسرا ہے) اور لفظ زوج واحد اور تثنیہ (دو) کے لیے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: هما زوجان، وهما زوج جیسے کہا جاتا ہے: هما سيان وهما سواء (وہ دونوں برابر ہیں) اور آپ کہتے ہیں: اشتريتُ زوجَي حمام (میں نے کبوتر کا جوڑا خریدا) اور انت، تعنی ذکرا و انثی (اور تو اس سے مراد مذکر اور مونث لیتا ہے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ یعنی بھیڑ میں سے دو مذکر (نر) اور مونث (مادہ) اور الضَّاْنِ سے مراد ریوڑ میں سے اون والی ہیں یعنی بھیڑیں اور یہ ضائن کی جمع ہے۔ اس کی مونث ضائنة ہے اور جمع ضوائن آتی ہے۔ اور یہ بھی

کہا گیا ہے: یہ ایسی جمع ہے جس کی واحد نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی جمع ضئین ہے، جیسا کہ عبد کی جمع عبید ہے۔ اور اس میں ضئین بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ شعیر میں شِعیر کہا جاتا ہے اور ضاد کو اتباعاً کسرہ دیا گیا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ لغت بصریوں کے نزدیک مسموع ہے اور کوفیوں کے نزدیک ہر اس لفظ میں جاری ہوتی ہے جس میں دوسرا حرف حرف حلقی ہو۔ اور اسی طرح معز میں بھی فتحہ اور سکون ہے۔ اور ابان بن عثمان نے من الضأن اثنان و من المعز اثنان پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں و من المعز اثنان ہے اور یہی اکثر کی قراءت ہے اور ابن عامر اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: کلام عرب میں اکثر المعز و الضأن بالسکون ہیں اور اس پر جمع کے بارے میں ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: معیز اور یہ معز کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عبد و عبید اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

و یَمْنَحُها بنو شَمَجَی بن جَرْم　مَعِیزَ هُمُ حنانَكَ ذا الحَنانِ(1)

اور اسی کی مثل ضأن اور ضئین ہیں۔ معز ریوڑ میں سے ضان کے خلاف ہے اور یہ بالوں اور چھوٹی دُموں والی بکریاں ہوتی ہیں اور یہ اسم جنس ہے اور اسی طرح المَعَز و المَعِیزُ و الأُمعوز و المِعزی ہیں اور مَعْز کی واحد ماعز ہے، جیسے صاحب اور صَحْب، تاجر اور تجر ہیں اور مونث ماعزۃ ہے اور یہ عنز (بکری) ہے اور اس کی جمع مواعز آتی ہے۔ اور أمعز القومُ کا معنی ہے ان کی بکریاں زیادہ ہو گئیں۔ اور المِعاز بکریاں رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ ابو محمد فقعسی نے کہا ہے وہ دودھ کی زیادتی کی وجہ سے اونٹوں کی تعریف کرتا ہے اور زمانے کی شدت اور سختی کے حالات میں بکریوں کی فضیلت بیان کرتا ہے:

یَکِلْنَ کَیْلاً لیس بالمَمْحُوقِ　إذْ رَضِیَ المِعازُ باللُّعُوقِ

اور معز کا معنی زمین کی صلابت اور سختی بھی ہے اور امعز ایسی سخت جگہ جہاں سنگریزے زیادہ ہوں۔ اس کا مونث معزاء ہے۔ اور استمعز الرجل فی أمرہ کا معنی ہے آدمی نے اپنے کام میں خوب محنت اور کوشش کی۔ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ یہ حرم کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ یہ اس پر معطوف ہے اور اسی طرح اَمَّا اشْتَمَلَتْ بھی ہے اور ہمزہ وصل کے ساتھ مد کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ استفہام اور خبر میں فرق ہو جائے۔ اور ہمزہ کو حذف کرنا بھی جائز ہے کیونکہ ام استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا:

تَرُوحُ من الحَیِّ أم تَبْتَكِر

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے کہا ہے: یہ آیت مشرکین کے خلاف حجت ہے بحیرہ اور جو اس کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں ان کے بارے میں۔ اور ان کے اس قول کے بارے میں: مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا اور یہ علم میں مناظرہ کرنے کے اثبات پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ان

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 106

کے ساتھ مناظرہ کریں اور ان کے سامنے ان کے قول کا فاسد ہونا بیان فرمائیں۔ اور اس میں نظر وفکر اور قیاس کے ساتھ گفتگو کرنے کا اثبات ہے۔ اور اس میں دلیل موجود ہے کہ جب قیاس کے مقابلے میں نص آجائے تو پھر قیاس کے ساتھ بات کرنا باطل ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ "جب اس پر کوئی اعتراض (نقض) وارد ہو"۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قیاس صحیح کے ساتھ بات کرنے کا حکم دیا ہے اور انہیں ان کی علت جاری کرنے کا حکم دیا۔ اور معنی یہ ہے: آپ ان سے کہیں اگر وہ مذکر (نر) کو حرام کرتا تو پھر ہر مذکر (نر) حرام ہوتا اور اگر وہ مونث (مادہ) کو حرام کرتا تو ہر مونث (مادہ) حرام ہوتی۔ اور اگر وہ اسے حرام کرتا جو بھیڑ اور بکریوں کے رحموں کے اندر ہے، تو پھر ہر پیدا ہونے والا ان کا بچہ حرام ہوتا چاہے وہ مذکر ہو یا مونث اور وہ تمام کے تمام پیدا کیے گئے ہیں اور جب تمام کے تمام علت پائے جانے کی وجہ سے حرام ہیں، تو اس سے ان کی علت کا انتقاض اور ان کے قول کا فاسد ہونا ظاہر ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اس بارے میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب اس پر جھوٹا بہتان ہے۔

**نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ** مجھے علم کے ساتھ آگاہ کرو اگر تمہارے پاس ہے کہ یہ تحریم جسے تم نے اپنا رکھا ہے کہاں سے آگئی؟ اور ان کے پاس کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ کتابیں پڑھتے ہی نہیں۔

اور **وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ** اور اس کے مابعد میں گفتگو اسی طرح ہے جیسے پہلے گزر چکی ہے۔ **اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ** یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر تھے جب اس نے اسے حرام قرار دیا؟ اور جب حجت اور دلیل ان پر لازم ہوئی تو وہ بہتان تراشی میں لگ گئے اور کہنے لگے: اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ** واضح فرما دیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے، جب انہوں نے کہا: اس پر دلیل موجود نہیں۔

**قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾**

"آپ فرمائیے: میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا (رگوں کا) بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت، کیونکہ وہ سخت گندہ ہے یا جو نافرمانی کا باعث ہو (یعنی) وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بلند کیا جائے غیر خدا کا نام پھر جو شخص لاچار ہو جائے نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو (حد ضرورت سے) تو بے شک آپ کا رب بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا** اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان چیزوں کے بارے میں بتایا ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ اور معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجیے جو (کتاب) میری طرف وحی کی گئی ہے میں اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے ان چیزوں کے، نہ کہ وہ جنہیں تم اپنی مرضی سے حرام قرار دیتے ہو۔ یہ

آیت مکی ہے۔ اس وقت شریعت میں سوائے ان چیزوں کے کوئی چیز حرام نہ تھی، پھر مدینہ طیبہ میں سورہ المائدہ نازل ہوئی۔ اور محرمات میں اضافہ کیا گیا جیسا کہ اَلْمُنْخَنِقَةُ (گلا گھونٹنے سے مرا ہوا جانور) اَلْمَوْقُوْذَةُ (چوٹ سے مرا ہوا جانور) اَلْمُتَرَدِّيَةُ (اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا جانور) اَلنَّطِيْحَةُ (سینگ لگنے سے مرا ہوا جانور) اور شراب وغیرہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں درندوں میں سے ہر ذی ناب کو اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے سے شکار کرنے والا) کے کھانے کو حرام قرار دیا(1)۔

اس آیت کے حکم اور اس کی تاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) ایک وہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آیت مکیہ ہے اور ہر وہ حرام شے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے یا جو کتاب میں حکم آیا ہے اسے اس (آیت) کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، تو یہ حکم کی زیادتی اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس کی وساطت سے ہے۔ اہل نظر وفکر میں سے اکثر علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اکثر فقہاء اور اہل اثر نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی نظیر عورت کا اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنا ہے اس کے باوجود کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) اور اسی طرح قسم اور ایک شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ (البقرہ:282) (اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے: اکل کل ذی ناب من السباع حرام(2) (درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور کوئی شی حرام قرار نہیں دی جائے گی مگر وہی جس کا ذکر اس میں ہے۔ اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور ان سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کوئی حرام بین اور واضح نہیں مگر وہی جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت حیوانوں میں سے ہر شی کو حلال قرار دیتی ہے سوائے ان کے جن کی آیت میں استثنیٰ ہے مثلاً مردار، بہنے والا خون اور خنزیر کا گوشت، اسی لیے ہم نے کہا ہے: انسان اور خنزیر کے سوا درندوں اور تمام حیوانوں کا گوشت مباح ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: اور اسی پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام جانوروں کو حلال قرار دینے کی بناء کی ہے جن کے بارے سکوت اختیار کیا گیا ہے، سوائے ان کے جن پر کوئی دلیل دلالت کرے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس آدمی کا جواب ہے جس نے معین شی کے بارے پوچھا تو مخصوص اس کے جواب میں یہ آیت واقع ہوئی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ تحقیق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس آیت میں جو چیزیں ہیں ان کے بارے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 245　2۔ موطا امام مالک، صفحہ 492

جواب میں انہیں ان چیزوں کے حرام ہونے کے بارے بتایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَّآ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ آپ نے یہ اس حال میں کہا جو وحی کی حالت تھی اور اس کے نازل ہونے کا وقت تھا، پھر اس کے بعد دوسری چیزوں کو حرام قرار دینے کے بارے وحی کا نازل ہونا ممتنع نہیں تھا۔

اور ابن عربی نے گمان کیا ہے (1) کہ یہ آیت مدنیہ ہے حالانکہ یہ اکثر کے قول کے مطابق مکیہ ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اس دن نازل ہوئی جس دن آپ پر اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ (مائدہ:3) نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی ناسخ آیت نازل نہیں ہوئی لہٰذا یہ آیت محکم ہے۔ نتیجتاً انہیں ہی حرام قرار دیا جائے گا جن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اور اسی کی طرف میں بھی مائل ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ میری رائے ہے اور اسے کئی دوسروں نے بھی بیان کیا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے کہ سورۃ الانعام مکی ہے سوائے اس قول کے تین آیات تک قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ (الانعام:151) اور اس کے بعد بہت سا قرآن کریم نازل ہوا اور بہت سی احادیث بیان ہوئیں۔ اور شراب کی حرمت کا حکم مدینہ منورہ میں سورۃ المائدہ میں نازل ہوا۔ اور اس پر تمام نے اجماع کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں (2) میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے وہ مدینہ منورہ میں فرمایا۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم مدینہ منورہ میں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہوا: لَّآ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علماء کے درمیان اختلاف کا سبب یہی ہے پس ایک جماعت نے ان احادیث کے ظاہر سے عدول کیا ہے جو درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کے بارے وارد ہیں، کیونکہ وہ اس آیت سے متاخر ہیں اور اس میں حصر ظاہر ہے پس اس کے مطابق عمل کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ یا تو یہ اپنے متقدم کے لیے ناسخ ہیں یا پھر یہ آیت ان احادیث پر راجح ہے۔ اور رہے وہ جو تحریم کے قائل ہیں تو ان کے لیے یہ بات ظاہر ہے اور ان کے نزدیک ثابت ہے کہ سورۃ الانعام مکی سورت ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور بلاشبہ اس آیت کے ساتھ جاہلیت کے اس نظریہ کو رد کرنے کا قصد کیا گیا ہے جس کے تحت وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام جانوروں کو حرام قرار دیتے تھے، پھر اس کے بعد بہت سے امور کو حرام قرار دیا گیا جیسا کہ پالتو گدھے اور خچروں کا گوشت وغیرہ اور درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے: جن چیزوں کا ذکر اس آیت میں ہے ان کے سوا کوئی شی حرام نہیں ہے ان کے اس قول پر یہ لازم آتا ہے کہ اسے بھی حرام قرار نہ دیا جائے جس جانور پر ذبح کے وقت عمداً اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اور اس شراب کو حلال سمجھا جائے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور انگور کی شراب کے حرام ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہونے میں اس پر واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب میں ایسی چیزیں پائی ہیں جن کے حرام ہونے کے بارے آپ کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 764
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147
3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراھیہ کل ذی ناب وذی مخلب، حدیث نمبر 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرف وحی کی گئی ہے اور وہ ان کے سوا ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ اور یہ ان میں سے ہیں جن کے بارے اس کے بعد قرآن نازل ہوا ہے۔ اور درندوں، گدھوں، اور خچروں کے گوشت کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں۔

پس آپ نے ایک بار کہا: یہ حرام ہیں، کیونکہ اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی موجود ہے، اور یہی آپ کا قول صحیح ہے جو کہ مؤطا میں ہے۔ اور ایک بار فرمایا: یہ مکروہ ہے اور "مدونہ" میں ظاہر قول یہی ہے، کیونکہ آیت ظاہر ہے اور اس لیے بھی کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے ان تمام کی اباحت مروی ہے اور یہی امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن دینار (1) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: ہمارے ہاں بصرہ میں حکم بن عمرو غفاری یہ کہتا رہا ہے، لیکن بحر ابن عباس نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی ہے: لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے درندوں کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تو آپ کو کہا گیا: ابوثعلبہ خشنی کی حدیث ہے تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جو ہمارا رب ہے ہم اس کی کتاب کو ایسے اعرابی کی حدیث کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے جو اپنی پنڈلیوں پر پیشاب کرتا ہے۔ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ہاتھی اور شیر کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اور قاسم نے کہا ہے: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں جب انہوں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ درندوں میں سے ہر ذی ناب حرام ہے: وہ حلال ہے، اور آپ یہ آیت تلاوت فرماتیں: قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا انہوں نے فرمایا کہ اگر ہنڈیا کا پانی خون کی وجہ سے زرد بھی ہو جاتا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھتے تو آپ اسے حرام قرار نہ دیتے۔ اور اس باب میں صحیح وہی ہے جو ہم نے شروع میں ذکر کر دیا ہے اور آیت کے بعد محرمات کے بارے جو کچھ بیان ہوا ہے جو سب اسی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسی پر معطوف ہے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے قبس میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے خلاف ہے جو انہوں نے احکام میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ اور ہمارے اصحاب میں سے اہل بغداد نے کہا ہے کہ جو کچھ اس کے سوا ہے وہ سب حلال ہے، لیکن درندوں کو کھانا مکروہ ہوتا ہے اور فقہاء امصار کے نزدیک ان میں سے امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور عبدالملک رحمۃ اللہ علیہم علیہ ہیں درندوں میں ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے اور یہ ممتنع نہیں ہے کہ اس قول باری تعالیٰ: قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا کے بعد کوئی ایسی زیادتی واقع ہو جس میں دلیل بیان ہو رہی ہو، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث (2) (کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک چیز کے ساتھ) اور آپ نے کفر، زنا اور قتل کا ذکر کیا۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 830  2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 185

پھر ہمارے علماء نے فرمایا: بلاشبہ قتل کے اسباب دس ہیں جو دلائل سے ثابت ہیں، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بارے خبر دیتے ہیں جو آپ ﷺ تک اللہ تعالیٰ کے علم سے پہنچا اور وہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور ثابت رکھتا ہے (اور جسے چاہتا ہے) منسوخ کر دیتا ہے اور مقدر کر دیتا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(1)۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلم نے معن سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے ''کہ پرندوں میں ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا گیا ہے''(2)۔ اور پہلی روایت اصح ہے اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کو حرام قرار دینا ہی صریح مذہب ہے اور اسی کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ''الموطا'' میں عنوان بنایا جس وقت آپ نے یہ کہا: تحریم اکل کلّ ذی ناب من السباع پھر حدیث ذکر کی اور اس کے بعد آپ نے فرمایا: وھو الأمر عندنا (اور یہ حکم ہمارے نزدیک ہے) پس آپ نے یہ خبر دی کہ اثر کے ساتھ عمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ''کہ یہ آیت آپ ﷺ پر آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے'' ہمیں یہ کہنے سے نہیں روکتا کہ ان اشیاء میں سے بعض کی تحریم اس آیت کے بعد ثابت ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر کے سال منع فرمایا(3)۔ اس تاویل کے صحیح ہونے پر گندگی، بول، گندگی کے کیڑے اور گدھوں کی تحریم پر اجماع دلالت کرتا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو اس آیت میں مذکور نہیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: **مُحَرَّمًا** ابن عطیہ نے کہا ہے: تحریم کا لفظ جب حضور نبی کرم ﷺ کی زبان اقدس پر وارد ہو تو وہ اس (معنی) کی صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ مذکور شے سے مکمل طور پر کلیۃً رک جائیں اور لغت کے اعتبار سے بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ کراہت اور اس طرح کے محل میں حد درجہ توقف کریں (رکے رہیں) اور جب اس کے ساتھ تاویل کرنے والے (مجتہدین) صحابہ کرام کی جانب سے تسلیم کا کوئی قرینہ مقترن نہیں اور ان تمام کا اجماع ہے اور احادیث کے الفاظ میں کوئی اضطراب بھی نہیں تو پھر شرعاً واجب ہے کہ اس کی تحریم حظر ومنع کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور یہ خنزیر، مردار، خون کے ساتھ مل جائے اور یہی حال شراب کی تحریم کا ہے۔ اور (اگر) اس کے ساتھ احادیث کے الفاظ مضطرب ہونے کا قرینہ مقترن ہو اور ائمہ کا احادیث کا علم رکھنے کے باوجود اس میں اختلاف ہو جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(4)۔ تحقیق درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے رسول اللہ ﷺ کی نہی وارد ہے، پھر صحابہ کرام اور جو ان کے بعد ہیں ان کے درمیان ان کی تحریم میں اختلاف ہوا ہے، تو جو نظر وفکر کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198
4۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

صلاحیت رکھتا ہے اس کے لیے ان وجوہ کی بنا پر جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو اس منع پر محمول کرے جس کے تحت کراہت وغیرہ ہیں۔ اور جس کے ساتھ تاویل کا قرینہ مقترن ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھریلو گدھوں کا گوشت کو حرام قرار دینا، تو بعض صحابہ کرام جو اس وقت حاضر تھے انہوں نے یہ تاویل کی (کہ یہ حکم اس لیے دیا گیا) کیونکہ یہ نجس ہیں اور ان میں سے بعض نے یہ تاویل کی (کہ یہ اس لیے ہوا) تاکہ لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے جانور ختم نہ ہو جائیں اور بعض نے تحریم محض کی تاویل کی۔ اور امت میں ان کے گوشت کی تحریم میں اختلاف ثابت ہو گیا، تو علماء میں سے جو نظر و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو کراہت وغیرہ کے معنی پر محمول کریں اپنے اجتہاد اور قیاس کے اعتبار سے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں اور اختلاف کے سبب میں یہ حسین عقیدہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک گدھا نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ اس کا جوہر خبیث اس وقت ظاہر ہوا جب یہ مذکر گدھے پر چڑھ دوڑا اور اس سے لواطت کی، تو اس کو رجس کا نام دیا گیا ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا ہے: چوپاؤں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی جانور قوم لوط کے عمل کی مثل عمل نہیں کرتا۔ اسے ترمذی نے "نوادر الاصول" میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ عمرو بن دینار نے ابو الشعثاء (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ کئی چیزیں کھاتے تھے اور کئی چیزیں چھوڑ دیتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنی حلال چیزوں کو حلال قرار دیا اور اپنی حرام چیزوں کو حرام قرار دیا، پس جس کو اس نے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام کر دیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے وہ خاموش ہے وہ عفو (معاف) ہے اور انہوں نے یہ آیت تلاوت کی قُلْ لَّاۤ اَجِدُ الآیہ یعنی وہ چیز جس کی تحریم بین اور واضح نہ ہو تو وہ اس آیت کے ظاہر کے مطابق مباح ہے۔

اور زہری نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا اور فرمایا: بلاشبہ مردار کو کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس سے جو شے نہیں کھائی جائے گی وہ گوشت ہے۔ اور رہی اس کی جلد، ہڈی، اون اور بال تو یہ سب حلال ہیں۔ اور ابو داؤد نے ملقام بن تلب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور میں نے حشرات الارض (2) کی تحریم کے بارے آپ سے نہیں سنا۔ الحشرۃ کا معنی ہے زمین پر رینگ کر چلنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے مثلاً یرابیع (چوہے کی مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں کوتاہ اور پچھلی بڑی اور دم دراز ہوتی ہے) گوہ اور سیہہ اور انہیں کی طرح کے اور جانور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اَكَلنا الرُّبیٰ یا أمّ عمرو ومن یَكُنْ　　غَریبا لَدَیكُم یأكُلِ الحشرات

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 183۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، حدیث نمبر 3306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 174

یعنی جو رینگتے ہیں اور چلتے ہیں اور الدُّبیٰ دبیۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے چوہیا۔ خطابی نے کہا ہے: ان کے اس قول لم اسمع لھا تحریما میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ مباح ہیں، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی اور نے اسے سنا ہو۔ تحقیق لوگوں نے یربوع (جنگلی چوہا) اور وبر (بلی سے چھوٹا ایک جانور ہے) اس کی جمع وبار ہے اور ان کی طرح کے حشرات کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور یربوع کے بارے میں حضرات عروہ، عطا، امام شافعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ نے رخصت دی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وبر میں کوئی حرج نہیں اور ابن سیرین، حکم، حماد اور اصحاب رائے نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور اصحاب رائے نے قنفذ (سیہہ) کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔

اور اس کے بارے مالک بن انس سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا۔ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے: اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سیہہ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ابو ثور بھی اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور انہوں نے اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ اور اس کے بارے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الآیہ تو ان کے پاس موجود ایک شخص نے کہا: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خبیثة من الخبائث (1) (یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے) یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے تو پھر اسی طرح ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گوہ، یربوع اور ورل (گوہ کی طرح کا ایک جانور ہے مگر اس سے بڑا ہوتا ہے) کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور آپ کے نزدیک سانپ کھانے بھی جائز ہیں بشرطیکہ انہیں ذبح کیا جائے۔ اور یہی قول ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعی کا ہے۔ اور اسی طرح اژدھا، بچھو، چوہے، غنظایہ (چھپکلی کی طرح ایک جانور) سیہہ اور مینڈک کے بارے بھی ان کا قول ہے۔

اور ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ قول کے میں زمین کے چھوٹے پرندے (یا کیڑے مکوڑے) بچھو اور کیڑے کھانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: پانی میں (ان میں سے) کسی کا مرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شہد کی مکھیوں کے بچے اور پنیر اور کھجور کے کیڑے اور انہیں کی طرح کی اور چیزیں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان کی دلیل ملقام بن تلب کی حدیث ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا ہے تو وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے۔ اور چوہیا کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے: وہ حرام نہیں ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا اور مدینہ طیبہ کے علماء کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے اور دیگر موذی جانوروں میں سے کسی شی کے کھانے کی اجازت نہیں دیتے مثلاً سانپ، چھپکلیاں، چوہے اور انہیں کے مشابہ دیگر جانور۔ اور ہر وہ شے جسے مارنا جائز ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 177

ہے اس کے نزدیک اسے کھانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ان کے نزدیک ذبح کا عمل ہو سکتا ہے۔ اور یہی قول ابن شہاب، عروہ، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک تمام وحشی درندوں میں سے کوئی شی نہ کھائی جائے گی اور نہ ہی گھریلو بلی کھائی جائے گی اور نہ ہی جنگلی کیونکہ وہ بھی درندہ ہے۔

اور فرمایا: نہ بجو کھایا جائے گا اور نہ ہی لومڑ اور چیر پھاڑ کرنے والے پرندوں کو کھانے میں کوئی حرج نہیں مثلاً گدھیں، چیلیں اور عقاب وغیرہ، وہ بھی جس نے کوئی مردار کھایا اور وہ بھی جس نے نہ کھایا۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام کے تمام پرندے حلال ہیں، مگر وہ گدھوں کو ناپسند کرتے ہیں (اور مکروہ جانتے ہیں) اور امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا جو چیر پھاڑ کرنے والے پرندے کھانا مکروہ جانتا ہو اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا انکار کیا ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا ہے''(1)۔

اور اشہب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہاتھی کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ اسے ذبح کیا جائے۔ اور یہی امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور اس سے امام شافعی نے منع فرمایا ہے۔ اور حضرت نعمان (امام اعظم ابوحنیفہ) رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے بجو اور لومڑ کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت دی ہے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بجو کھاتے رہتے تھے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ عام نہی نہیں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے درندوں میں سے کسی درندے کو خاص نہیں کیا۔ اور بجو کو کھانے کی اباحت کے بارے میں وہ حدیث جسے امام نسائی نے روایت کیا ہے وہ ان احادیث میں سے نہیں ہے جو نہی والی حدیث کے معارض آسکتی ہو(2)، کیونکہ اس حدیث کو بیان کرنے میں عبدالرحمن بن ابی عمار منفرد ہیں اور وہ نقل علم کے ساتھ مشہور نہیں اور نہ وہ راوی ان میں سے ہے جسے حجت بنایا جا سکتا ہو جب کہ اس کے خلاف وہ ہے جو اس سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کی حدیث اسناد متواترہ سے مروی ہے۔ اور ثقہ اور انتہائی مضبوط ائمہ کرام کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے اور یہ محال ہے کہ ان کے معارض ابن ابی عمار کی حدیث کی مثل لائی جائے۔ ابو عمر نے کہا ہے: مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ بندر کھانا جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ فرمایا: اور میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اسے کھانے کی رخصت دی ہو مگر وہ روایت جسے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے ایوب سے ذکر کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بندر کھانے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ بهیمة الأنعام میں سے نہیں ہے (یعنی وہ چوپائے جن کا گوشت کھایا جا سکتا ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے حضرت عطا سے روایت کیا ہے کہ ان سے بندر کے بارے پوچھا گیا جسے حرم پاک میں مار دیا جاتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے بارے دو عادل آدمیوں کا فیصلہ ہوگا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147　　2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198

فرمایا: پس حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس کا گوشت کھانا جائز ہے، کیونکہ جزا اس پر واجب نہیں ہوتی جو شکار کے علاوہ کسی (جانور) کو قتل کردے۔

اور رویانی کی (بحر المذہب) میں ہے جو کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر ہے اور امام شافعی نے کہا ہے بندروں کی بیع کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سکھلایا جاتا ہے اور ان سے مال کی حفاظت کا نفع اٹھایا جاتا ہے اور کشفی نے ابن شریح سے بیان کیا ہے کہ اس کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تو ان سے پوچھا گیا اس سے نفع کی صورت کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ان کے ساتھ بچے خوش ہوجاتے ہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: کتا، ہاتھی اور تمام کے تمام ناب والے جانور میرے نزدیک بندر کی مثل ہیں اور حجت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں ہے نہ کہ کسی اور کے قول میں۔ تحقیق لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ عرب میں ایسا کوئی نہیں ہے جو کتے کا گوشت کھاتا ہو سوائے فقعس کی قوم کے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جانور کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے جو غلاظت اور گندگی کھاتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹوں میں جلالہ سے مراد یہ ہے کہ اس پر سوار ہوا جاتا یا اس کا دودھ پیا جاتا ہو۔ حلیمی ابو عبداللہ نے کہا ہے: جلالہ وہ ہوتا ہے جو گندگی اور غلاظت کھاتا ہو چاہے وہ چوپایا ہو یا آزاد پھرنے والی مرغی (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

اور علماء نے کہا ہے: ہر وہ جانور جس کے گوشت میں غلاظت کی بو ظاہر ہوجائے یا اس کا ذائقہ اس میں ظاہر ہوجائے تو وہ حرام ہے اور اگر وہ ظاہر نہ ہو تو فہو حلال تو وہ حلال ہوگا۔ اور علامہ خطابی نے کہا ہے: یونہی یہ نہی تنزیہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ غلاظت کی غذا کھائے اور اس کی بو اس کے گوشت میں پائی جائے اور یہ تب ہوگا جب اس کا غالب چارہ اس میں سے ہو اور اگر وہ گھاس چرے اور وہ دانے کھائے اور اس کے ساتھ وہ گندگی میں سے بھی کوئی شی کھالیتا ہو تو وہ جلالہ نہیں ہوگا، بلاشبہ یہ آزاد پھرنے والی مرغی کی طرح ہے۔ اور اسی طرح وہ حیوان جو کبھی کبھار گندگی میں سے کوئی شی پائے لیکن اس کی غالب غذا اور چارہ اس کے سوا ہو تو اس کا گوشت کھانا مکروہ نہیں ہوگا۔

اور اصحاب الرائے، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اسے نہیں کھایا جائے گا یہاں تک کہ اسے کچھ دنوں تک روک کر رکھا جائے اور وہ گندگی کے علاوہ صاف چارہ کھائے، پس جب اس کا گوشت صاف اور پاک ہوجائے تو پھر اسے کھا لیا جائے۔ تحقیق حدیث میں مروی ہے کہ "گائے، بیل کو چالیس دن تک چارہ کھلایا جائے گا پھر اس کا گوشت کھایا جائے گا"۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مرغ کو تین دن تک روکتے تھے اور پھر اسے ذبح کرتے تھے۔ اور اسحاق نے کہا ہے: اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اس کے بعد کہ اس کے گوشت کو اچھی طرح دھو ڈالا جائے۔ اور حسن جلالہ کے گوشت کو کھانے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور اسی طرح امام مالک بن انس کا بھی نظریہ ہے اور اس باب میں سے یہ بھی ہے کہ زمین میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 446۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 175

گندگی پھینکنے سے منع کیا گیا ہے۔ بعض سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کی زمین کرائے پر دیتے تھے اور اس پر شرط عائد کرتے تھے جو اسے کرائے پر لیتا تھا کہ وہ اس میں گندگی نہ پھینکے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنی زمین کرائے پر دیتے تھے اور یہ شرط لگاتے تھے کہ اس میں گندگی اور غلاظت کے ساتھ کھاد نہیں ڈالی جائے گی۔

اور یہ روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی زمین میں غلاظت ڈال کر اسے کاشت کرتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو وہ ہے جو لوگوں کو وہی کھلاتا ہے جو ان سے نکلتا ہے۔

گھوڑے کا گوشت کھانے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مباح قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جہاں تک خچر کا تعلق ہے تو وہ گھوڑے اور گدھے کے درمیان سے پیدا ہوا ہے اور ان میں سے ایک کھایا جاتا ہے یا مکروہ ہے اور وہ گھوڑا ہے اور دوسرا حرام ہے اور وہ گدھا ہے پس تحریم کا حکم غالب رہے گا، کیونکہ جب حلت اور حرمت کا حکم ایک معین چیز میں جمع ہو جائے تو اس میں تحریم کے حکم کو غالب قرار دیا جائے گا۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل عنقریب سورۃ النحل میں آئے گی۔ اور مکڑی کا حکم سورۃ الاعراف میں آئے گا۔

جمہور اسلاف و اخلاف کا موقف ہے کہ خرگوش کھانا جائز ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اس کی تحریم کو بیان کیا ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ سے اس کے مکروہ ہونے کا حکم منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس اسے (خرگوش کو) لایا گیا اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے نہ کھایا اور نہ اسے کھانے سے منع فرمایا۔ اور گمان یہ ہے کہ اسے حیض آ رہا تھا۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی نے موسیٰ بن طلحہ سے مرسل روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس خرگوش لایا گیا، اسے ایک آدمی نے بھونا تھا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کا خون دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا اور اسے نہ کھایا۔ اور وہ جس کے پاس تھا اسے فرمایا: ''تم کھاؤ کیونکہ اگر میں اسے چاہتا (اور پسند کرتا) تو میں اسے کھا لیتا'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں ایسی کوئی شی نہیں ہے جو اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہو اور بلاشبہ یہ آپ ﷺ کے اس قول کی طرح ہے: ''بے شک یہ میری قوم کی زمین میں نہیں ہے کہ میں بذات خود پاؤں اور اسے عفو قرار دوں'' (2)۔ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم مرالظہران کے مقام سے گزرے پس ہم نے ایک خرگوش کو بھگایا اور وہ سب اس کے پیچھے دوڑ پڑے تو انہوں اس پر غلبہ پا لیا (یعنی اسے پکڑ لیا) فرمایا: پس میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا یہاں تک کہ میں نے اسے پا لیا اور اسے ابوطلحہ کے پاس لے آیا اور انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی سرین اور اس کی ران رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیج دیں اور میں اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آیا تو آپ نے اسے قبول فرما لیا (3)۔

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 831
3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 152

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ یعنی کھانے والے پر جو اسے کھاتا ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے أُوحی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے يَطَّعَمه طا کو مشدد پڑھا ہے۔ انہوں نے يتطعمه کا ارادہ کیا اور پھر ادغام کر دیا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور محمد بن حنفیہ نے اسے فعل ماضی کے ساتھ على طاعم طعمه پڑھا ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی إلا أن تكون العين أو الجثة أو النفس ميتة (یعنی ضمیر مستتر کا مرجع ان تینوں میں سے کوئی شی ہو سکتی ہے اور یکون یا کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ميتة کو مرفوع، یعنی معنی یہ ہوگا تقع و تحدث ميتة (مردار واقع ہوگا) اور مسفوح سے مراد وہ جاری ہے جو بہہ رہا ہو اور یہ حرام کیا گیا ہے۔ اور جو اس کے سوا ہے معفو عنہ ہے۔

ماوردی نے بیان کیا ہے (1) کہ ایسا خون جو دم مسفوح (بہنے والا خون) نہ ہو اگر وہ رگوں والا ہو اور ان پر جما ہوا ہو جیسا کہ جگر اور تلی تو وہ حلال ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردے اور دو خون حلال کیے گئے ہیں'' (2)۔ الحدیث۔

اور اگر وہ رگوں والا نہ ہو کہ وہ ان پر جامد ہو اور وہ گوشت کے ساتھ ہو تو اس کی تحریم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک قول ہے کہ وہ حرام ہے، کیونکہ وہ نہ تو سارا دم مسفوح ہے اور نہ بعض۔ اور بلاشبہ جگر اور تلی کی استثنا کے لیے مسفوح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ حرام نہیں ہے، اس لیے کہ تحریم مسفوح کے ساتھ مختص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے عمران بن جریر نے کہا ہے: میں نے ابو مجلز سے اس گوشت کے بارے پوچھا جو خون کے ساتھ لتھڑا پڑا ہو اور ہانڈی میں خون کی سرخی اس پر غالب آ رہی ہو تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دم مسفوح (بہنے والے خون) کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے کہا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: اگر یہ آیت نہ ہوتی تو مسلمان ان رگوں کی اتباع کرتے جن کا یہودی اتباع کر رہے ہیں۔ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عرق (رگ) دماغ میں خون ہونے کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا اور مضطر (مجبور) کا حکم سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶

''اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری سے ہم نے حرام کی ان پر دونوں (گائے اور بکری) کی چربی مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 181
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 182

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ جب الله تعالیٰ نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر حرام فرمائیں تو اس سے پیچھے ان کا ذکر کیا جو اس نے یہودیوں پر حرام کیں، کیونکہ اس میں ان کے اس قول کی تکذیب مقصود ہے کہ الله تعالیٰ نے ہم پر کوئی شی حرام نہیں کی، بلکہ ہم نے بذات خود اپنے اوپر ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں بنی اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ اور هَادُوْا کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ تحریم ان پر تھی جو یہودی بنے تھے بلاشبہ یہ پابندی ان پر بطور آزمائش اور سزا تھی پس ان پر جو چیزیں حرام کی گئیں ان میں سے پہلی چیز جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر ناخن والا جانور۔ حسن نے ظفر فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوالسمال نے ظِفْرٍ ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور ابوحاتم نے ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کا انکار کیا ہے اور یہ قراءت ذکر نہیں کی حالانکہ یہ ایک لغت ہے۔ ظِفِرٍ ظا اور فا دونوں کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور اس کی جمع أظفار، أظفور اور أظافیر ہے۔

علامہ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نحاس نے فراء سے یہ زیادتی بیان کی ہے أظافیر و أظافرۃ۔ ابن السکیت نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل أظفر بین الظفر جب اس کے ناخن طویل اور لمبے ہوں، جیسے کہا جاتا ہے: رجل أشعر یہ لمبے بالوں والے آدمی کو کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ چوپاؤں اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں کھلی نہ ہوں، جیسے اونٹ، شترمرغ، مرغابی اور بطخ۔ اور ابن زید نے کہا ہے: صرف اونٹ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ سے مراد اونٹ اور شترمرغ ہے، کیونکہ شترمرغ اونٹ کی طرح ناخن والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے والا) اور چوپاؤں میں سے ہر کھر والا جانور ہے۔ اور حافر (کھر) کو مجازاً أظفر کا نام دیا جاتا ہے۔

اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: کھر بھی ناخن ہے اور پنجہ (مخلب) بھی ناخن ہے، مگر یہ اپنی مقدار کے مطابق ہیں اور وہ اپنی مقدار پر ہے یہاں کوئی استعارہ اور مجاز نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ انہی دونوں کو ان دونوں میں سے کاٹا اور لیا جاتا ہے اور دونوں کی جنس ایک ہے، یعنی یہ نرم و ملائم ہڈی ہے۔ یہ دراصل غذا سے بڑھتی ہے اور انسان کے ناخنوں کی مثل اسے کاٹا جاتا ہے اور اسے حافر کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ زمین پر لگنے کے وقت اسے کھودتے ہیں۔ اور اس کا نام مخلب رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی ان سوئیوں کے سروں کے ساتھ دوسرے پرندے کو زخمی کر دیتا ہے۔ اور اسے ظفر اسے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اشیاء کو اپنے ناخنوں کے ساتھ پکڑتا ہے، یعنی آدمی اور پرندہ ان کے ساتھ غلبہ پاتا اور کامیاب ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد ثرب اور گردوں کی چربی ہے۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور ثروب، ثرب کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ باریک چربی ہے جو اوجھ پر ہوتی ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے ان پر ہر چربی حرام کر دی سوائے اس کے جو ہڈی کے ساتھ یا ہڈی پر لگی ہوئی ہو اور ان کے لیے پہلو اور چکی (لاٹ) کی چربی حلال قرار دی، کیونکہ وہ دم کی ہڈی پر ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اس میں استثنا کی بنا پر ما محل نصب میں ہے اور ظُهُوْرُهُمَآ، حَمَلَتْ کا فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَوِ الْحَوَايَآ ظهور پر عطف ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی او حملت حوایاھما اور اس پر الف لام اضافت کا بدل ہے۔ اور اس بنا پر الحوایا (آنتیں) من جملہ ان میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا۔

اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ اس میں مَا حَمَلَتْ پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس بارے میں جو کہا گیا ہے اس میں سے یہی اصح ہے۔ اور یہی قول کسائی، فراء اور احمد بن یحییٰ کا ہے۔ اور نظر و فکر یہ ثابت کرتی ہے کہ شی کا عطف اس پر کیا جائے جو اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ورنہ اس کا معنی صحیح نہ ہوگا یا دلیل اس معنی کے سوا کسی اور پر دلالت کرے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک استثنا تحلیل میں ہے یعنی صرف وہ چربی جسے ہڈیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔ اور قولہ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ محرم (حرام کی ہوئی شی) پر معطوف ہے۔ اور معنی یہ ہے: ان پر حرام کی گئی ہے ان دونوں کی چربی یا آنتیں یا وہ جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، سوائے اس کے جسے پشتیں اٹھائے ہوئے ہوں، کیونکہ وہ حرام نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ چربی نہیں کھائے گا تو وہ پشت کی چربی کھانے سے حانث ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے من جملہ چربی سے اس کی استثنا کی ہے جو ان کی پشت پر ہو۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: اَوِ الْحَوَايَآ، اَلْحَوَايَآ: اس سے مراد مباعر (مینگنیاں نکلنے کی جگہ یعنی انتڑیاں) ہے (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔ اور مباعر، مبعر کی جمع ہے، اور ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں مینگنیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور بعر سے مراد زبل (کھاد، گوبر اور لید) ہے اور اَلْحَوَايَآ کا واحد حاویاء ہے، جیسا کہ قاصعاء اور قواصع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حاویۃ کی جمع ہے جیسا کہ ضاربۃ اور ضوارب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حویۃ کی جمع ہے جیسا کہ سفینۃ اور سفائن ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: الحوایا (انتڑیاں) وہ ہیں جو پیٹ میں گول گھومی ہوئی ہیں (2) اور یہ گھومنے والی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا سے مراد دودھ کے خزائن (آنتیں) ہیں اور یہ مباعر (گوبر کی انتڑیوں) کے ساتھ ملی ہوتی ہیں اور یہ مصارین (آنتیں) ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا وہ آنتیں ہیں جن پر چربی ہوتی ہے اور اس مقام کے سوا الحوایا سے مراد وہ کپڑا (یا کمبل) ہے جو اونٹ کی کوہان کے ارد گرد ڈالا جاتا ہے جیسے امرؤ القیس نے کہا ہے:

جعلْنَ حَوَايَا و اقْتَعَدْنَ تعائدا وحففن من حَوْكَ العِراق المُنَمّق

پس اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے (3) کہ اس نے ان پر یہ تحریم تورات میں لازم کی ہے یہ ان کی کذب بیانی کے رد کے لیے کہا ہے، اور اس بارے میں اس کی نص ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وکل دابة لیست مشقوقة

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 110
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769

الحاضر وکل حوت لیس فیہ سفاسق، ای بیاض (تم پر حرام کر دیئے گئے ہیں مردار، خون، خنزیر کا گوشت، ہر وہ جانور جس کے کھر سامنے سے کھلے نہ ہوں اور ہر وہ مچھلی جس میں سفیدی نہ ہو) پھر الله تعالیٰ نے اس تمام کو حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور ان کے لیے مباح قرار دیئے وہ جو ان پر حیوانوں میں سے حرام تھے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے اس تکلیف اور مشقت کو زائل فرما دیا اور حل و حرمت اور امر و نہی کے اعتبار سے دین اسلام کے احکام لازم کر دیئے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اگر وہ اپنے چوپاؤں کو ذبح کریں اور انہیں کھائیں (1) جنہیں الله تعالیٰ نے ان کے لیے تورات میں حلال قرار دیا ہے اور انہیں چھوڑ دیں جنہیں ان پر حرام کیا ہے تو کیا وہ (جانور) ہمارے لیے حلال ہوگا؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ حرام ہے اور سماع المبسوط میں کہا ہے: وہ حلال ہے اور یہی ابن نافع نے کہا ہے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: میں اسے مکروہ قرار دیتا ہوں۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ذبح کے وقت وہ اس کا قصد (اور نیت) نہیں کرتے، لہٰذا وہ خون کی طرح حرام ہے۔ اور دوسرے قول کی وجہ یہ ہے اور وہی صحیح ہے کہ الله تبارک و تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ ان کی تحریم کا حکم اٹھا لیا ہے اور اب اس میں ان کا اعتقاد موثر نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ اعتقاد فاسد ہے۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے صحیح ہونے پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے صحیحین نے حضرت عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم قصر خیبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، تو کسی آدمی نے چمڑے کا ایک برتن جس میں چربی تھی پھینکا تو میں اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف اچھلا پس جب میں (دوسری طرف) متوجہ ہوا تو وہاں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو مجھے آپ سے حیا آ گئی (2)۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم کے الفاظ ہیں: حضرت عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے خیبر کے دن چربی سے بھرا ہوا چمڑے کا ایک برتن پایا تو میں اس سے چمٹ گیا اور میں نے کہا: آج میں اس میں سے کسی کو کوئی شی نہ دوں گا، وہ فرماتے ہیں: پھر میں دوسری جانب متوجہ ہوا تو دیکھا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما رہے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم فرمانے کا سبب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا برتن اٹھانے کے لیے ابن مغفل کی شدید حرص کو اور اس کے بارے شدید بخل کو دیکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ وہ برتن پھینک دینے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی اور عام علماء رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ اسے کھانا جائز ہے، مگر امام مالک نے اس میں اختلاف کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

ابن منذر نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا حرام ہونا بھی بیان کیا ہے اور امام مالک کے کبار اصحاب اسی کی طرف گئے ہیں اور ان کا استدلال وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ پس اگر انہوں نے ہر ناخن والا جانور ذبح کیا تو اصبغ نے کہا ہے: کتاب الله میں ان کے ذبائح میں سے جو حرام ہے اسے کھانا حلال نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی تحریم کا اعتقاد

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 606

رکھتے ہیں۔ اور اشہب اور ابن القاسم نے بھی یہی کہا ہے اور ابن وہب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: جو ان پر حرام ہے، اور ہم اس کے بارے اپنی کتاب سے جانتے ہیں تو ہمارے لیے ان کے ان ذبائح کو کھانا حلال نہیں ہو گا اور جس کی تحریم کو ہم نہیں جانتے مگر ان کے اقوال اور ان کے اجتہاد سے تو ان کے ذبائح میں سے وہ ہم پر حرام نہیں ہو گا (1)۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ، ای ذالك التحريم (وہ تحریم) پس ذٰلِكَ محل رفع میں ہوا، یعنی الأمر ذالك جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ یہ ہم نے انہیں سزا دی ان کے ظلم کے بدلے، یہ ان کے لیے سزا ہے ان کے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کی وجہ سے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے اور ان کے سود لینے اور لوگوں کے مالوں کو باطل طریقے سے حلال سمجھنے کی وجہ سے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ تحریم بلاشبہ گناہ کے سبب ہوئی، کیونکہ یہ تنگی ہے اور خوشحالی اور وسعت سے اس کی طرف مؤاخذہ کے وقت ہی پھیرا جا سکتا ہے۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بلاشبہ ہم یہود کے بارے اپنی اس خبر دینے میں سچے ہیں کہ ہم نے ان پر گوشت اور چربی حرام کر دی۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"پھر اگر وہ جھٹلائیں آپ کو تو آپ فرمائیے: تمہارا پروردگار کشادہ رحمت والا ہے اور نہیں ٹالا جا سکتا اس کا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہو"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ یہ شرط ہے اور جواب شرط یہ ارشاد گرامی ہے: فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ یعنی اس نے اپنی رحمت کے وسیع ہونے کے سبب تم سے درگزر فرمائی اور تمہیں دنیا میں کوئی سزا نہ دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کے بارے خبر دی جو اس نے ان کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے اور فرمایا: وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (اور اس کا عذاب جرائم پیشہ قوم سے نہیں ٹالا جا سکتا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب اللہ تعالیٰ دنیا میں عذاب نازل کرنے کا ارادہ فرمالے تو پھر جرائم پیشہ قوم سے اس عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

"اب کہیں گے جنہوں نے شرک کیا اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے کسی چیز کو۔ ایسا ہی جھٹلایا تھا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ چکھا انہوں نے ہمارا عذاب۔ آپ فرمائیے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اسے ہمارے لیے؟ تم نہیں پیروی کرتے مگر نرے گمان کی اور نہیں ہو تم مگر اٹکلیں مارتے ہو"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770

قولہ تعالیٰ: سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں۔ انہوں نے کہا: لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ سے مراد بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علم غیب کے ساتھ اس بارے میں خبر دی ہے جو وہ عنقریب کہیں گے اور انہوں نے گمان کیا کہ یہی ان کے لیے سہارا اور تھامنے کی شے ہے جب انہیں حجت نے لازم پکڑ لیا اور انہیں اس نظریہ کے باطل ہونے کا یقین ہو گیا جس پر وہ تھے۔ اور معنی یہ ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہمارے باپ دادا کی طرف رسول بھیج دیتا اور وہ انہیں شرک سے اور ان چیزوں کو حرام کرنے سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال کیا ہے، منع کرتا تو وہ اس سے باز آ جاتے، رک جاتے اور ہم بھی اس طریقہ پر ان کی اتباع و پیروی کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا رد کیا اور فرمایا: هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا یعنی کیا تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل ہے کہ یہ اسی طرح ہے؟

إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ یعنی تم اس قول میں محض ظن کی پیروی کر رہے ہو۔ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (اور تم نری اٹکلیں مارتے ہو) تا کہ تم اپنے ضعیف اور کمزور لوگوں کو وہم میں مبتلا کر سکو کہ تمہارے پاس یہ حجت اور دلیل ہے۔

اور قولہ: وَلَا آبَاؤُنَا کا أَشْرَكْنَا میں نون پر عطف کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا: نحن ولا آباونا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول: وَلَا تو کید مضمر کے قائم مقام ہے، اسی لیے یہ کہنا اچھا ہے: ماقمت ولا زید

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾

''آپ فرمایئے۔ اللہ ہی کے لیے کامل دلیل ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت فرماتا تم سب کو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ یعنی ایسی کامل دلیل جو محجوج (جس کے خلاف حجت لائی گئی) کے عذر کو ختم کر دیتی ہے اور اس سے شک کو دور کر دیتی ہے جس نے اس میں غور و فکر کی۔ پس اس کی کامل حجت اس پر ہے کہ یہ بین اور واضح ہے کہ وہ واحد اور یکتا ہے اور اس نے انبیاء اور رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا ہے، پس اس نے مخلوقات میں نظر و فکر کے ذریعے توحید کو بیان فرمایا اور معجزات کے ذریعے رسولوں کی تائید فرمائی اور اپنا امر (حکم) ہر مکلف پر لازم کیا۔ اور رہا اس کا علم، اس کا ارادہ اور اس کی کلام تو یہ غیب ہے جس پر کوئی بندہ مطلع نہیں ہو سکتا، سوائے ان رسولوں کے جنہیں وہ چن لے (پسند فرمالے) اور مکلف بنانے کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے کہ بندہ اس حیثیت میں ہو کہ اگر وہ اس کام کو کرنے کا ارادہ کر لے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا ہے تو وہ اس کے لیے ممکن اور آسان ہو۔

اور معتزلہ نے اس قول کے سبب التباس پیدا کیا ہے: لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا انہوں نے کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جنہوں نے اس کی مشیت سے شرک کیا۔ اور ان کا اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مذمت بیان کی ہے کہ انہوں نے حق کی طلب میں اپنا اجتہاد اور کوشش کر دی۔ اور بلاشبہ انہوں نے مزاح اور لہو و لعب کے اعتبار سے کیا۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُم (الزخرف: 20) (اور کفار کہتے ہیں کہ اگر چاہتا (خداوند) رحمن تو ہم انہیں نہ پوجتے) اگر وہ یہ قول تعظیم و تکریم اور اس کی معرفت کی بنا پر کہتے تو یہ

ان کے لیے عیب نہ ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (الانعام: 107) (اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے) اور مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام: 111) (تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا) اور فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور مومن یہ کہتے ہیں: یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے بارے جانتا ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

"آپ فرمایئے: لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اسے۔ پھر اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو آپ نہ گواہی دیجئے ان کے ساتھ اور نہ تم پیروی کرنا ان کی خواہشوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور جو نہیں ایمان لاتے آخرت پر اور وہ اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ یعنی آپ فرمایئے ان مشرکین کو۔ تم اس پر اپنے گواہ لاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے جسے تم نے حرام کیا ہے۔ اور هَلُمَّ یہ کسی شی کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا کلمہ ہے۔ اور اس میں اہل حجاز کے نزدیک واحد، جمع اور مذکر اور مونث سبھی برابر ہوتے ہیں۔ (یعنی تمام کے لیے هلم ہی استعمال ہوتا ہے) مگر نجد کی لغت میں ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: هلما، هلموا، هلمی وہ اس طرح اس کے ساتھ (تثنیہ) جمع وغیرہ کی) علامت لاتے ہیں جیسے وہ تمام افعال میں ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم اہل حجاز کی لغت پر نازل ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا (الاحزاب: 18) وہ فرماتا ہے: هلم یعنی حاضر کرو یا قریب ہو۔ اور هلم الطعام اس کا معنی ہے کھانا لاؤ۔ اور یہاں آیت میں معنی ہے: هاتوا شهدآءكم (تم اپنے گواہ لاؤ) اور میم کو فتحہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے دیا گیا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں رُدَّ یا هذا، تو اس میں (دال پر) ضمہ اور کسرہ جائز نہیں۔ اور خلیل کے نزدیک دراصل ها ہے اور اس کے ساتھ لم ملا دیا گیا ہے، پھر کثرت استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس کی اصل هل ہے اور اس پر لم کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اپنے الفاظ پر ہے اور هات کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خلیل کی "کتاب العین" میں ہے: اس کی اصل هل أؤم ہے یعنی هل أقصدك (کیا میں تیرا قصد کر سکتا ہوں) پھر انہوں نے اسے کثرت سے استعمال کیا یہاں تک کہ اس قول کا مقصود یہ رہ گیا (احضر) حاضر کرو) جیسا کہ تعال اس کا اصل معنی تو ہے کہ اوپر والا نیچے والے کو کہے: اور پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ اس معنی میں ہو گیا کہ نیچے والا اوپر والے کو کہتا ہے تعال۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ شَهِدُوْا یعنی اگر ان میں سے بعض بعض کی شہادت دے دیں۔ فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ تو تم ادا شہادت کی

تصدیق نہ کرو سوائے کتاب اللہ کے یا نبی کریم ﷺ کی زبان کے اور ان کے پاس ان میں سے کوئی شئی نہیں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْــٴًـا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۵۱ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۵۲ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۵۳

''آپ فرمایئے: آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو کچھ حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر (وہ یہ) کہ نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی (کے خوف) سے ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا ہے اللہ نے سوائے حق کے یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے جن کا تا کہ تم (حقیقت کو) سمجھو۔ اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور پورا کرو ناپ اور تول انصاف کے ساتھ ہم نہیں تکلیف دیتے کسی کو مگر اس کی طاقت کے برابر اور جب بھی بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ ہو (معاملہ) رشتہ دار کا اور اللہ تعالیٰ سے کیے وعدہ کو پورا کرو، یہ ہیں وہ باتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔ اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا، سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کر دیں گے تمہیں اللہ کے راستہ سے، یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں جن کا تا کہ تم متقی بن جاؤ''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ آؤ اور پڑھو جو یقیناً حق ہے جیسا کہ میرے رب نے میری طرف وحی فرمایا ہے، نہ یہ ظن ہے اور نہ ہی کذب جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، پھر اسے بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْــٴًـا آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: تعال یعنی آگے آؤ اور عورت کے لیے تعالی تثنیہ مذکر و مؤنث کے لیے تعالیا اور جمع مذکر کے لیے تعالوا اور جمع مونث کے لیے تعالین کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب: 28) (تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں) اور انہوں نے تقدم کو تعالیٰ اور ارتفاع (بلند ہونا اور چڑھنا) کی ایک قسم قرار دیا ہے، کیونکہ

مامور بالتقدم فی الاصل اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہے گویا کہ وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسے کہا گیا: تعال، ای ارفع شخصك بالقیام و تقدم (یعنی اٹھ اور آگے آ) اور انہوں نے اس میں وسعت رکھ دی ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے ٹھہرنے والے کے لیے استعمال کیا ہے، یہ ابن الشجری نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مَا حَرَّمَ اس میں مَا خبر یہ ہے اور اَتْلُ کے سبب محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہے: آؤ میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ پس اگر عَلَيْكُمْ، حَرَّمَ کے ساتھ معلق ہو تو پھر وجہ یہ ہے، کیونکہ یہ قریب ترین ہے اور یہ بصریوں کی پسند ہے۔ اور اگر تم اسے اَتْلُ کے ساتھ معلق کرو تو یہ جید اور عمدہ ہے، کیونکہ وہ اسبق اور پہلے ہے۔ اور اسے ہی کوفیوں نے اختیار کیا ہے۔

اور اس قول میں تقدیر عبارت یہ ہے أتل علیکم الذی حرم ربکم، الّا تشرکوا یہ محل نصب میں ہے اور اس میں پہلے لفظ اول کے ساتھ فعل مقدر ہے، یعنی أتل علیکم الّا تشرکوا یعنی میں تم پر تلاوت کرتا ہوں کہ شرک کرنا حرام ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس فعل اغرا کے سبب منصوب ہو جو عَلَيْكُمْ میں ہے اور عَلَيْكُمْ اپنے ماقبل سے منقطع ہو، یعنی علیکم ترك الاشراك، وعلیکم احسانا بالوالدین (تم پر شرک کو ترک کرنا لازم ہے اور تم پر والدین کے ساتھ احسان کرنا لازم ہے) اور یہ کہ تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو اور یہ کہ تم بے حیائی کے نزدیک نہ جاؤ، جیسا کہ تم کہتے ہو: علیك شأنك، ای الزم شانك (اپنے کام کو لازم پکڑ)

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ (المائدہ: 105) (تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کو دیکھو) یہ سب ابن شجری نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ ان محل نصب میں ہو اور وہ ما سے بدل ہو۔ یعنی أتل علیکم تحریم الاشراك (میں تم پر شرک کی تحریم کا حکم تلاوت کرتا ہوں) اور فراء نے اختیار کیا ہے کہ لا نہی کے لیے ہے، کیونکہ اس کے بعد ولا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ تمام مخلوق کو ان چیزوں کے بارے تلاوت سننے کی دعوت دیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔ اور اسی طرح آپ کے بعد علماء پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو تبلیغ کریں اور ان کے لیے وہ چیزیں بیان کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں میں سے حرام قرار دیں ہیں جو اس نے حلال فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (آل عمران: 187) (کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو)۔ اور ابن المبارک نے ذکر کیا ہے: ہمیں عیسیٰ بن عمر بن عمرو بن مرہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے انہیں بتایا اور کہا کہ ان کے ہمنشین ربیع بن خثیم نے کہا: کیا تجھے یہ بات خوش کرے گی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحیفہ لایا جائے جس کی مہر نہیں توڑی گئی؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس یہ پڑھو قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ، پس انہوں نے تین آیات کے آخر تک پڑھا۔ اور حضرت کعب الاحبار نے کہا ہے: یہ آیت تو تورات کا آغاز ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ الآیہ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ وہ محکم آیات

ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں کیا ہے اور ان پر تمام مخلوق کے ادیان کا اجماع ہے اور وہ کسی دین میں بھی منسوخ نہیں ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیے گئے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا والدین کے ساتھ احسان کرنے کا مفہوم ہے ان کے ساتھ نیکی کرنا، ان کی حفاظت کرنا، انہیں (تکلیف اور رنج والم سے) بچانا، ان کے حکم کی تعمیل کرنا، ان سے غلامی کو زائل کرنا اور ان پر رعب داب اور غلبہ نہ پانا۔ اور اِحْسَانًا مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اس کا ناصب اس کا ہم لفظ فعل مضمر ہے۔ تقدیر کلام ہے وأحسنوا بالوالدین إحسانا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ املاق کا معنی فقر و افلاس ہے یعنی تم فقر و افلاس کے خوف سے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہ کرو، کیونکہ میں تمہارا اور ان کا رازق ہوں۔ تحقیق ان میں ایسے ہی تھے جو فقر و افلاس کے ڈر سے بچیوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے تھے، جیسا کہ ظاہر آیت دلالت کرتی ہے۔ أملق بمعنی إفتقر (فقیر ہونا) ہے اور املقہ بمعنی افقرہ (اس نے اسے مفلس کر دیا) یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ نقاش نے مورج سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: املاق کا معنی لغت لخم کے مطابق بھوک ہے۔

اور منذر بن سعید نے ذکر کیا ہے کہ املاق کا معنی انفاق (خرچ کرنا) ہے کہا جاتا ہے: أملق ماله بمعنی أنفقه (یعنی اس نے اپنا مال خرچ کیا) اور یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو فرمایا: أملقی من مالك ما شئت (اپنے مال میں سے تو جو چاہے خرچ کر) اور رجل ملق وہ آدمی جو اپنی زبان سے وہ کچھ دیتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ پس الملق لفظ مشترک ہے اس کا بیان اپنے محل میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں جو عزل سے روکتے ہیں، کیونکہ زندہ درگور کرنا موجود فرد اور نسل کو اٹھانا اور ختم کرنا ہوتا ہے اور عزل اصل نسل کا انکار ہوتا ہے لہٰذا یہ اس کے مشابہ ہو گیا، مگر ایک نفس کو قتل کرنا (مارنا) بہت بڑا گناہ اور انتہائی قبیح اور برا فعل ہے۔ اسی لیے ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: بے شک عزل کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ذالك الوأد الخفي (1) وہ (عزل کرنا) وأد خفی ہے یعنی یہ خفیہ زندہ درگور کرنا ہی ہے) تو یہ کراہت ہے نہ کہ تحریم اور صحابہ کرام کی ایک جماعت اور دوسروں نے بھی یہ کہا ہے۔ اور عزل کی اباحت کے بارے میں بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت، تابعین اور فقہاء کا قول ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا عليكم ألا تفعلوا فانما هو القدر (2) یعنی تم پر کوئی حرج نہیں اس بارے میں کہ تم نہ کرو (بلاشبہ یہ تقدیر ہے) تحقیق اس سے حسن اور محمد بن مثنی نے یہ سمجھا ہے کہ یہ عزل کے بارے میں نہی اور زجر و توبیخ ہے۔ اور پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وإذا اراد الله خلق شئ لم يمنعه شئ (3) (اور جب اللہ تعالیٰ کسی شی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرما لے تو کوئی شی اسے نہیں روک سکتی) امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: آزاد عورت کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل جائز نہیں ہوتا، گویا انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 466　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 464　　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 465

انزال کو عورت کی لذت کی تکمیل دیکھا ہے اور اسے بچے کے بارے میں عورت کے حق میں سے قرار دیا ہے اور اگر موطوءہ لونڈی ہو تو اس کے بارے ان کا یہ خیال نہیں، کیونکہ آدمی اس کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل کر سکتا ہے، کیونکہ اس کا ذکر کردہ چیزوں میں سے کسی شی میں کوئی حق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے۔ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام: 120) (اور ترک کر دو ظاہری گناہ کو اور چھپے ہوئے کو) پس اس کا قول مَا ظَهَرَ گناہوں اور معاصی کی تمام انواع سے نہی اور روکنا ہے۔ اور وَمَا بَطَنَ سے مراد مخالفت کا وہ نظریہ اور اعتقاد جو دل میں پختہ ہو جائے۔ اور ظہر وبطن دو حالتیں ہیں جو مکمل طور پر اشیاء کی ان تمام اقسام کو محیط ہیں جو اس کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ادر مَا ظَهَرَ، الْفَوَاحِشَ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور وَمَا بَطَنَ اس پر معطوف ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، النَّفْسَ میں الف لام تعریف جنس کے لیے ہے، جیسا کہ ان کے اس قول میں ہے: أهلك الناس حُبُّ الدرهم والدينار اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (المعارج: 19) (ان مثالوں میں الناس اور الْاِنْسَانَ پر الف لام تعریف جنس کے لیے ہے) کیا آپ دیکھتے نہیں کہ رب کریم کا ارشاد ہے: اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (المعارج) (سوائے نمازیوں کے) اور اسی طرح ارشاد گرامی ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (العصر) (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) کیونکہ آگے فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (العصر: 3) (سوائے ان کے جو ایمان لائے) تو یہ آیت اس نفس کو قتل کرنے کے بارے میں نہی ہے جسے حرام کیا گیا ہے، چاہے وہ مومن ہو یا ان کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہو مگر اس حق کے ساتھ جو اس کے قتل کو واجب کرتا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پس جس نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے" (1)۔

اور اس حق میں کئی امور ہیں: ان میں سے زکوٰۃ کا انکار کرنا اور نماز کو ترک کرنا بھی ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کیا۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (التوبہ: 5) (پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ولا يحلُّ دمُ امرئٍ مسلمٍ إلا بإحدى ثلاث الثيب الزاني والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة (2) (مسلم آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے شیبہ عورت جوز نا کرے، نفس کو نفس کے بدلے (ایک آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے گا) اور جماعت سے الگ ہو کر اپنے

---

1۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 89

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3621

دین کو ترک کرنے والا (یعنی مرتد ہونے کے سبب وہ واجب القتل ہو جائے گا)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منھما(1) (جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ(2) (جسے تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کا عمل کرتا ہے تو تم فاعل اور مفعول بہ کو قتل کر دو) عنقریب اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الآیہ (المائدہ:32) (بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے کہ انہیں (چن چن کر) قتل کیا جائے)۔

اور مزید فرمایا: وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا الآیہ (الحجرات:9) (اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو) اور اسی طرح وہ آدمی جس نے مسلمانوں کا عصا توڑا اور ان میں سے کسی جماعت کے امام کی مخالفت کی اور ان کے کلمہ (قول) کو متفرق کر دیا اور اہل و مال کو اچک کر زمین میں فساد برپا کر دیا اور حاکم وقت کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا، پس رب کریم کے ارشاد اِلَّا بِالْحَقِّ کا یہی معنی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: المؤمنون تتکافأ دماؤھم ویسعی بذمتھم ادناھم لا یقتل مسلم بکافر ولا ذو عھد فی عھدہ ولا یتوارث اھل ملتین(3) (مومنین کے خون کا بدلہ لیا جائے گا اور ان کے ادنی اپنی ذمہ داری کے لیے کوشش کریں گے کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی ذمی کو اس کے عہد کے دوران قتل کیا جائے گا اور علیحدہ علیحدہ دو دین رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے)۔ ابوداؤد اور نسائی نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: من قَتَلَ معاھدا فی غیر کُنْھِہٖ حَرَّمَ اللہ علیہ الجنۃ (جس نے کسی ذمی کو بلا وجہ قتل کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی۔

اور ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے فرمایا: من قَتَلَ رجلاً من اھل الذمۃ لم یجد ریح الجنۃ وان ریحھا لیوجد من مسیرۃ سبعین عاما(4) (جس نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کیا وہ جنت کی ہوا نہیں پائے گا اور بلاشبہ اس کی ہوا ستر برس کی مسافت سے پائی جائے گی)

اور بخاری شریف میں اس حدیث میں ہے: ''بے شک اس کی ہوا (خوشبو) چالیس برس کی مسافت سے پائی جائے گی''(5)۔ آپ نے اسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 128 — 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، کتاب الفرائض، حدیث 2523۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6745 — 5۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1021

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ یہ ان محرمات کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں کاف اور میم خطاب کے لیے ہیں اور ان دونوں کا اعراب میں کوئی حصہ نہیں۔ وَصّٰىكُمْ بِهٖ وصیت سے مراد وہ امر (حکم) ہے جو مؤکد اور مقرر ہو۔ اور کاف اور میم محل نصب میں ہیں، کیونکہ یہ ضمیر ہے جو مخاطب کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اور وصی میں ضمیر فاعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مطر الوراق نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں پر اوپر سے جھانک کر دیکھا اور فرمایا: تم کس بنا پر مجھے قتل کرتے ہو؟ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے وہ آدمی جس نے محصن ہونے کے بعد زنا کیا تو اس پر رجم کی سزا ہے یا جس نے عمداً کسی کو قتل کیا تو اس پر قصاص ہے یا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تو اس پر قتل کی سزا ہے'' (1)۔ تو قسم بخدا! نہ میں نے زنا کیا ہے زمانہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں اور میں نے کسی کو قتل نہیں کیا کہ اس کے بدلے میری جان لی جائے (یعنی مجھے قصاصاً قتل کیا جائے) اور نہ میں مرتد ہوا ہوں جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، بلاشبہ میں شہادت دیتا ہوں لا إله إلا الله وأن محمدًا عبده ورسوله، یہ جو میں نے تمہارے لیے ذکر کیا ہے اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم (حقیقت کو) سمجھو (2)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جس میں اس کا فائدہ ہو اور یہ اس کے اصل مال کی حفاظت کرنا اور اس کے فروع میں اضافہ کرنا ہے۔ اور اس میں یہی سب سے اچھا قول ہے، کیونکہ یہ جامع قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی اس میں تجارت کرنے کے ساتھ اور نہ تو اس سے خریدے اور نہ قرض لے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ یعنی یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور یہ کبھی بدن میں ہوتی ہے اور کبھی معرفت و پہچان میں تجربہ کے ساتھ اور دونوں وجہوں کا حصول ضروری ہے، کیونکہ یہاں أشُدّ کا لفظ مطلق واقع ہوا ہے، حالانکہ سورۃ النساء میں یتیم کے حال کا بیان مقید آیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی)۔

پس یہ قوت بدن اور وہ بلوغ النکاح ہے اور قوت معرفت اور وہ ایناس الرشد ہے دونوں کو جامع ہے اور اگر یتیم کو اپنے مال پر معرفت حاصل ہونے سے پہلے اور قوت بدنیہ حاصل ہونے کے بعد قدرت اور اختیار دے دیا جائے تو وہ یقیناً اسے اپنی شہوات میں ضائع کر دے اور پھر وہ ایسا نادار اور مفلس باقی رہ جائے جس کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا۔ اور اس شرط کے ساتھ یتیم کو خاص اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں اور آباء اپنے بیٹوں کے پاس موجود نہیں ہوتے پس باپ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 485

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب الامام یامر بالعفو فی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب لایحل دم امرئ مسلم الا فی ثلاث، حدیث نمبر 2523، ایضاً

کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا (اور جھوٹ بولنا) بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ اور جوانی کی عمر تک پہنچنا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو بغیر احسن طریقہ کے اس کے مال کے قریب جانے کو مباح قرار دیتا ہو یا کیونکہ بالغ کے حق میں حرمت ثابت ہے۔ اور یتیم کو خاص طور پر ذکر اس لیے کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے جھگڑا کیا ہے (اور وہ غالب ہے) اور معنی یہ ہے کہ تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو ہمیشہ کے لیے بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور کلام میں حذف ہے: فاذا ابلغ أشدّہ و أونس منه الرشدُ فادفعوا الیه ماله (یعنی جب وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اور اس سے دانائی مانوس ہو جائے تو تم اسے اس کا مال دے دو)۔

اور علماء نے یتیم کے جوانی کی عمر کو پہنچنے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس ابن زید نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا مراد ہے۔ اور اہل مدینہ نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا اور اس کا رشد و ہدایت سے مانوس ہونا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے مراد اس کا پچیس برس کی عمر کو پہنچنا ہے۔

ابن عربی نے کہا (1) ہے: تعجب ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ پر کہ وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مقدارات قیاسی اور نظری طور پر ثابت نہیں ہوتیں بلکہ یہ نقلی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ اور آپ انہیں احادیث ضعیف سے ثابت کرتے ہیں، لیکن وہ دار الضرب (بغداد) میں سکونت پذیر ہیں پس ان کے پاس مدلس راوی کثیر ہیں اور اگر وہ معدن (مدینہ منورہ) میں سکونت پذیر ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقدر بنایا تو پھر ان سے دین کے خالص مسائل کے سوا کچھ صادر نہ ہوتا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ادھیڑ عمر کی انتہا، اس میں یہ کہ اس میں جوانی کی قوتیں جمع ہو چکی ہوں، جیسا کہ سحیم بن وثیل نے کہا ہے:

أخُو خمسين مُجتَمِعٌ أشُدِّی ونَجَّذنِي مُدَاوَرةُ الشُّئُونِ

اس میں نجذنی دال اور ذال دونوں کے ساتھ مروی ہے اور الأشدّ واحد ہے اس کی جمع نہیں۔ لہٰذا یہ الآنك کے قائم مقام ہے۔ جس کا معنی سیسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا واحد شد ہے، جیسا کہ فلس اور افلس ہے اور اس کی اصل شدّ النھار یعنی دن چڑھ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أتیتہ شد النھار و مد النھار (میں اس کے پاس آیا اس حال میں کہ دن چڑھ چکا تھا اور پھیل گیا تھا۔ اور محمد بن محمد الضبی عنترہ کا شعر کہتا ہے:

عَهْدِی به شدَّ النهار كأنما خُضِبَ اللَّبانُ ورأسهُ بالعِظْلِمِ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تُطیف به شَدّ النهار ظَعِینةٌ طویلةُ أنقاءِ الیدَیْن سَحُوق

اور سیبویہ کہتے ہیں: اس کا واحد شِدّۃ ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور معنی میں یہی اچھا اور حسین ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: بلغ الغلام شِدّتہ (بچہ اپنی جوانی کو پہنچ گیا) لیکن فِعْلة کی جمع أفْعُل کے وزن پر نہیں آتی اور رہا انعم تو یہ نعم کی جمع ہے۔ یہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 271

2۔ یہ ابن عربی کی جانب سے امام ابوحنیفہ پر تشدید ہے حالانکہ ادلہ کو پیش نظر رکھا جائے تو امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ائمہ کے نقطہ نظر پر فائق ہوتا ہے۔

ان کے اس قول سے ہے: یوم بؤس (تکلیف دہ اور تنگ دن) اور یوم نُعْم (خوشحال دن) اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا ہے کہ اس کی واحد شدّ ہے، جیسا کہ کلب اور اکلب ہے اور اس کی واحد شدّ ہے مثل ذئب اور اذئب تو بلاشبہ یہی قیاس ہے، جیسا کہ وہ ابابیل کی واحد میں کہتے ہیں: أبول یہ عجول پر قیاس ہے اور یہ کوئی ایسی شی نہیں ہے جو عربوں سے سنی گئی ہو۔ ابوزید نے کہا ہے: اصابتنی شُدّٰی یہ فعلی کے وزن پر ہے، ای شِدَّۃ (مجھے تکلیف آپہنچی ہے اور فعلی کے وزن پر ہے اور اشد الرجل (تب کہا جاتا ہے) جب اس کے پاس طاقتور سواری کا جانور ہو۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ یعنی بیع وشراء کرتے وقت لینے دینے میں عدل کے ساتھ ناپ اور تول پورا پورا کرو۔ اور القسط کا معنی عدل ہے۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اور ہم ناپ تول پورا کرنے میں کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ اوامر بلاشبہ انہی چیزوں میں ہیں جو حفاظت اور پرہیز کے اعتبار سے انسان کی قدرت واختیار کے تحت واقع ہیں۔ اور ایسا تفاوت اور فرق جو دو ناپوں کے درمیان اس طرح ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو اور نہ وہ آدمی کی قدرت اور اختیار کے تحت داخل ہو تو وہ معاف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کیل بمعنی مکیال (یعنی پیمانہ جس کے ساتھ ماپ کیا جاتا) ہے۔

کہا جاتا ہے: ھذا کذا و کذا کَیْلًا یہ ناپ کے اعتبار سے اتنا اتنا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر میزان کا عطف کیا گیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے بارے میں یہ جان لیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ اس بات سے تنگ دل ہیں کہ وہ خوشی کے ساتھ کسی کو وہ شی بھی دیں جو دنیا میں ان پر لازم اور ضروری نہیں تو اس نے دینے والے کو یہ حکم فرمایا کہ وہ صاحب حق کا وہ حق پورا پورا ادا کرے جو اس کا بنتا ہے اور اسے زیادہ دینے کا پابند نہیں فرماتا، کیونکہ زیادتی اس پر گراں گزرے گی اور اس کا دل تنگ ہوگا۔ اور صاحب حق کو حکم فرمایا کہ وہ اپنا پورا پورا حق وصول کرلے اور اسے اپنے حق سے کم مقدار پر راضی ہونے کا پابند نہیں کیا، کیونکہ اس نقصان اور کمی میں اس کا دل تنگ ہوگا۔

اور مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی قوم میں کبھی خیانت ظاہر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے اور کسی قوم میں زنا عام نہیں ہوتا مگر اس میں موت بڑھ جاتی ہے اور کوئی قوم ناپ تول میں کمی نہیں کرتی مگر ان سے رزق کاٹ لیا جاتا ہے (یعنی ان کا رزق کم کر دیا جاتا ہے) اور کوئی قوم بغیر حق کے (بے انصافی کے ساتھ) فیصلے نہیں کرتی مگر ان میں قتل وغارت عام ہو جاتی ہے اور کوئی قوم وعدہ خلافی نہیں کرتی مگر ان پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ تم عجمیوں کے گروہ ہو تمہیں ایسے دو امروں کا والی اور پابند بنایا گیا ہے جن کے سبب تم سے پہلے لوگ ہلاک ہو گئے اور وہ ناپ اور تول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا یہ ارشاد احکام اور شہادات تمام کو متضمن ہے۔ وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اگرچہ وہ حق تمہارے کسی قرابت دار پر ہو، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا یہ ان تمام وعدوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لے رکھے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عقد ہوں جو دو آدمیوں کے

درمیان طے پاتے ہیں۔ اور اس عہد کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت اور اسے وفا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (تاکہ تم نصیحت حاصل کرو)

**مسئلہ نمبر 14۔** قولہ تعالیٰ: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ یہ بہت عظیم آیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ماقبل پر عطف کیا ہے، کیونکہ جب اس نے پہلے نہی اور امر بیان کیا تو یہاں اپنے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع و پیروی کرنے سے ڈرایا اور اس میں اپنے راستے کی اتباع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، جیسا کہ ہم اسے احادیث صحیحہ اور اقوال سلف کے ساتھ بیان کریں گے۔

وَ اَنَّ یہ محل نصب میں ہے ای واتل انّ هٰذَا صِرَاطِيْ (اور میں تلاوت کرتا ہوں کہ یہ میرا راستہ ہے) اور فراء اور کسائی سے منقول ہے۔ امام فراء نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو یعنی وَصّٰىكُمْ بِهٖ وبأنّ هٰذَا صِرَاطِيْ (اس نے تمہیں حکم دیا ہے اس کے بارے اور اس کے بارے کہ یہ میرا راستہ ہے) اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے: ولأنّ هٰذَا صِرَاطِيْ (کیونکہ یہ میرا راستہ ہے) جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (الجن: 18) (یعنی ولأنّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ)۔

اور اعمش، حمزہ اور کسائی نے وإنّ هذا ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی ان آیات میں جو ذکر کیا گیا ہے وہی میرا سیدھا راستہ ہے۔

ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے وانْ هذا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور ان مخففہ مشددہ کی مثل ہی ہے۔ مگر یہ کہ اس میں ضمیر قصہ اور شان ہے۔ ای وانه هذا اور یہ محل رفع میں ہے۔ اور محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ زائدہ ہو اور تاکید کے لیے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ (یوسف: 96) اور الصراط سے مراد وہ راستہ ہے جو دین اسلام ہے۔ مُسْتَقِيْمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا معنی ہے ہموار اور سیدھا جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اور اپنے اس راستے کی اتباع و پیروی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا جسے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر راستہ قرار دیا اور اسے شریعت بنایا اور اس کی انتہا جنت میں ہے۔ اور اس سے متفرق راستے نکلتے ہیں پس جو سیدھے راستے پر چلتا گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے ان راستوں کی طرف نکل گیا تو انہوں نے اسے جہنم تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (اور تم اور راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اس راستے سے ایک طرف کر دیں گے)۔ داری ابو محمد نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان، حماد بن زید اور عاصم بن بہدلہ نے خبر دی ہے حضرت ابو وائل سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمارے لیے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر فرمایا ھذا سبیلُ اللہ (یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے) پھر اس کی دائیں جانب بھی خطوط کھینچے اور اس کی بائیں جانب بھی۔ پھر فرمایا ھذہ سُبُلٌ علی کل سبیل منھا شیطان یدعوالیھا (1) (یہ راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے اور وہ اس کی طرف بلاتا ہے)۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 91

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اور اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے (1) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور دو خط اس کی دائیں جانب اور دو خط اس کی بائیں کھینچے، پھر اپنا دست مبارک درمیان والے خط پر رکھا اور فرمایا: ھذا سبیلُ اللہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ اور یہ راستے یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، تمام اہل ادیان، اہل بدعت، خواہش اور نفس پرستوں کی جملہ گمراہیوں اور فروعات میں شذوذ اور علاوہ ازیں انتہائی گہرائی میں غواصی کرنے والوں کی جانب سے علم کلام میں جدل و مناظرہ وغیرہ سبھی کو شامل ہیں۔ یہ سب کے سب صراط مستقیم سے بھٹکنے کا ذریعہ ہیں اور سوء اعتقاد کا وہم پیدا کرنے والے ہیں۔ یہ ابن عطیہ نے کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے۔ علامہ طبری نے کتاب آداب النفوس میں ذکر کیا ہے: محمد بن عبدالاعلی صنعانی نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے بتایا کہ ہمیں محمد بن ثور نے معمر سے اور انہوں ابان سے نقل کیا ہے کہ کسی آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: صراط مستقیم کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کے قریب چھوڑا ہے اور اس کی ایک طرف جنت میں ہے اور اس کی دائیں جانب بھی راستے ہیں اور اس کی بائیں جانب بھی راستے ہیں اور وہاں لوگ ہیں جو اپنے پاس سے گزرنے والے کو بلاتے ہیں، پس جس نے ان راستوں میں سے کسی کو اختیار کر لیا تو وہ اسے جہنم تک پہنچا دے گا اور جو سیدھے راستے پر چلتا گیا تو وہ اس کے سبب جنت تک پہنچ جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا الآیہ۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم علم سیکھ لو اس سے پہلے کہ اسے قبض کر لیا جائے اور اس کا قبض کرنا یہ ہے کہ اہل علم اٹھ جائیں (فوت ہو جائیں) خبردار! تم کلام میں غلو کرنے، اس کی انتہائی گہرائی تک پہنچنے (یا چرب زبانی سے باتیں کرنے) اور بدعت سے بچو، اور تم پر قدیم اول (ابتدائی پرانا دین) کو پکڑنا لازم ہے۔

اسے دارمی نے روایت کیا ہے: تعلموا العلم قبل أن یُقبض، وقبضه أن یذهب أهله، ألا وإیاکم والتَّنَطُّعَ والتعمق والبدع وعلیکم بالعتیق اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد بدعتیں ہیں۔ ابن شہاب نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا، الآیہ (الانعام: 159) (بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ) پس بھاگو بھاگو اور نجات پاؤ نجات پاؤ اور صراط مستقیم اور مضبوط طریقے کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو یہ وہی ہے جس پر سلف صالحین چلے اور یہی نفع بخش تجارت ہے۔

ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أمرتکم به فخذوہ وما نهیتکم عنه فانتهوا (2) (میں جس چیز کے بارے تمہیں حکم دوں تم اسے لے لو اور جس سے میں تمہیں منع کروں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ، جلد 1، صفحہ 3

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التفسیر، جلد 1، صفحہ 2

اس سے رک جاؤ)۔ اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسا وعظ فرمایا کہ اس سے آنکھیں (آنسوؤں سے) بہہ پڑیں اور اس سے دل خوفزدہ ہو گئے، تو ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک یہ تو الوداع کہنے والے کا وعظ ہے، تو ہماری حفاظت کے لیے کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تمہیں ایک روشن اور واضح دین پر چھوڑا ہے اس کی رات اس کی دن کی مثل ہے۔ جو بھی میرے بعد اس میں بھٹک جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، تم میں سے جو زندہ رہا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا پس تم پر اسے اختیار کرنا لازم ہے جسے تم میری سنت سے اور میرے بعد خلفائے راشدین مہدیین کی سنت سے پہچانو اس پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ۔ اور ایسے امور سے بچو جو نئے اختراع کیے گئے ہوں، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور تم پر اطاعت لازم ہے اگرچہ (امیر) حبشی غلام ہی ہو، کیونکہ مومن نکیل ڈالے گئے اونٹ کی طرح ہے کہ اسے جہاں چلایا جائے وہ پیروی کرتا ہے'' (1)۔ اسے ترمذی نے اسی معنی کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

قد ترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها لا یزیغ عنها بعدی إلا هالك من یعش منکم فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بما عرفتم من سنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین بعدی عضوا علیها بالنواجذ وایاکم والأمور المحدثات فإن کل بدعة ضلالة و علیکم بالطاعة وإن عبدا حبشیا فإنما المؤمن کالجمل الأنف حیثما قید انقاد۔ (2)

اور ابو داؤد نے روایت بیان کی ہے (3) کہ ابن کثیر نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابو سفیان نے خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ کسی آدمی نے حضرت عمر بن عبد العزیز کی طرف خط لکھا اور تقدیر کے بارے آپ سے دریافت کیا، تو آپ نے اس کی طرف لکھا: أما بعد! فإنی أوصیك بتقوی الله والاقتصاد فی أمره واتباع سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم وترك ما أحدث المحدثون بعد ما جرت به سنته، وکفوا مؤونته فعلیك بلزوم الجماعة فإنها لك باذن الله عصمة الخ۔

(میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے معاملہ میں میانہ روی کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنے کی نصیحت کرتا ہوں، اور انہیں ترک کرنے کی جو مبتدع لوگوں نے ایجاد کی ہیں اس کے بعد کہ ان کے بارے سنت موجود ہے اور اس کی مشقت (اور معاونت) سے باز رہو، پس تجھ پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہے کیونکہ وہ تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے حفاظت اور بچاؤ ہے۔ پھر تو جان لے کہ لوگوں نے کسی بدعت کو ایجاد نہیں کیا مگر اس سے پہلے کوئی ایسی شی گزر چکی ہو جو اس پر دلیل ہو یا اس میں اس کا قیاس ہو، کیونکہ سنت کو سنت اس نے قرار دیا ہے جو اس کے خلاف خطا اور غلطی، بے وقوفی (یعنی کم عقلی) اور تعمق (گہرائی) تو جانتا اور اس سے واقف ہے، پس تو اپنے آپ کے لیے اس پر راضی اور خوش رہ جس سے قوم نے اپنے نفسوں کو راضی رکھا، کیونکہ وہ علم کی بنا پر اس سے واقف ہوئے اور کھلی نگاہ کے ساتھ دیکھ کر اس سے باز رہے، بلاشبہ وہ کشف امور پر زیادہ قوت اور قدرت رکھتے تھے اور جس فضل و مہربانی کے ساتھ وہ اس مقام میں ہے وہ اولیٰ اور افضل ہے، پس اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم ہو تو پھر تم اس کی طرف ان پر سبقت لے گئے ہو اور اگر تم کہو کہ یہ (بدعت) ان کے بعد

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 453 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، جلد 2، صفحہ 279

ظاہر ہوئی ہے تو اسے ایجاد نہیں کیا مگر اس نے جس نے ان کے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع اور پیروی کی ہے اور اس نے اپنے آپ کو ان سے دور کر لیا ہے، بلاشبہ سابقون تو وہی ہیں۔ تحقیق انہوں نے اس بارے میں ایسی گفتگو کی ہے جو کافی ہے اور انہوں نے وہ وصف بیان کیا ہے جو شفایاب کرتا ہے (یعنی باعث اطمینان ہے) پس جو ان سے کم ہے وہ کوتاہی کرنے والے کی طرف سے ہے اور جو ان سے اوپر (اور زیادہ) ہے وہ جسارت کرنے والے کی طرف سے ہے۔ تحقیق ایک قوم نے ان کے جو درجہ میں ان سے کم ہے اس نے کوتاہی کی پس انہوں نے جفا کی (ظلم کیا) اور ان میں سے کئی قوموں نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے غلو کیا اور بلاشبہ وہ اس کے باوجود ہدایت مستقیم پر ہیں۔ اور حدیث ذکر کی (1)۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: تم پر اثر و سنت کی اقتدا کرنا لازم ہے، کیونکہ ڈر ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب کوئی انسان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام احوال میں آپ کی اقتدا اور پیروی کرنے کا ذکر کرے گا تو لوگ اس کی مذمت کریں گے اور اس سے نفرت کریں گے اور اس سے برأت اختیار کر لیں گے اور وہ اسے ذلیل و رسوا کریں گے۔ حضرت سہل نے کہا: بے شک اہل سنت کے ہاتھ پر بدعت ظاہر ہوئی، کیونکہ انہوں نے ان کی معاونت کی اور انہوں نے اس کے ساتھ بحث مباحثہ کیا اور ان کے جھوٹے دعوے ظاہر ہوئے اور عام لوگوں میں پھیل گئے اور اس نے بھی اسے سن لیا جس نے نہیں سنا ہوا تھا، اگر وہ انہیں چھوڑ دیتے اور ان سے گفتگو نہ کرتے تو ان میں سے ہر ایک اس کے ساتھ مر جاتا جو اس کے سینے میں تھا اور اس سے کوئی شی ظاہر نہ ہوتی اور وہ اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ اور حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: تم میں سے کوئی کسی بدعت کا آغاز نہیں کرتا یہاں تک کہ ابلیس اس کے لیے کوئی عبادت ایجاد کرتا ہے اور وہ اس کے مطابق عبادت کرنے لگتا ہے پھر وہ اس کے لیے بدعت کو ایجاد کر دیتا ہے اور جب وہ بدعت کے بارے بولنے لگتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ اس سے اس خدمت (اور بوجھ) کو الگ کر لیتا ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں کوئی حدیث نہیں جانتا جو مبتدع کے لیے اس حدیث سے زیادہ سخت ہو۔ حجب اللہ الجنۃ عن صاحب البدعۃ (اللہ تعالیٰ نے جنت کو بدعتی سے چھپا لیا ہے) فرمایا: پس یہودی اور نصرانی اس کی نسبت زیادہ امیدوار ہیں۔ حضرت سہل نے کہا: جو چاہے کہ اپنے دین کی عزت و تکریم کرے تو وہ سلطان وقت کے پاس داخل نہ ہو، عورتوں کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور ہوس پرستوں کے ساتھ مخاصمت اور جھگڑا نہ کرے۔ اور یہ بھی فرمایا: تم اتباع و پیروی کرو اور نئی چیزیں (بدعت) ایجاد نہ کرو۔ تمہارے لیے وہ کافی ہوگی۔

اور مسند دارمی میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے ابو عبدالرحمن! بلاشبہ میں نے مسجد میں ابھی وہ شے دیکھی ہے جس کو میں نے ناپسند کیا ہے اور الحمد للہ میں نے خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا، انہوں نے پوچھا: تو وہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: اگر آپ زندہ رہے تو عنقریب آپ اسے دیکھ لیں گے۔ میں نے مسجد میں ایک قوم کو مختلف حلقوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقے میں ایک آدمی ہے اور ان کے

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاتھوں میں سنگریزے ہیں اور وہ انہیں کہہ رہا ہے: سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔ چنانچہ وہ سو مرتبہ سبحانہ اللہ پڑھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو پھر تم نے انہیں کیا کہا؟ انہوں نے بتایا: میں نے انہیں کچھ نہیں کہا۔ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کیا۔ انہوں نے فرمایا: کیا تم نے انہیں حکم نہیں دیا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور میں ان کے لیے ضامن ہوں کہ یہ عمل ان کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی ان کی معیت میں چلے یہاں تک کہ وہ ان حلقوں میں سے ایک حلقے میں آئے اور ان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ اور فرمایا: یہ کیا ہے جو میں تمہیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ابو عبدالرحمن! یہ سنگریزے ہیں، ہم ان کے ساتھ تکبیر و تہلیل (اور تسبیح) کو شمار کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: سو تم اپنے گناہوں کو شمار کرو اور میں تمہارے لیے ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کوئی شی ضائع نہیں ہوگی، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! تم پر افسوس ہے تمہاری ہلاکت کتنی تیزی سے آپہنچی ہے، کیا ضلالت و گمراہی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اے ابو عبدالرحمن! قسم بخدا ہم نے سوائے نیکی کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا: کتنے ہی خیر اور نیکی کا ارادہ کرنے والے ہیں ہرگز اسے نہیں پہنچ سکیں گے (☆)۔

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے کہ ان سے کسی آدمی نے ہوس پرستوں اور اہل بدعت کی کسی شی کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا: تجھ پر لازم ہے کہ تو اعراب اور غلام کے دین کو لازم پکڑے جو کتاب کے بارے میں ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس سے علیحدگی اختیار کرلے۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم کون سی شے سے بنی آدم (انسان) کے پاس آتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہر شے سے۔ اس نے کہا: کیا تم استغفار سے پہلے بھی ان کے پاس آتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: دور ہو! وہ شے ہے جسے توحید کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا: میں یقیناً ان میں کوئی ایسی شے پھیلا دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار نہیں کریں گے۔

امام اوزاعی نے فرمایا: پس اس (ابلیس) نے لوگوں میں ہوس کو پھیلا دیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نہیں جانتا دو نعمتوں میں سے کون سی نعمت مجھ پر زیادہ عظیم ہے یہ کہ اس نے مجھے اسلام کی ہدایت اور رہنمائی عطا فرمائی یا یہ کہ اس نے مجھے اس ہوس سے عافیت اور چھٹکارا عطا فرمایا؟ اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہوس پرستوں کو اصحاب الاہواء کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ آتش جہنم میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب دارمی سے مروی ہے۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ سے معتزلہ کے پیچھے نماز پڑھنے اور ان سے نکاح، شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: نہیں، ان کی کوئی عزت و تکریم نہیں، وہ کفار ہیں، وہ کیسے مومن ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: قرآن کریم مخلوق ہے، نہ جنت پیدا کی گئی ہے اور نہ ہی جہنم اور نہ ہی اللہ کی کوئی پل صراط ہے، کوئی شفاعت نہیں، مومنین میں سے کوئی جہنم میں داخل نہیں ہوگا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے گنہگاروں میں سے کوئی جہنم سے نہیں نکلے گا، نہ کوئی عذاب قبر ہے اور نہ ہی منکر و نکیر ہیں۔ اور آخرت میں نہ ہمارے رب کا دیدار ہے اور نہ ہی زیادہ (کا کوئی تصور ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم مخلوق ہے، نہ وہ

☆ ذکر اذکار کے بارے یہ تشدید کا پہلو ہے انسان خلوص نیت سے حضور قلب کے ساتھ ذکر کرے یہی تو مقصود ہے۔

سلطان کو جانتے ہیں اور نہ ہی جمعہ کو اور وہ اسے کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام کو نکال دے گا آپ کے کلام میں سے یہ اور زیادہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ابوسفیان ثوری نے کہا ہے: بدعت ابلیس کے نزدیک معصیت (گناہ) سے زیادہ پسندیدہ ہے، (کیونکہ) معصیت سے توبہ کی جاسکتی ہے اور بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل السنۃ میں سے ایسے آدمی کی طرف دیکھنا عبادت ہے جو سنت کی طرف دعوت دیتا ہو اور بدعت سے منع کرتا ہو۔ اور ابوالعالیہ نے کہا: تم پر اس پہلے امر کو مضبوطی سے تھامنا لازم ہے جس پر تم تفرقہ سے پہلے تھے۔ عاصم الاحوال نے کہا ہے: میں نے اس کے بارے حسن سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے تجھے نصیحت کی ہے قسم بخدا! اور تجھے سچ کہا ہے۔

تحقیق سورۂ آل عمران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی گزر چکے ہیں کہ ''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ امت عنقریب تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی''۔ الحدیث۔ بعض اہل معرفت علماء نے کہا ہے: یہ فرقہ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے فرقوں میں زائد ہوا ہے وہ قوم ہے جو علماء سے عداوت رکھتے ہیں اور فقہاء سے بغض رکھتے ہیں اور گزشتہ امتوں میں سے یہ فرقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں ایک قوم ہوگی جو اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم سے کفر کریں گے درآنحالیکہ انہیں احساس اور شعور بھی نہ ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کفر کیا۔ فرمایا: تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیسے لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بعض کا اقرار کریں گے اور بعض کا انکار کریں گے''۔ پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیا کہیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ابلیس کو اللہ تعالیٰ کے برابر اور مساوی قرار دیں گے اس کی صفت خلق میں، قوت میں اور رزق میں۔ اور کہیں گے خیر اور بھلائی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر ابلیس کی جانب سے''۔ فرمایا: پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں فرمایا: ''میری امت ان سے عداوت، بغض اور جھگڑا فساد نہیں کرے گی وہی اس امت کے زنادقہ ہیں''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور سورۃ النساء میں اور اس سورت میں اہل بدعت اور ہوس پرستوں کی مجالست اور ہمنشینی اختیار کرنے سے نہی کا بیان گزر چکا ہے۔ اور بلاشبہ جو ان کے ساتھ مجالست کرے گا اس کا حکم ان کے حکم کی مثل ہی ہوگا۔ پس فرمایا: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا الآیہ (الانعام: 68) (اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بے ہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں)، پھر سورۃ النساء میں ان لوگوں کی سزا بیان فرمائی جنہوں نے ایسا کیا اور اس کی مخالفت کی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا۔ پس فرمایا: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ الآیہ (النساء: 140) اور سورۃ النساء مدنی سورت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے ساتھ ملا دیا جس نے ان کی مجلس اختیار کی۔ اور اس امت کے ائمہ میں ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور اہل بدعت کی مجلس اختیار کرنے والے پر معاشرت اور مخالطت کی بنا پر ان آیات کے تقاضا کے مطابق حکم صادر کیا، ان

میں سے امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم ہیں، کیونکہ انہوں نے اہل بدعت کی مجالست اختیار کرنے والے آدمی کے بارے میں کہا ہے: اسے ان کی مجالست اختیار کرنے سے روکا جائے گا، اگر وہ رک جائے تو فبہا ورنہ اسے ان کے ساتھ جلا دیا جائے گا، ان کی مراد یہ ہے کہ حکم میں (اسے ان کی مثل قرار دیا جائے گا)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شراب پینے والوں کی مجلس اختیار کرنے والے پر حد کا حکم لگایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (النساء: 140) (ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گے) آپ کو عرض کی گئی: وہ کہتا ہے میں ان کی مجلس اپناتا ہوں تاکہ میں ان پر اسے واضح کروں اور ان کی باتوں کا رد کروں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسے ان کی مجالست سے روکا جائے گا اور اگر وہ باز نہ آئے تو اسے ان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

''پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب تاکہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی اور (یہ کتاب) باعث ہدایت و رحمت ہے تاکہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے پر ایمان لائیں۔ اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے، بابرکت ہے سو پیروی کرو اس کی اور ڈرو (اللہ سے) تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اس میں مُوْسَى اور الْكِتٰبَ دونوں مفعول ہیں۔ تَمَامًا یہ مفعول من أجلہ ہے یا یہ مصدر ہے (یعنی مفعول مطلق) عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ، اَحْسَنَ کو نصب اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے رفع دیا، تو وہ قراءت یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق کی ہے۔ اور وہ اس تقدیر پر ہے: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ۔ مہدوی نے کہا ہے: اس میں بُعد ہے، کیونکہ اس میں مبتدا محذوف ہے جو کہ الَّذِيْۤ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے (یعنی هو)۔ اور سیبویہ نے خلیل سے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ سنا ہے: ما أنا بالذی قائلٌ لك شيئا اور جنہوں نے نصب دی ہے تو وہ اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کسائی اور فراء نے اس کی اجازت دی ہے کہ یہ اسم ہو جو کہ الذی کی صفت واقع ہو رہا ہو۔ اور ان دونوں نے اس جملے کو جائز قرار دیا ہے۔ مررتُ بالذی أخیك دونوں معرفہ اور جو اس کے قریب ہے اس کے ساتھ الذی کی صفت لگاتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بصریوں کے نزدیک محال ہے، کیونکہ یہ صفت ہے اسم کی اسے مکمل کیے جانے سے پہلے اور ان کے نزدیک معنی ہے: علی المحسن (نیک عمل کرنے والے پر) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تماما علی المحسن المؤمن (تاکہ پوری کر دیں نعمت نیک عمل کرنے والے مومن پر)

اور قولہ باری تعالیٰ: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ کے معنی میں حسن نے کہا ہے: ان میں محسن اور غیر محسن دونوں طرح کے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ نیک عمل کرنے والوں پر نعمت مکمل کر دے۔ فانزل اللہ الکتاب تماما

علی المحسنین اور اس قول کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی: تماماً علی الذین أحسنوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی ان احسانات میں زیادتی کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر فرمائے ان میں سے جن کا علم ان پر تورات نازل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔

محمد بن یزید نے کہا ہے: پس معنی ہے: تماماً علی الذی أحسنه الله عزوجل إلی موسیٰ علیه السلام من الرسالة وغیرها (مکمل کرتے ہوئے اس نعمت واحسان کو جو اس نے رسالت وغیرہ میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرمایا)۔ اور عبداللہ بن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے علی إحسان الله إلی انبیائه علیهم السلام من الرسالة وغیرها (1) (مکمل کرتے ہوئے اس احسان کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر رسالت وغیرہ میں فرمایا)

اور ربیع بن انس نے کہا ہے: تماماً علی إحسان موسیٰ من طاعته لله عزّ وجلّ (2) (مکمل کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس نیکی کو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی صورت میں وہ کرتے ہیں) اور فراء نے بھی یہ کہا ہے، پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور انہیں کتاب کا عطا کیا جانا اس سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بمعنی واو ہے۔ یعنی وآتینا موسی الکتاب (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) کیونکہ یہ دونوں حرف عطف ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: تقدیر کلام ہے ثم کنا قد آتینا موسی الکتاب قبل إنزالنا القرآن علی محمد ﷺ (پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر قرآن نازل کرنے سے پہلے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ، ثم أتل ما آتینا موسی تماماً (فرمایئے آؤ میں تلاوت کرتا ہوں وہ جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، پھر میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نعمت مکمل کرتے ہوئے عطا فرمایا)۔ وَ تَفْصِيلًا اس کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور اسی طرح هُدًى وَّ رَحْمَةً بھی معطوف ہے۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ اس میں مبارک صفت ہے یعنی جس میں بہت زیادہ خیرات و برکات ہیں۔ اور قرآن کریم کے علاوہ حال ہونے کی بنا پر اسے مبارکاً پڑھنا بھی جائز ہے۔ فَاتَّبِعُوْهُ یعنی تم اس کے مطابق عمل کرو جو کچھ اس میں ہے۔ وَاتَّقُوْا یعنی اس کی تحریف سے بچو۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تا کہ تم رحمت کے امیدوار بن جاؤ پس تم عذاب نہیں دیئے جاؤ گے۔

اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 189 2۔ ایضاً

عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْۗءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

"(ہم نے اسے اتارا ہے) تا کہ یہ نہ کہو کہ اتاری گئی تھی کتاب تو صرف دو گروہوں پر ہم سے پہلے اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ اگر اتاری گئی ہوتی ہم پر کتاب تو ہوتے ہم زیادہ ہدایت پانے والے ان سے، بے شک آ گئی ہے تمہارے پاس روشن دلیل اپنے رب کی طرف سے اور سراسر ہدایت اور رحمت تو کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور منہ پھیرا ان سے؟ عنقریب ہم سزا دیں گے انہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ تَقُوْلُوْٓا یہ محل نصب میں ہے۔ کوفیوں نے کہا ہے: لِئَلَّا تقولوا (تا کہ تم یہ نہ کہو) اور بصریوں نے کہا ہے: أنزلناہ کراھیۃ أن تقولوا (ہم نے اسے نازل کیا یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ تم کہو)۔ اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فاتقوا أنْ تقولوا یا أھل مکۃ (اے اہل مکہ تم یہ کہنے سے بچو)، اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ کہ تورات اور انجیل نازل کی گئی۔ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ہم سے پہلے دو گروہوں پر یعنی یہود و نصاریٰ پر اور ہم پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔

وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اور ہم تو ان کی کتابوں اور ان کی لغات سے بالکل ناواقف اور غافل تھے۔ اور یہاں عن دراستھما نہیں فرمایا، اس لیے کہ ہر گروہ ایک جماعت ہے۔ او تقولوا اس کا عطف أن تقولوا پر ہے۔ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے ساتھ عذر زائل ہو گیا۔ اور البینۃ اور البیان دونوں ہم معنی ہیں۔ اور اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بینہ کا نام دیا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ اور یہ سراسر ہدایت اور رحمت ہے اس کے لیے جس نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ پھر فرمایا: فَمَنْ اَظْلَمُ یعنی اگر تم نے جھٹلایا تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ فإن کذبتم فلا أحدَ أظلم مُنکم۔ صدف اس کا معنی اعراض جس نے اعراض کیا اور يَصْدِفُوْنَ وہ اعراض کرتے تھے، منہ پھیرا کرتے تھے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

"کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا خود آئے آپ کا رب یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی (لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی۔ آپ (انہیں) فرمایئے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اس کا معنی ہے میں نے ان پر حجت قائم کر دی اور ان پر کتاب نازل کی لیکن وہ ایمان نہ لائے،

پس وہ کس کی انتظار کر رہے ہیں؟ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ موت کے وقت ان کی ارواح کو قبض کرنے کے لیے فرشتے ان کے پاس آئیں۔

اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس کا مفہوم ہے: امر ربك یا ان کے بارے میں قتل وغیرہ سے متعلقہ تیرے رب کا حکم آجائے، کبھی مضاف الیہ کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس سے مراد مضاف ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) مراد اهل القرية ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ:93) اس میں مراد حب العجل ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے یاتی أمر ربك، یعنی عقوبةَ ربك اور عذاب ربك (تیرے رب کی سزا اور تیرے رب کا عذاب آجائے گا)۔ اور کہا جاتا ہے: یہ ان متشابہ آیات میں سے ہے جن کی تاویل سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور اسی کی مثل میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کہا گیا ہے: اٰيٰتِ رَبِّكَ سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ اس کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہیں دنیا میں مہلت دی جائے گی اور جب ساعت (قیامت) ظاہر ہو جائے گی تو پھر کوئی مہلت نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے آنے سے مراد قیامت کے دن میدان حشر میں اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے آنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (الفجر) (اور جب آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے)

اللہ تعالیٰ کے آنے میں کسی نوع کی کوئی حرکت، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور زوال وغیرہ نہیں ہے، کیونکہ یہ چیزیں تب ہوتی ہیں جب آنے والا جسم یا جوہر ہو اور جس نظریہ پر جمہور ائمہ اہل السنۃ ہیں وہ کہتے ہیں: وہ آتا ہے، نزول فرماتا ہے، لیکن وہ اسے کسی کیفیت کے ساتھ مکیف نہیں کرتے، کیونکہ اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے۔

ارشاد گرامی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (الشوریٰ) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے)

اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تین چیزیں جب ظاہر ہو جائیں گی تو پھر کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا یا اس نے اپنے ایمان کی حالت میں کوئی عمل خیر نہیں کیا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا نکلنا اور دابۃ الارض کا ظاہر ہونا“۔ اور صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بے شک مغرب میں توبہ کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی مسافت ستر برس کی ہے اسے بند نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج اس کی طرف سے طلوع ہو جائے“ (1)۔ اسے دار قطنی، دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: هذا حديث حسن صحيح۔ اور سفیان نے بیان کیا ہے:

1۔ سنن ابن ماجہ کتاب الفتن، باب طلوع الشمس من مغربها، حدیث نمبر 4059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ شام کی طرف ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس دن تخلیق فرمایا جس دن زمین و آسمان پیدا فرمائے۔ مفتوحاً یعنی توبہ کے لیے کھولا گیا ہے اور بند نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔ فرمایا: حدیث حسن صحیح (یہ حدیث حسن صحیح ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سب کو خوارج اور معتزلہ نے جھٹلایا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا کہ انہوں نے کہا: اے لوگو! بلاشبہ رجم حق ہے اس کے بارے تم کسی دھوکے میں نہ آنا اور بے شک اس کی نشانی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رجم کیا ہے اور بلاشبہ ہم نے ان دونوں کے بعد رجم کیا ہے۔ اور عنقریب اس امت سے ایک قوم ہوگی وہ رجم کو جھٹلائیں گے، دجال کی تکذیب کریں گے، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا انکار کریں گے، عذاب قبر کو نہیں مانیں گے، شفاعت کا انکار کریں گے اور اس قوم کو جھٹلائیں گے جو آگ (جہنم) سے نکالیں جائیں گے اس میں جلنے کے بعد۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے (1)۔

اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور وہ اسی کے ہم معنی ہے کہ "سورج کو لوگوں سے روک لیا جائے گا جس وقت زمین میں گناہ زیادہ ہو جائیں گے اور نیکی ختم ہو جائے گی اور کوئی اس کا حکم نہیں دے گا اور گناہ پھیل جائے گا اور اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ ایک رات کی مقدار عرش کے نیچے، جب بھی وہ سجدہ ریز ہوگا اور اپنے رب سے اجازت طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو اسے کوئی جواب نہیں ملے گا یہاں تک کہ چاند اس کے ساتھ برابر ہو جائے گا اور وہ بھی اس کے ساتھ سجدہ ریز ہوگا اور اذن طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو ان دونوں کو کوئی جواب نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ سورج کو تین راتوں کی مقدار اور چاند کو دو راتوں کی مقدار روک لیا جائے گا اور زمین میں تہجد گزاروں کے سوا اس رات کی طوالت کو کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اس وقت مسلمانوں کے شہروں میں سے ہر شہر میں ان کی ایک قلیل سی جماعت ہوگی، پس جب دونوں کے لیے تین راتوں کی مقدار مکمل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ فرمائیں گے: "بے شک رب کریم سبحانہ وتعالیٰ تم دونوں کو حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنے مغارب کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے طلوع ہو جاؤ اور یہ کہ تم دونوں کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی اور نور نہیں ہے"۔ پس وہ دونوں سیاہ حالت میں اپنے مغارب سے طلوع ہوں گے، نہ سورج کی روشنی ہوگی اور نہ چاند کا نور ہوگا، اس سے پہلے ان کے گرہن میں ان کی مثال موجود ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ (القیامہ) (اور (بے نوری میں) سورج اور چاند یکساں ہو جائیں گے)

اور ارشاد گرامی ہے: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ (التکویر) (یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) پس یہ دونوں بلند ہوں گے اس طرح جیسے دو جوڑے گئے اونٹ۔ اور جب سورج اور چاند آسمان کے نصف تک پہنچ جائیں گے تو ان کے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئیں گے اور وہ انہیں سینگوں سے پکڑ لیں گے اور انہیں مغرب کی طرف واپس لوٹا دیں گے اور وہ اپنے مغارب میں غروب نہیں ہوں گے بلکہ وہ دونوں باب التوبہ میں غروب ہوں گے پھر وہ دونوں کو اڑ واپس لوٹائے جائیں گے،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 156

پھر ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ جڑ جائے گا اور وہ دونوں اس طرح مل جائیں گے گویا ان کے درمیان کبھی کوئی شگاف (اور دراڑ) تھی ہی نہیں۔ اور جب توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا تو اس کے بعد کسی بندے کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کے بعد اسے نیکی نفع نہیں دے گی جسے وہ کرے گا، مگر وہ آدمی جو اس سے پہلے نیکوکار ہو تو وہ اس پر عمل کرتا رہے گا جس پر وہ اس دن سے پہلے عمل پیرا تھا، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا (انعام:158) ((لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی)

پھر اس کے بعد سورج اور چاند کو روشنی اور نور عطا کر دیا جائے گا، پھر وہ لوگوں پر اسی طرح طلوع وغروب ہوتے رہیں گے جیسے وہ اس سے قبل طلوع وغروب ہوتے تھے۔ علماء نے بیان کیا ہے: سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد کسی نفس کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا، کیونکہ وہ ان کے دلوں میں اس خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے خالص ہوا ہے جس کے ساتھ نفس کی تمام شہوات کو ٹھنڈا کر دیا گیا ہے اور قوائے بدنیہ میں سے ہر قوت سست اور ماند پڑ گئی ہے، پس تمام لوگ قیامت قریب آنے کے یقین کی وجہ سے اس آدمی کی طرح ہو گئے ہیں جس پر موت حاضر ہو (کیونکہ اس کی طرح) اس سے بھی گناہوں کی تمام انواع کی طرف دعوت دینے والے جذبات منقطع ہو چکے ہیں اور اب ان کے ابدان سے ان کا صدور باطل ہے، پس جس نے اس قسم کی حالت میں توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، جیسا کہ قریب المرگ آدمی کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ(1) (بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک وہ (موت کے وقت) غرغر کی آواز نہ نکالے) یعنی اس کی روح راس الحلق تک پہنچ جائے اور وہ وقت اس معاینہ اور مشاہدہ کا ہے جس میں وہ دیکھ لیتا ہے کہ اس کا ٹھکانا جنت میں ہے یا جہنم میں، پس سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا مشاہدہ بھی اس کی مثل ہے۔ اور اس پر چاہیے کہ جس نے اس کا مشاہدہ کیا جب تک وہ زندہ رہے اس کی توبہ مردود ہو اور جو اس وقت موجود ہو اس کا حکم بھی مشاہدہ کرنے والے کی طرح ہو، کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بارے میں، اس کے نبی ﷺ کے بارے میں اور اس کے وعدہ کے بارے میں ضروری اور بدیہی ہو گیا ہے۔ اور اگر ایام دنیا اتنے عرصہ تک پھیل جائیں کہ لوگ اس عظیم واقعہ کو بھول جائیں جیسے وقوع پذیر ہوا اور اس کے بارے میں وہ بہت تذکرہ کریں اور اس کے بارے خبر خاص ہو جائے اور اس سے تواتر ختم ہو جائے (یعنی اب وہ خبر متواتر نہ رہے) تو اس وقت جس نے اسلام قبول کیا یا توبہ کی تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث یاد کی ہے اور اس کے بعد میں اسے نہیں بھولا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک (قیامت کے) ظاہر ہونے کے اعتبار سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور لوگوں پر چاشت کے وقت دابۃ کا نکلنا ہے ان میں سے جو بھی دوسری سے پہلے ظاہر ہوگی تو اس کے قریب ہی دوسری علامت ظاہر ہو جائے گی'' (2)۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 324
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 404

اور اس بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرہ میں تشریف فرما تھے اور اس سے نیچے ہم تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم کس کے بارے ذکر کر رہے ہو؟'' ہم نے عرض کی: قیامت کے بارے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دس علامات ظاہر ہو جائیں۔ایک خسف (زمین کا دھنسنا) مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرہ عرب میں، دخان (دھواں) کا ظاہر ہونا، دجال کا نکلنا، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور ایک آگ جو کہ قعر عدن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانک کر لے جائے گی'' (1)۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: مجھے عبدالعزیز بن رفیع نے ابوالطفیل سے اور انہوں نے ابوسریحہ سے اسی طرح بیان کیا ہے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کرتے۔ اور ان دو میں سے ایک نے دسویں علامت کے طور پر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ اور دوسرے نے کہا ہے: اور ایک ہوا ظاہر ہوگی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامات کی ترتیب میں یہ حدیث متفق (انتہائی قابل اعتماد) ہے۔ ان میں سے بعض واقع ہو چکی ہیں اور وہ تینوں خسف ہیں جیسا کہ ابوالفرج علامہ جوزی نے عراق، عجم اور مغرب میں ان کے واقع ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کے سبب خلق کثیر ہلاک ہوئی۔ انہوں نے کتاب ''فہوم الآثار'' وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور دابہ کا ذکر سورۃ النمل میں آئے گا اور یاجوج ماجوج کا سورۃ الکہف میں آئے گا۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک یہ علامات تسلسل کے ساتھ سال بسال دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی مثل ظاہر ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورج کو مغرب سے طلوع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو کہا تھا: فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (البقرہ: 258) (کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے)

اور ان کے بعد آنے والے ملاحدہ اور نجومی اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ (کام) ہونے والا نہیں (یعنی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو سکتا) تو اللہ تعالیٰ ایک دن اسے مغرب سے طلوع فرمائے گا تاکہ وہ منکرین کو اپنی قدرت دکھائے کہ سورج اس کی بادشاہی اور سلطنت میں ہے، اگر وہ چاہے تو وہ اسے مشرق سے طلوع کرے اور اگر چاہے تو وہ اسے مغرب سے طلوع کرے۔ اور اس پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ توبہ اور ایمان کاروان کے لیے ہے جو منکرین میں سے ایمان لائے اور توبہ کی، کیونکہ وہ سورج کے طلوع ہونے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کو جھٹلانے والے ہیں۔ اور رہے اس کی تصدیق کرنے والے تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس سے پہلے کا ان کا ایمان ان کے لیے نفع بخش ہوگا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی کافر کا نہ کوئی عمل قبول کیا جائے گا اور نہ ہی توبہ جب کہ وہ اس وقت اسلام لایا جب اس نے اسے دیکھا، مگر وہ جو ان دنوں صغیر (نابالغ) ہو اگر وہ اس کے بعد اسلام لے آیا تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا اور جو گنہگار مومن تھا پس اس نے گناہ سے توبہ کر لی تو اس سے قبول کر لی جائے گی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 393

اور عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: سورج طلوع ہونے کے وقت اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس وقت ایسی چیخ ہوگی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہو جائیں گے، پس جو اس وقت اسلام لایا یا اس نے توبہ کی اور ہلاک ہو گیا تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور جس نے اس کے بعد توبہ کی تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ اسے ابو اللیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال باقی رہیں گے یہاں تک کہ وہ کھجور کے درخت لگائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے غیب کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے یوم تاتی تا کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً تلتقطه بعض السیارۃ ہے اور ذھبت بعض أصابعه ہے۔ اور جریر نے کہا ہے:

لَمَّا أَتَى خَبَرُ الزُّبَيْرِ تَوَاضَعَتْ	سُورُ الْمَدِينَةِ وَالْجِبَالُ الْخُشَّعُ

مبرد نے کہا ہے: تانیث مؤنث کی مجاورت کی بنا پر ہے نہ کہ اصل کی بنیاد پر۔ اور ابن سیرین نے لا تنفع کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: وہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ ابن سیرین کی غلطی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس میں نحو کا باریک سا قانون ہے اسے سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور نفس میں سے ہر ایک دوسرے پر مشتمل ہے پس ایمان کو مونث لایا گیا، کیونکہ وہ نفس میں سے ہے اور اس کے ساتھ ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

مَشَيْنَ كَمَا اهْتَزَّتْ رِمَاحٌ تَسَفَّهَتْ	أَعَالِيَهَا مَرُّ الرِّيَاحِ النَّوَاسِمِ

مہدوی نے کہا ہے: بہت سے ائمہ مضاف مذکر کے فعل کو مؤنث لاتے ہیں جب اس کی اضافت مونث کی طرف ہو اور مضاف مضاف الیہ کا بعض ہو یا اس سے ہو یا اس کے ساتھ ہو۔ اور اسی پر ذی الرمہ کا قول ہے: مشین ... البیت۔

پس مرّ (کے لیے فعل) مونث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ الریاح کی طرف مضاف ہے اور وہ مونث ہے جب کہ المرّ من الریاح ہے۔ اور نحاس نے کہا: اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے وہ یہ کہ ایمان کو مونث لایا گیا ہے، کیونکہ وہ مصدر ہے جیسا کہ مصدر مونث کے لیے مذکر فعل لایا جاتا ہے، مثلاً فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (البقرہ: 275) اور جیسا کہ شاعر نے کہا:

فقد عذرتنا فى صحابته العذر

اور ایک قول میں عذر کو مؤنث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ بمعنی المعذرۃ ہے۔ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی (تمہارے عذاب کا) انتظار کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

”بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ (اے محبوب!) نہیں ہے آپ کا ان سے کوئی علاقہ، ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ اسے حمزہ اور کسائی نے فارقوا الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی قراءت ہے، یہ المفارقۃ اور الفراق سے ماخوذ ہے۔ یہ اس معنی پر ہے کہ انہوں نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس سے نکل گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: واللہ مافرقوہ ولکن فارقوہ (قسم بخدا! انہوں نے دین میں تفرقہ نہیں ڈالا بلکہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا)۔ اور باقیوں نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، سوائے نخعی کے، کیونکہ انہوں نے اسے فرقوا مخفف پڑھا ہے، یعنی وہ بعض احکام کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ انہوں نے کفر کیا۔ حضرت مجاہد، قتادہ، سدی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مراد یہودی و نصاریٰ ہیں۔ اور وہ تفرقہ کی صفت کے ساتھ متصف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَیِّنَةُ ؁ (البینہ) (اور نہیں بٹے فرقوں میں اہل کتاب مگر اس کے بعد کہ آگئی ان کے پاس روشن دلیل)

اور مزید فرمایا: وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (النساء: 150) (اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان)۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ مراد مشرکین ہیں، ان میں سے بعض نے بتوں کی پوجا کی اور بعض نے فرشتوں کی پرستش کی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت عام ہے اور کفار کو شامل ہے۔ اور ہر وہ جس نے بدعت کا ارتکاب کیا اور ایسا عمل پیش کیا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا تو اس نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (1) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ کے تحت روایت کیا ہے کہ یہ اہل بدعت، شبہات میں مبتلا کرنے والے اور اس امت کے گمراہ لوگ ہیں۔ اور بقیہ بن ولید نے بیان کیا ہے کہ ہمیں شعبہ بن حجاج، مجالد نے شعبی سے انہوں نے شریح کے واسطہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا بلاشبہ یہ اس امت میں سے اصحاب بدعت، ہوس پرست اور اصحاب ضلالت و گمراہی ہیں (2)۔ اے عائشہ! بے شک ہر گنہگار کے لیے توبہ ہے سوائے بدعت کا ارتکاب کرنے والوں اور ہوس پرستوں کے، ان کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے اور میں ان سے بری ہوں اور وہ ہم سے بری نہیں۔

اور لیث بن ابی سلیم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ قراءت کی۔ اور شِیَعًا کا معنی ہے متفرق گروہ اور جماعتیں۔ اور ہر قوم جن کا نظریہ (اگر) ایک ہو ان میں سے بعض بعض کی رائے کی اتباع اور پیروی کرتے ہوں تو وہی شیع ہے۔ لَسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنی برأت ثابت کر دی۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے: من غشنا فلیس منا یعنی ہم اس سے بری ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

إذا حاولتَ فی أسَدٍ فُجورًا فإنّی لستُ منك ولستَ منّی

ای أنا ابرأ منك (یعنی میں تجھ سے بری ہوں گا)۔ اور فی شیء محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ خبریں موجود ضمیر سے حال ہے،

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 92 2۔ ایضاً

یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس میں مضاف محذوف ہے اور معنی ہے لست من عقابھم فی شئ (ان کی سزا سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں) بلاشبہ آپ پر فقط ڈرانا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ (ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے) یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لیے دس ہوں گی اس کی مانند۔ اور جو کوئی کرے گا ایک برائی تو نہ بدلہ دیا جائے گا اسے مگر اس (ایک برائی) کے برابر اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا"۔

قولہ تعالیٰ: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ اس میں مَنْ مبتدا اور وہی شرط ہے اور جواب شرط فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ہے یعنی اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیاں ہوں گی، اس میں حسنات کو حذف کر دیا گیا ہے اور امثال کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے جو اس کی صفت ہے (یعنی حسنات أمثالها) اور أمثال، مثل کی جمع ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: عندی عشرۃ نسابات، ای عندی عشرۃ رجال نسابات (میرے پاس دس صاحب نسب آدمی ہیں تو اس میں رجال کو حذف کر کے اس کا قائم مقام نسابات جو کہ صفت ہے، کو رکھ دیا گیا ہے)

اور ابوعلی نے کہا ہے: عَشْرُ اَمْثَالِهَا میں تانیث اچھی ہے، کیونکہ اُمثال مونث کی طرف مضاف ہے اور مؤنث کی طرف اضافت جب معنی میں بھی ہو تو اس میں تانیث اچھی اور حسین ہوتی ہے، جیسے يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ (یوسف: 10) اور ذھبت بعض أصابعه۔

حسن، سعید بن جبیر اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم نے فَلَهٗ عَشْرٌ اَمْثَالُهَا پڑھا ہے اور تقدیر عبارت ہوگی: فله حسناتٌ أمثالها یعنی اس کے لیے اس جزا میں سے دس گنا ہوگی جو اس کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کے لیے ایک مثل ہو اور پھر اس مثل کو کئی گناہ کیا جاتا ہو اور وہ پس وہ دس ہو جاتی ہو۔ اور یہاں الحسنة سے مراد ایمان ہے، یعنی جس نے یہ شہادت دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے دنیا میں جو بھی نیکی اور خیر کا عمل کیا اس کے ہر عمل کے بدلے ثواب دس گنا ہوگا۔

وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ یہاں سیئة سے مراد شرک ہے۔

فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (تو اسے بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اس ایک برائی کے برابر) اور وہ بدلہ ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے، کیونکہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور آتش جہنم میں سب سے بڑی سزا ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ (النبا) یعنی ایسی جزا جو عمل کے موافق ہوگی۔ اور رہی نیکی تو وہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نص موجود ہے اور حدیث میں ہے: الحسنة بعشر أمثالها وأزيد والسيئة واحدة وأغفر فالويل لمن غلبت أحاده أعشاره (ایک نیکی کا بدلہ دس گنا اور اس سے بھی زائد ہے اور برائی (گناہ) ایک ہے اور اس کی مغفرت فرما دیتا ہوں لیکن ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لیے جس کی ایک برائی ان دس پر غالب آ گئی)۔

اور اعمش نے ابو صالح سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حسنہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور سیئہ سے مراد شرک ہے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی ان کے اعمال کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا۔ تحقیق اس آیت کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہ انفاق فی سبیل اللہ سے مختلف ہے اور اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے: دس گنا تمام نیکیوں کے لیے ہے۔ اور سات سو گنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے اور اس میں خاص اور عام برابر ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: عوام کے لیے دس گنا (بدلہ) ہوتا ہے اور خواص کے لیے سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ جو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ امر توقیف کا محتاج ہوتا ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ خریم بن فاتک کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے اس میں ہے: اما حسنة بعشر فمن عمل حسنة فله عشر أمثالها وأما حسنة بسبعمائة فالنفقة فی سبیل اللہ (ایک نیکی دس کے برابر ہے پس جس نے ایک نیک عمل کیا تو اس کے لیے اس کی مثل دس ہوں گی اور رہی وہ نیکی جو سات سو کے برابر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے)۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

"آپ فرمائیے بے شک مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے۔ آپ فرمائیے بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔ نہیں کوئی شریک اس کا اور مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ کفار نے تفرقہ ڈالا (تو ساتھ ہی) بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح دین تک پہنچا دیا اور وہ دین ابراہیمی ہے۔ دِيْنًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یہ قطرب سے منقول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کی نصب هَدٰىنِيْ فعل کی وجہ سے ہے یہ اخفش کا قول ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور نے کہا ہے: معنی پر محمول ہونے کی وجہ سے یہ منصوب ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے هدانی عرفنی دینا (اس نے مجھے سیدھے راستے تک پہنچایا اور دین کی مجھے پہچان کرا دی) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صِرَاطٍ سے بدل ہو یعنی هدانی صراطا مستقیما دینا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے، گویا کہ یہ کہا: اتبعوا دینا، واعرفوا دینا (یعنی تم دین کی اتباع کرو اور دین کی معرفت حاصل کرو)

قِيَمًا کوفیوں اور ابن عامر نے اسے قاف کے کسرہ اور تخفیف اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے جیسا کہ شبع اور اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور باقیوں نے قاف کے فتحہ یا کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَيِّمًا۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور یا اصل میں واؤ ہے قیوم پھر واؤ کو یاء سے بدل کر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا ہے جیسے میت میں ہوا

ہے۔ اور اس کا معنی سیدھا (صحیح) دین جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ یہ بدل ہے۔ حَنِیْفًا زجاج نے کہا ہے: یہ ابراہیم سے حال ہے اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ منصوب ہے اور اس سے پہلے أعنی فعل مضمر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ لفظ صلوٰۃ کا مادہ اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد رات کی نماز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عید کی نماز مراد ہے۔ اور النسك، نسیكۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ذبیحہ (ذبح شدہ جانور یعنی قربانی) اور حضرت مجاہد، ضحاک اور سعید بن جبیر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور معنی یہ ہے: حج اور عمرہ میں میری قربانی۔ اور حسن نے کہا ہے: نُسُكِیْ سے مراد ہے میرا دین۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری عبادت۔ اور اسی سے ناسك وہ کہلاتا ہے جو عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس آیت میں نسك سے مراد نیکی اور طاعت کے جمیع اعمال ہیں۔ اور یہ معنی تیرے اس قول سے لیا گیا ہے: نسك فلان فھو ناسك جب کوئی عبادت گزار ہو۔

وَ مَحْیَایَ یعنی جو عمل میں اپنی زندگی میں کروں گا۔ وَ مَمَاتِیْ یعنی وہ اعمال جن کے بارے میں اپنی وفات کے بعد کرنے کی وصیت کروں گا۔ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ان کے ذریعے خالصتہً اسی کے قرب کا ارادہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ یعنی میرا جینا اور میرا مرنا اسی کے لیے ہے۔ اور حسن نے نسکی سین کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اہل مدینہ نے و محیای درج کلام میں یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عام نے یا کو مفتوح پڑھا ہے، کیونکہ اس میں دو ساکن (الف اور یا) جمع ہو جاتے ہیں،

اور اس میں الف مدہ ہے یہ حرکت کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور یونس نے اِضربان زیدا کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ اس میں اجتماع ساکنین ہے اور دوسرے میں ادغام بھی نہیں ہے اور جنہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے مطابق پڑھا ہے اور غلطی سے بچنا چاہا ہے تو انہوں نے محیای پر وقف کیا ہے تو اس صورت میں وہ جملہ نحویوں کے نزدیک غلطی کا مرتکب نہیں ہے۔ اور ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمر اور عاصم جعدری نے و محییّ دوسری یاء کو شد کے ساتھ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور یہ علیا مضر کی لغت ہے وہ کہتے ہیں: قفی اور عصی اور اہل لغت نے کہا ہے:

سبقوا ھَوَیّ و أعنقوا الھواھم (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نماز کا آغاز اس ذکر سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرنے کا ارادہ فرماتے تو یہ کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ تا قولہ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے(1) کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے اور میں اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہوں تو میرے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دے بلاشبہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا اور میری اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی فرما اور تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا اور مجھ سے برے اخلاق کو پھیر دے (دور کر دے) اور تیرے سوا مجھ سے کوئی انہیں دور نہیں کر سکتا میں حاضر ہوں جملہ سعادتیں تیرے پاس ہیں اور تمام تر بھلائیاں تیرے قبضے میں ہیں اور تیری طرف شر کو کوئی راہ نہیں۔ تو سراپا برکت ہے اور بلند مرتبہ اور غالب ہے۔ أستغفرك وأتوب إليك (میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں)'' الحدیث۔

اور اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ہمیں نضر بن شمیل کی طرف سے خبر پہنچی ہے اور یہ لغت اور دیگر علوم کے علماء میں سے تھا اس نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ھو الشر لیس إلیك کا معنی یہ ہے کہ شر ان چیزوں میں سے نہیں جن کے ساتھ تیرا اقرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نماز میں توجیہ (یعنی وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي ... الآیہ پڑھنا لوگوں پر واجب نہیں، بلکہ ان پر تکبیر اور پھر قرأت واجب ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں دیکھا جو قراءت سے پہلے لوگ کہتے ہیں: (یعنی) سبحانك اللھم وبحمدك اور اختصار میں وہ ہے جو المختصر میں مذکور نہیں۔ کہ امام مالک یہ خالصۃً اپنے بارے میں کہتے تھے، کیونکہ اس کے بارے حدیث صحیح ہے اور آپ اس خوف سے لوگوں کو اس کے بارے نہیں کہتے تھے کہ وہ اس کے واجب ہونے کا اعتقاد رکھ لیں گے۔ علامہ ابوالفرج جوزی نے کہا ہے کہ میں اپنے بچپنے میں اپنے شیخ ابو بکر الدینوری کے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔ تو انہوں نے مجھے ایک مرتبہ ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے بیٹے! بے شک فقہاء نے قراءت فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے، اور ان کے اس بارے کوئی اختلاف نہیں کہ افتتاح (ثنا پڑھنا) سنت ہے، پس تو واجب میں مشغول ہو اور سنن کو چھوڑ دے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل اس اعرابی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جسے آپ نے نماز سکھائی: ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ، اور پھر قراءت کر''۔ اور آپ نے اسے یہ نہیں فرمایا: سبح (کہ تو تسبیح یعنی سبحانك اللھم وبحمدك پڑھ)

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، جلد 1، صفحہ 263

جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور نہ یہ فرمایا کہ تو کہہ: وجہتُ وجھی جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تو کیسے پڑھتا ہے جب نماز شروع کرتا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی: میں کہتا ہوں (1) اللہ اکبر، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (فاتحہ) پس انہوں نے نہ تو توجیہ (یعنی انی وجہت وجھی) اور نہ ہی تسبیح (یعنی سبحانک اللھم) کا ذکر کیا۔ اور اگر کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کہا کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے: یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تکبیر سے پہلے کہتے ہوں اور بعد ازاں اللہ اکبر کہتے ہوں اور یہی ہمارے نزدیک حسن ہے۔

اور کہا جائے کہ نسائی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے: اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ الحدیث، تو ہم کہیں گے: ہم اسے رات کی نفل نماز پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ نسائی کی کتاب میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کے وقت نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا إله غيرك یا مطلق نفل نماز میں آپ اس طرح پڑھتے تھے، کیونکہ نفل نماز فرض نماز سے اخف ہے، کیونکہ نفل نماز کھڑے، بیٹھے اور سوار ہونے کی حالت میں پڑھنا جائز ہوتی ہے اور سفر میں منہ قبلہ شریف کی طرف ہو یا کسی اور طرف، پس اس کا معاملہ آسان ہے۔

اور نسائی نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نفل نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اللهم أنت الملك لا إله إلا انت سبحانك وبحمدك پھر قراءت کرتے تھے۔

یہ نفلوں میں ہونے پر نص ہے نہ کہ واجب میں۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ فرض نماز میں تکبیر کے بعد تھا، تو پھر اسے جواز اور استحباب پر محمول کیا جائے گا اور رہا امر مسنون تو وہ تکبیر کے بعد قراءت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔ پھر جب آپ نے یہ کہا تو یہ نہیں کہا: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اور اس کی وضاحت یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ان میں سے کوئی بھی اول نہیں۔ پس اگر کہا جائے: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام آپ سے پہلے نہیں ہیں؟ تو ہم کہیں گے: اس کے تین جواب ہیں۔

(۱) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معنوی طور پر تمام مخلوق میں سے اول ہیں، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: نحن الآخرون الأولون يوم القيامة ونحن اول من يدخل الجنة (3) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن اوّل ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے) اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: نحن الآخرون من اهل الدنيا والأولون يوم القيامة المقضى لهم قبل الخلائق (ہم اہل دنیا میں سے آخر ہیں اور قیامت کے دن اوّل ہوں گے مخلوقات سے پہلے ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 653 2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 159 3۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 282

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اول ہیں، کیونکہ آپ خلق میں ان پر مقدم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کنت اول الأنبیاء فی الخلق و آخرھم فی البعث (1) (میں خلقت میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اوّل ہوں اور بعث میں ان سے آخر میں ہوں) پس یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام وغیرہ سے پہلے آیا ہے۔

(۳) اول المسلمین من اھل ملتہ (کہ میں اہل دین میں سے پہلا مسلمان ہوں) یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔ اور اوّل کے بارے روایات مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض میں ان کا ثبوت ہے اور بعض میں نہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (2) یا فاطمة قومی فاشھدی أضحیتكِ فإنه یغفر لك فی اول قطرۃ من دمھا كل ذنب عملتیه ثم قولی: اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ (اے فاطمہ! اٹھ اور اپنی قربانی کے پاس حاضر ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے خون کے پہلے قطرہ کے ساتھ ہی تیرے ہر اس گناہ کو بخش دے گا جو تو نے کیا اور پھر یہ کہا: اِنَّ صَلَاتِيْ الخ) عمران نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (اعزاز) صرف آپ کے لیے اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہے یا مسلمانوں کے لیے عام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے''۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور رب حالانکہ وہ رب ہے ہر چیز کا۔ اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، پھر اپنے رب کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے تو وہ بتائے گا تمہیں جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ یعنی (آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں) حالانکہ وہ ہر شی کا مالک ہے۔ روایت ہے کہ کفار نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ اور ہمارے الہوں کی عبادت کرو اور جس دین پر تم ہو اسے ترک کر دو، تو ہم تمہارے لیے ہر اس تاوان کے ضامن ہوں گے (3) جس میں آپ اپنی دنیا اور آخرت میں واقع ہوں گے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ استفہام ہے جو تقریر اور زجر و توبیخ کا تقاضا کرتا ہے اور غیر، ابغی فعل کے سبب منصوب ہے اور ربا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 282 2۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 101 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا یعنی تمہارا اس حال پر ہونا مجھے الله کے سوا کوئی اور رب تلاش کرنے کی صورت میں مجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا، کیونکہ کوئی شخص (کوئی چیز) نہیں کماتا مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے، یعنی جو معصیت اور گناہ اس نے کیا اور جو خطا اس سے صادر ہوئی اس کا مؤاخذہ اس کے سوا کسی اور سے نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مخالفین میں سے بعض علماء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ فضولی کی بیع صحیح نہیں ہوتی اور یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت سے مراد یہ ہے کہ اسے ثواب وعقاب پر محمول کیا جائے گا(1) نہ کہ احکام دنیا پر۔ اس کی دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ جیسا کہ اس کا بیان آئے گا۔ اور فضولی کی بیع ہمارے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، اگر وہ اس کی اجازت دے دے تو وہ جائز ہو جاتی ہے۔ عروہ البارقی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خرید وفروخت کی اور آپ کے حکم کے بغیر تصرف کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت عطا فرما دی۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

بخاری اور دار قطنی نے عروہ بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ مال (بکریاں) لائی گئیں تو آپ نے مجھے ایک دینار عطا فرمایا اور فرمایا: "اے عروہ! مال کے پاس جاؤ اور ہمارے لیے اس دینار کے عوض ایک بکری خرید لو"۔ پس میں اس مال کے پاس آیا اور میں نے سودا کیا اور میں نے ایک دینار کے بدلے دو بکریاں خریدیں اور میں ان دونوں کو ہانک کر لے آیا تو راستے میں ایک آدمی مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے سودا کیا تو میں نے اسے ایک بکری ایک دینار کے عوض بیچ دی اور میں دوسری بکری اور ایک دینار لے کر آیا اور عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم یہ بکری ہے اور یہ آپ کا دینار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "تم نے یہ کیسے کیا"؟ تو میں نے آپ کو ساری بات عرض کی۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللهم بارك له فی صفقة يمينه (اے الله! اس کے لیے اس کے کاروبار میں برکت رکھ دے) پھر میں نے دیکھا کہ میں کوفہ کے محلہ کناسہ میں ٹھہرا ہوا ہوں اور میں نے چالیس ہزار کا نفع کمایا اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچوں۔ یہ دار قطنی کے الفاظ ہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ حدیث جید ہے اور اس میں دو بکریوں کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہونا صحیح ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے وہ دینار نہ لیتے اور نہ اپنے لیے بیع کو نافذ کرتے۔ اور اس میں وکالت کے جائز ہونے پر دلیل ہے اور اس میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب کوئی مؤکل اپنے وکیل کو کہے: تو اس طرح خرید۔ تو اس نے اس سے زیادہ کے عوض خریدا جس کے ساتھ اسے وکیل بنایا گیا تھا، تو کیا وہ امر لازم آئے گا یا نہیں؟ جیسا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہے: تو اس درہم کے عوض ایک رطل کا گوشت خرید لا، جس کا وصف (کوالٹی) یہ ہو۔ پس اس نے اس کے لیے اسی وصف کا چار رطل گوشت اس ایک درہم کے عوض خریدا۔ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 772

تمام کا تمام مؤکل کے لیے لینا لازم ہوگا بشرطیکہ صفت اور جنس میں موافقت ہو، کیونکہ وہ محسن (نیکی اور احسان کرنے والا) ہے۔ اور یہی قول امام یوسف اور امام محمد بن حسن کا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ زیادتی مشتری کے لیے ہوگی۔ اور یہ حدیث آپ کے خلاف حجت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، یعنی کسی شخص سے دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر نفس کا مواخذہ اس کے اپنے جرم کے سبب ہوگا اور اپنے گناہ کے سبب اسے سزا دی جائے گی۔ الوزر کا اصلی معنی ثقل (بوجھ) ہے اور اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ (الم نشرح) (اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اتار دیا) اور یہاں اس کا معنی ذنب (گناہ) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (انعام: 31) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: وَزَرَ يَوْزَرُ اور وُزِرَ يُوْزَرُ اور وَزِرَ يَوْزَرُ، وِزْرًا اور اِزْرًا بھی جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: إسادة (کہ یہ اصل میں وسادة تھا) اور یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ کہتا تھا: تم میرے راستے کی اتباع اور پیروی کرو میں تمہارے بوجھ اٹھالوں گا۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اس نظریہ کے رد کے لیے نازل ہوئی کہ آدمی سے اس کے باپ اور بیٹے کے بدلے اور اس کے حلیف کے گناہ کے بدلے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے مراد آخرت میں ہو اور اسی طرح اس آیت سے بھی جو اس سے پہلے ہے اور رہی دنیا تو اس میں بعض سے بعض کے جرم کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے، بالخصوص جب نیک اور اطاعت شعار لوگ گنہگاروں کو نہ روکیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدہ: 104) کے ضمن میں حدیث ابی بکر میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال: 25) (اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: 11) (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے)

اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک اور صالح لوگ ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں جب زنا بڑھ جائے گا'' (1)۔ علماء نے بیان کیا ہے: (کہ اس کا معنی ہے) زنا کی اولاد (جب زیادہ ہو جائے گی) اور الخبث با کے فتحہ کے ساتھ یہ زنا کا اسم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس کے ذریعہ دیت خطا عاقلہ پر واجب کی ہے یہاں خون کی تعظیم کی خاطر کسی آزاد مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے اور اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 1056

نہیں ہے اور اس پر دلیل وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم اس دنیا میں ہو کہ عمرو کے فعل کا مواخذہ زید سے نہیں لیا جائے گا کہ جو جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کا انجام اسی پر ہوگا۔ اور ابو داؤد نے ابو رمثہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں اپنے باپ کے ساتھ حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، تو حضور نبی کریم ﷺ نے میرے باپ کو فرمایا: ''کیا یہ تیرا بیٹا ہے''؟ تو باپ نے جواباً عرض کیا: ہاں رب کعبہ کی قسم۔ مزید کہا: حقا (یہ حق ہے) مزید کہا: اشھد بہ (میں اس کے بارے شہادت دیتا ہوں)۔ ابو رمثہ کہتے ہیں: میرے باپ کے ساتھ میری مشابہت ثابت ہونے اور میرے باپ کے مجھ پر قسم کھانے سے حضور نبی کریم ﷺ خوب کھل کر مسکرائے۔ پھر ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ وہ تجھ پر کوئی گناہ نہیں ڈالے گا اور تو اس پر کوئی گناہ نہ ڈال سکے گا'' اور پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور یہ اس کے معارض نہیں ہے جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: 13) (اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ) کیونکہ اسے دوسری روایت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے: لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل: 25) (تا کہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہے ہیں (جہالت سے) پس جو ضلالت و گمراہی میں امام بنا اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت دی اور اس پر عمل پیرا رہا تو اس پر ان کا بوجھ بھی ڈالا جائے گا جنہیں اس نے گمراہ کیا لیکن اس سے گمراہ ہونے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿165﴾

''اور وہی ہے جس نے بنایا تمہیں (اپنا) خلیفہ زمین میں اور بلند کیا ہے تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں تا کہ آزمائے تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا فرمائی ہے، بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ، خَلٰٓئِفَ خلیفہ کی جمع ہے، جیسے کرائم، کریمۃ کی جمع ہے اور ہر وہ جو گزر جانے والے کے بعد آئے وہی خلیفہ ہوتا ہے (1)، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں گزشتہ امتوں اور قرون سابقہ کا خلیفہ بنایا ہے۔ شماخ نے کہا ہے:

تُصِيبُهُم و تُخطِئُني المنايا وأخلُف في رُبوعٍ عن رُبوعِ

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ یعنی خلقت، رزق، قوت، طاقت اور فضل و علم میں، بعض کو بعض پر اس نے بلند کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 147

دَرَجٰتٍ حرف جر کے حذف کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، یعنی الی درجات لِّیَبْلُوَكُمْ اسے لام کی کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور ابتلاء کا معنی اختبار (آزمائش) ہے یعنی تاکہ وہ تم میں سے اسے ظاہر کرے جو اس کا انجام ہوگا ثواب یا عقاب۔ اور وہ اپنے علم کے ساتھ ہمیشہ مستغنی ہے۔ پس اس نے خوشحال اور دولت مند کو دولت اور غنا کے ساتھ آزمایا اور اس سے شکر کا مطالبہ کیا اور اس نے تنگ دست کو فقر و افلاس کے ساتھ آزمایا اور اس سے صبر کا مطالبہ کیا۔ اور کہا جاتا ہے: لِّيَبْلُوَكُمْ یعنی تاکہ تم میں سے بعض بعض کو آزمائیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (الفرقان:20) (اور ہم نے بنادیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش) اس کا بیان آگے آئے گا۔

پھر انہیں خوفزدہ کیا اور فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ بے شک آپ کا رب اسے جلد سزا دینے والا ہے جو اس کی نافرمانی اور گناہ کرے۔ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اور بے شک وہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اس کے لیے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے)

اور فرمایا: سَرِيْعُ الْعِقَابِ اس کے باوجود کہ اس کا وصف امہال (مہلت دینا) ہے اور اس کے باوجود کہ آگ کا عذاب جو آخرت میں ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ ہر آنے والی شی قریب ہوتی ہے، پس وہ اس بنا پر جلد سزا دینے والا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (النحل:77) (اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد) اور مزید فرمایا يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ (المعارج) (کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے لیکن ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) اور وہ اس کے لیے بھی سَرِيْعُ الْعِقَابِ ہو سکتا ہے جو دار دنیا میں اس کا مستحق ہو جائے، پس یہ اس جہت پر خطائیں اور گناہ واقع ہونے کی جگہوں اور مقامات کے لیے تحذیر اور ڈراوا ہے(1)۔ واللہ اعلم

**اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۃ الانعام کا ترجمہ آج مورخہ 16 اگست 2007 بروز جمعرات بوقت 12 بج کر 45 منٹ پر اختتام پذیر ہوا۔**

**الحمد للہ علی ذالك والصلوٰۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین**

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 1، صفحہ 529